اُردُو زبان میں
ایک عظیم الشان مذہبی اور علمی ذخیرہ
قصص القرآن
حصہ ٤

قصص القرآن کا شمار ادارہ کی نہایت ہی اہم اور مقبول کتابوں میں ہوتا ہے۔ انبیا علیہم السّلام کے حالات اور اُن کے دعوتِ حق اور پیغام کی تفصیلات پر اس درجہ کی کوئی کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی پُوری کتاب چار ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی ہے جس کے مجموعی صفحات ۲۴۸۷ ہیں۔

حصہ اوّل:۔ حضرت آدم علیہ السّلام سے لے کر حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السّلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل حالات و واقعات۔

حصہ دوم:۔ حضرت یوشع علیہ السّلام سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السّلام تک تمام پیغمبروں کے مکمل سوانح حیات اور اُن کی دعوتِ حق کی محققانہ تشریح و تفسیر۔

حصہ سوم:۔ انبیاء علیہم السّلام کے واقعات کے علاوہ اصحاب الکہف والرقیم اصحاب القریۃ اصحاب السبت، اصحاب الرس، بیت المقدس اور یہود، اصحاب الاخدود، اصحاب الفیل، اصحاب الجنۃ ذوالقرنین اور سدِ سکندری، سبا اور سیل عرم وغیرہ باقی قصص قرآنی کی مکمل و محققانہ تفسیر۔

حصہ چہارم:۔ حضرت عیسیٰ اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے مکمل و مفصل حالات۔

قیمت جلد اوّل دس روپے جلد دوم پانچ روپے جلد سوم سات روپے جلد چہارم نو روپے
قیمت مکمل سٹ اکتیس روپے۔ اُجرت فی جلد فل پارچہ ایک روپیہ۔ عمدہ فی جلد دو روپے

مکتبہ بُرہان، اُردو بازار جامع مسجد، دہلی

برہان

جلد ۶۹ | ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ مطابق جولائی ۱۹۷۲ء | شمارہ ۱

فہرست مضامین

نظرات اردو کے معاملات و مسائل ـ (۲)	سعید احمد اکبرآبادی	۲
مقالات: ـ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	" " "	۱۱
مولانا ابوالکلام آزاد (ایک جائزہ)	جناب محمد شعیب صاحب عمری بنگلور	۲۶
فارسی شاعری میں لطافت ظرافت	جناب خان محمد عاطف صاحب ملیح آبادی دانش گاہ تہران	۴۴
جنوبی افریقہ کے مسلمان	جناب احمد ثبات صاحب	۵۴
تہذیب کا دورِ جدید اور اجتہاد کی ضرورت	جناب ڈاکٹر محمد احسان اللہ خان	۶۱
تبصرے	س ع	۶۷
اشتہار مثل لائق بمبئی		۷۳

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ
سعید احمد اکبرآبادی

برہان

جلد ۶۹ | ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ مطابق جولائی ۱۹۷۲ء | شمارہ ۱-۵

فہرست مضامین

نظرات اُردو کے معاملات و مسائل۔ (۲)	سعید احمد اکبرآبادی	۲
مقالات: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	" " "	۱۱
مولانا ابوالکلام آزاد (ایک جائزہ)	جناب محمد شعیب صاحب عمری بنگلور	۲۶
فارسی شاعری میں لطافت و ظرافت	جناب خان محمد عاطف صاحب ملیح آبادی دانش گاہ تہران	۴۴
جنوبی افریقہ کے مسلمان	جناب احمد ثبات صاحب	۵۴
تہذیب کا دورِ جدید اور اجتہاد کی ضرورت	جناب ڈاکٹر محمد احسان اللہ خان	۶۱
تبصرے	س ح	۶۷
اشتہار مغل لائن بمبئی		۷۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

اُردو کے معاملات و مسائل

اب وہ حضرات جنہوں نے دو قومی نظریہ کی بنیاد پر پاکستان کو اردو کی حفاظت کا قلعہ تھا۔ وہ فرمائیں کہ کیا حفاظت اسی طرح ہوتی ہے؟ اور کیا اسی کو قلعہ کہا جاتا ہے۔ پورے پاکستا یوپی اور بہار کے مہاجرین کا ایک طبقہ ہے جو اردو زبان کو اب تک سینے سے لگائے بیٹھا ہے جس کی عورتیں اور بچے اُردو میں بولتے اور گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن اول تو اس طبقہ کی بڑی آبادی میں ہے۔ اس لئے اردو بحیثیت ایک بولی کے ایک شہر میں نہیں بلکہ اس کے بھی بعض علاقوں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اور پھر وہاں بھی ماحول بدل رہا ہے۔ سوسائٹی کے طور طریق تبدیل ہو رہے ہیں۔ اور فضا روز بروز متغیر ہوتی جا رہی ہے۔ ان کو اپنے جدید ہم وطنوں کی طرف سے اپنی زبان و تہذیب پر وقتاً فوقتاً جلی کٹی باتیں بھی سننی پڑ رہی ہیں۔ اس بنا پر پاکستان کی مرکزی حکومت میں ریاستی زبان تسلیم کر لینے کے باوجود کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کل اس کا انجام کیا ہوگا؟ مہاجرین کے بڑے مرد اور عورتیں آج جس زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ کل ان کی آئندہ نسلیں بھی اس زبان کو استعمال کر سکیں گی یا نہیں؟ اس سوال کا جواب اثبات میں دینا بہت مشکل ہے۔

یہ تلخ اور بے مزہ داستان اس لئے دہرائی گئی ہے کہ مسلمانوں میں احتساب نفس اپنے اوپر تنقید کا جذبہ اور مادّہ پیدا ہو اور وہ یہ محسوس کریں کہ انہوں نے خود اپنے اوپر اور اپنی تہذیب پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ بدقسمتی سے ہم عادی اس بات کے ہو گئے ہیں کہ اپنا

... دوسروں سے (خواہ وہ حکومت ہند ہو یا ہندوستان کی اکثریت (جس کا ذکر آرہا ہے) ... کی حکومت اور وہاں کی اکثریت) اس کی توقع قائم کریں کہ وہ ہماری بگڑی کو بنا دیں گے۔ ... کو اپنے دست جنوں سے ہم نے تار تار کر کے رکھ دیا ہے۔ دوسرے اس پر بخیہ گری ... نہیں دے دیں گے۔ جو قوم اس درجہ کی سست عہد۔ کام چور۔ دوسروں کی چشم کرم کی محتاج (PARASITE) ہو وہ نہ اپنی حفاظت کر سکتی ہے اور نہ اپنی زبان اور تہذیب کو ... کر سکتی ہے۔ صحیح عمل کی شرط یہ ہے کہ انسان میں خودشناسی پیدا ہو اور وہ کھلے دل سے اپنے افکار و خیالات، احساسات و جذبات اور اپنے افعال و اعمال کا جائزہ لے اور اگر ایک مدت کے تجربہ اور مشاہدہ کے بعد اس کو یہ محسوس ہو کہ اس نے ایک غلطی کی تھی جس کا نتیجہ بد آج اس کو اس صورت میں دیکھنا پڑ رہا ہے تو اب اس کا فرض ہے کہ وہ اب تک جس راستہ پر چلتا رہا ہے اسے ترک کر کے تلافی مافات کے لیئے ایک نیا قدم اُٹھائے۔ محض گردشِ روزگار کا تماشائی بنے رہنے سے قوموں کی تقدیر نہیں بدلتی!!

یہ تو اُردو کی سرگذشت تھی۔ اس ملک کی جس کو مسلمانوں نے اُردو کے لئے ایک حفاظتی قلعہ کی حیثیت سے بنوایا تھا، اور جہاں کی وہ حکومتی اور قومی زبان تھی بھی! اب آئیے آپ اپنے ملک میں دیکھیں کہ گذشتہ ایک ربع صدی سے اس پر کیا گذر رہی ہے۔ اور کیوں نہ تاریخ مسلمانوں اور ہندؤں کے اس جرم کو کبھی معاف نہیں کرے گی کہ ایک نے زبان کا دامن مذہب سے وابستہ کر کے اس کی وسعتوں کو محدود اور صرف ایک مذہبی گروہ کے اندر اس کو مقید کر دیا اور اس کو ملک کی تقسیم کے اسباب و دواعی میں سے ایک داعیہ بنایا اور دوسرے نے جواب ترکی بہ ترکی کو اپنا دستور بنا کر اس حقیقت کو بالکل بھلا دیا کہ اوٹ پٹانگ کسی کے کہنے کا اعتبار! اردو تو درحقیقت خود ان کی اپنی بھی زبان ہے اور اس کے پروان چڑھانے میں ان مدعیان خودکام کے علاوہ ان کے اپنے بزرگوں کا بھی بڑا قابلِ قدر حصہ ہے۔ ایک گھر اگر دو شخصوں میں مشترک ہے اور ایک شخص پاگل ہو کر چیخنا چلانا شروع کر دے کہ یہ گھر تو میرا ہے۔ تو اس صورت میں شریکِ ثانی کی عقل مندی اور

حقیقت شناسی کا تقاضا کیا ہونا چاہیے! یہ کہ وہ بھی پاگل بن جائے اور انتقام کے جذبہ میں اس شجر کو ہی بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے جتن کرنے لگے۔ یا یہ کہ کم از کم اپنے حصہ کی نگہداشت کرے اور اسے برباد نہ ہونے دے۔ اردو کے معاملہ میں بدقسمتی سے ایسا ہی ہوا۔ اس ملک کی اکثریت نے جذبۂ انتقام سے لبریز ہو کر اردو زبان سے نہ صرف اپنا رشتہ منقطع کر لیا۔ بلکہ اس کو اس کی زبان تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ اور یہ انکار اس زور و شور اور قوت کے ساتھ کیا گیا کہ اکثریت میں جو لوگ انصاف پسند تھے۔ ان کو یا تو اس کی تردید کی جرأت نہیں ہوئی اور اگر کسی نے اکا دکا اس کے خلاف آواز اٹھائی بھی تو وہ انبوہ کثیر کے شور و غل میں دب دبا کر رہ گئی اس صورت حال نے اردو کی اصل پوزیشن ہی بدل دی۔ حد یہ ہے کہ اب مرکزی حکومت یا بعض ریاستی حکومتیں اردو کے لئے کچھ کر بھی رہی ہیں تو اس لیے نہیں کہ یہ ایک اہم قومی مسئلہ ہے۔ بلکہ اس نیم شعوری تخیل کے ساتھ کہ یہ مسلمانوں کا معاملہ ہے اور حکومت ان کو مطمئن کرنا چاہتی ہے۔ یہ درحقیقت اردو کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ بلکہ ناانصافی ہی کی ایک دوسری انصاف نما شکل ہے اور اس لئے اردو کو اس پر خوش یا مطمئن ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔

یہ ذکر تو یہاں ضمناً آگیا۔ ورنہ آگے اپنے موقع پر گورنمنٹ کے ان کارناموں پر تفصیل سے گفتگو ہوگی۔ بہرحال تقسیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک میں اردو لاوارث۔ بے یار و مددگار اور زبون حال ہو کر رہ گئی۔ اس کا نقش وجود خطرہ میں پڑ گیا۔ اور چاروں طرف سے اس پر مخالفانہ یورش ہونے لگی۔ ظاہر ہے جب اپنے بھی کترانے لگے ہوں، تو اس کے بقا کی کیا ضمانت ہو سکتی تھی۔ لیکن بحیثیت ایک علمی اور ادبی زبان کے اردو کی رعنائی، دلکشی، اور جاذبیت اور اس وجہ سے اس کی صلاحیت زیست و بقا کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان سخت مایوس کن اور دل شکن حالات میں بھی علم و ادب کی جانی پہچانی منزلوں میں کوئی منزل ایسی نہیں ہے جس میں اس کی ترقی کا قدم رکا ہو اور وہ برابر آگے نہ بڑھتی رہی ہو۔ اگرچہ شاعری کے میدان میں بھی

اس نے جو نشو ونما کی ہے اس میں نئے تجربے ہوئے۔ اور کچھ نئے آہنگ سنائی دیتے ہیں۔ چونکہ ہر زمانہ کی شاعری اس زمانہ کے سماج کی ترجمان ہوتی ہے۔ اس بنا پر ان پچیس برسوں یہاں شاعری کا جو ذخیرہ پیدا ہوا ہے اس میں مجموعی حیثیت سے ناکامی درماندگی کا احساس یت، جھنجلاہٹ، تلخی، بدمزگی فراریت زیادہ پائی جاتی ہے۔ بے شبہ غم اور سوز وگداز شاعری کی جان ہے۔ لیکن صرف وہ غم جو زیست کا ارمان بن گیا ہو اور وہ سوز وگداز جو حوصلۂ عشق و محبت کا نور ہو۔ لیکن نئی نسل کی شاعری میں غم اور سوز وگداز دونوں اپنی اس صفت سے محروم ہیں۔ اس بنا پر اس شاعری کی آواز گھٹی گھٹی اور لب ولہجہ پھیکا پھیکا سا ہے۔ یہ شاعری سماج کی ترجمانی ضرور کرتی ہے۔ لیکن اسے کوئی راہ نہیں دکھاتی غم کی کہانی سناتی ہے لیکن غم کو حاصلِ زیست بنانے کا حوصلہ نہیں بخشتی۔ یہ سرمایہ داری طبقاتیت اور سماج میں اونچ نیچ کی مرثیہ خواں ہے۔ لیکن یہ آتشِ نمرود میں بے خوف وخطر کود پڑتا ہے اور جو حسن مطلق و مجرد کہ محیط کائنات اور راز کن ہے۔ ان دونوں کی طرف سے اس شاعری کی آنکھیں بند ہیں۔ اس بنا پر یہ شاعری ہنگامی وقتی ہے اور اس میں وہ ابدیت نہیں ہے جو ہر دور اور ہر زمانہ میں اس کو تر وتازہ اور زندہ رکھ سکے۔ ہماری پرانی نسل کے شاعر جو اب چند ہی رہ گئے ہیں۔ ان قدردوں کو اب تک سے لگائے بیٹھے ہیں اور یہ ان ہی کے انفاسِ گرم کا صدقہ ہے۔ کہ تقسیم کے بعد بھی اردو شعر و شاعری کے باغ میں خزاں نہیں آئی۔ جدید شاعری ان سے جو نئے تجربے ہو رہے ہیں ان کا مستقبل ابھی غیر یقینی ہے۔ اب تک اس کو قبولِ عام نہیں ملی۔ اس لئے اس کے متعلق ابھی پیشن گوئی کرنا قبل از وقت ہے

شاعری سے قطع نظر! علم وادب کے ہر میدان میں اس کی تاخت جاری ہے۔ تقسیم سے ادارے قائم تھے مثلاً دار المصنفین اعظم گڑھ۔ ندوۃ المصنفین دہلی۔ انجمن ترقی اردو علی گڑھ لام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ بمبئی۔ ان اداروں میں کام کی رفتار اور نوعیت رہی ہے جو

پہلے تحقیق۔ ان کے علاوہ چند چھوٹے موٹے اور نئے ادارے بھی قائم ہیں جو اردو میں کتابیں چھاپ رہے ہیں۔ روزنامے، سہ روزہ اور ہفتہ وار اخبارات دجمائد اور ماہانہ مجلات ورسائل جو میں معیاری بھی ہیں اور غیر معیاری بھی تقسیم سے پہلے کی طرح اب بھی نکل رہے ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ خود اردو زبان کے ادب پر تحقیق و تنقید اور اس کے درس و تعلیم کا جو اہتمام اب ہے وہ پہلے نہ تھا۔ ہندوستان میں یونیورسٹیوں کی تعداد کی نسبت سے اگرچہ بہت کم تاہم متعدد یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے قائم ہیں اور پانچ چھ یونیورسٹیوں میں اس کی پروفیسرشپ بھی ہے۔ ان شعبوں کے ماتحت تعلیم و تدریس اور تحقیق و ریسرچ کے کام ہو رہے ہیں یہ امر باعث مسرت ہے کہ ان یونیورسٹیوں نے دہلی، علی گڑھ، الٰہ آباد، لکھنؤ، گورکھپور، کشمیر، حیدرآباد، بمبئی اور مدراس وغیرہ میں ایسے لائق و فاضل نوجوانوں کا ایک حلقہ پیدا کیا ہے۔ جنہوں نے اُردو زبان میں تحقیق و تنقید کا معیار بلند کر دیا۔ اور بہت اچھی اچھی کتابیں لکھی اور شائع کی ہیں۔ اسی سلسلہ میں خاص لسانیات اور دکنی زبان پر جو کام ہوا ہے۔ وہ بڑا قابلِ قدر اور امید افزا ہے اس نے زبان کا علمی وقار بڑھا دیا ہے۔ لیکن جو موضوع ہمارے ادیبوں اور مصنفوں کا سب سے زیادہ توجہ کا مرکز رہا ہے وہ فنِ تنقید ہے اس میں شبہ نہیں کہ ان پچیس برسوں میں اسی موضوع پر کتابوں اور مقالات کی وہ بھرمار ہوئی ہے جو کسی اور موضوع کے حصہ میں نہیں آئی لیکن تنقید صرافہ کا ایک ایسا بازار ہے جہاں کھوٹا اور کھرا سب کی کھپت ہو جاتی ہے۔ تاہم یہ خوشی کی بات ہے اس سلسلہ میں جو لٹریچر پیدا ہوا ہے اس میں معیاری اور کھرے ادب کا پلہ بہ نسبت کھوٹے اور غیر معیاری کے بڑھا ہوا ہے۔ اور یہ ان اساتذہ کی کوششوں اور توجہ کا نتیجہ ہے ہے۔ جنہوں نے اردو کے نوجوان ادیبوں اور مصنفوں کی تربیت کرنے اور ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں خونِ جگر پیا ہے۔

اُردو کی اس ترقی کے سلسلہ میں دو باتیں خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہیں۔ (۱) ایک یہ کہ اس زبان کی علمی اور ادبی دلکشی اور جاذبیت کا یہ عالم ہے کہ اس کی ترقی اور پیش رفت میں اردو دانوں کے ساتھ ان حضرات کا بھی بڑا قابل قدر حصہ ہے۔ جو دوسرے مضامین سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ عربی اور

...کے ساتھ تو خیر اس زبان کا شروع سے ہی چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ اور اس کے میر کاروان ...اور فارسی کے اساتذہ ان دونوں زبانوں کے ماہر رہے ہیں۔ عہد جدید کی خصوصیت یہ ہے ...ان دو زبانوں کے علاوہ جن حضرات کا اصلاً اور اساساً تعلق انگریزی زبان کے ادب اور ...یر سے ہے۔ یا جو فلسفہ، نفسیات، تاریخ اور سیاسیات وغیرہ سے متعلق ہیں انہوں نے بھی اردو ...ن کے ادب میں اپنی تحقیق و تنقید سے گراں قدر اضافہ کیا اور کر رہے ہیں، اور (۲) دوسری بات ...ہے کہ اس میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں۔ گذشتہ پچیس برس میں اردو میں جو تحقیقی۔ ...قیدی یا شعری سرمایہ پیدا ہوا ہے اس میں بے شبہ ان ہندو۔ بلکہ بعض سکھ نوجوانوں کا بھی معتدبہ ...حصہ ہے جنہوں نے اپنی تخلیقات سے اُردو ادب کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اور اس میں روز بروز ...اضافہ کر رہے ہیں۔ ابھی چند روز ہوئے ایک صاحب کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ سائنس کے ڈاکٹر ہیں ...جناب ان کو شوق ہوا تو یورپ کی کسی یونیورسٹی سے اُردو میں پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے ...کے لئے تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں

علاوہ ازیں اردو کے جمال دلفرد نز کی جہان تابی کا یہ عالم ہے کہ اپنے ملک سے باہر ...شرق و مغرب کے دوسرے ملکوں کے لوگوں کو بھی اپنی زلفِ گرہ گیر کا اسیر بنا لیا ہے۔ چنانچہ آج امریکہ ...رپ۔ مشرق وسطیٰ۔ افریقہ اور اس کی یونیورسٹیوں میں اس کی تعلیم و تدریس کا انتظام ہے۔ ...یسرچ کا بندوبست ہے اور مختلف قسم کے منصوبے ہیں جن کی تکمیل پر لاکھوں روپیہ سالانہ خرچ ...ہو رہے ہیں۔ اور میر و غالب کی غزلیں شیکسپیر اور ملٹن کے وطن میں گل اندامان مغرب گا رہے ہیں۔ ...ہندوستان میں گذشتہ سو برس کی تاریخ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر ریسرچ اور اردو زبان کو سیکھے ...بغیر مکمل ہو سکے۔ اس بنا پر جن غیر ملکی یونیورسٹیوں میں ہند لوجی کے ڈپارٹمنٹ قائم ہیں ان کے ماتحت اُردو ...تعلیم کا بھی اعلیٰ بندوبست ہے۔ اُردو کی بھی وہ فتوحات ہیں جن کے باعث وہ اپنے وطن کے ...زبان دوستوں کو خطاب کر کے کہہ سکتی ہے

لو وہ بھی کہتے کہ بے ننگ و نام ہے ✤ یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ میں گھر کو میں

آپ کو حق ہے۔ اردو کی اس عظمتِ شان و رفعتِ مقام پر جتنا بھی خوش ہونا چاہیں ہو لیجئے لیکن اس انقلاب روزگار کو کیا کہئے کہ کل تک پورا ملک جس زبان کا وطن تھا، آج پچیس کروڑ انسانوں کی آبادی میں کوئی ایک علاقہ بھی ایسا نہیں جس میں وہ اکثریت کی زبان نہ سہی۔ اقلیت ہی کی زبان یعنی نمبر ۲ تسلیم کی گئی ہو۔ ہندوستان میں اردو (جس کی عوامی بولی کا نام ہندوستانی ہے) کے سوا کوئی اور زبان ایسی نہیں ہے۔ جو اپنے وطنِ اصلی کے علاوہ ہر صوبہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہو اور اس طرح گویا بین الصوبجاتی زبان ہو، لیکن اسی خصوصیت اور وسعت کے باوجود آج سرکار کے کسی دفتر میں اس کا گذر نہیں۔ ملک کو آزاد ہوئے۔ ایک ربع صدی بیت گئی۔ اس مدت میں کیا کچھ نہیں ہوا! ہر چیز ترقی کر کے کیا سے کیا ہو گئی! ویرانے عظیم الشان شہر اور کھنڈرات محل بن گئے لیکن یہ ایک اردو ہے جسے اسی ملک میں کہیں کوئی ایک ٹھکانہ ہی میسر نہیں!

ساون آئے پھول کھلے ایک افسردہ بول اٹھا ÷ جس میں دل کھل جاتے ہیں وہ برکھا کب ہوتی ہے

دستور نے جن چودہ زبانوں کو ملک کی زبان تسلیم کیا ہے ان میں ایک اردو کا بھی نام ہے مگر لیکن کس علاقے کی سرکاری زبان ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب دل میں کھوٹ ہوتا ہے تو انسان بڑی سے بڑی بے انصافی کے لئے بھی جواز کی کوئی دلیل پیدا کر لیتا ہے۔ لیکن اردو کے ساتھ یہ نا انصافی ایک ایسا کھلا اور واضح جرم ہے جس کا جواز کسی دلیل سے بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اس ملک میں ایسی لسانی اقلیتیں بھی موجود ہیں۔ جنہوں نے اپنے عزم و ہمت استقلال و ایثار سے صوبوں کی تقسیم کرا کے اپنی زبان کے لئے ایک الگ صوبہ منوا لیا ہے۔ لیکن اردو کی بد قسمتی! اس کے پجاری وہ بہادر ہیں جو اردو کو کارپوریشن تو کیا کسی میونسپلٹی کی زبان بھی نہیں منوا سکے۔

حکومت کے دو حربے بہت سخت اور ساتھ ہی اب تک نہایت موثر ثابت ہوئے ہیں۔ ایک ہے دباؤ (PRESSURE) اور (۲) دوسرا ہے بہلاوا اور پھسلاوا۔

(PERSUATION) بھی وہ دو حربے ہیں جن سے اس نے ناگا لینڈ اور کشمیر کو فتح کیا۔
ان کے حالات کو بدل کر رکھ دیا۔ حکومت بھی دو حربے شروع سے اُردو کے خلاف استعمال
رہتی ہے۔ چنانچہ اس کا پہلا مظاہرہ اس وقت ہوا جب کہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم جو اُردو تحریک
کے سب سے بڑے لیڈر تھے۔ اور جنہوں نے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمت میں
دستور کی ایک دفعہ کے ماتحت بیس لاکھ دستخطوں کا ایک میمورنڈم ایک وفد کے سربراہ کی
حیثیت سے پیش کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد جب ڈاکٹر صاحب ابھی بہار کے گورنر بھی تھے۔
میں کیسا انقلاب پیدا ہو گیا؟ اس کا اندازہ اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۵۹ء کے شروع
میں میں نے انجمن ترقی اُردو مغربی بنگال کے صدر کی حیثیت سے کلکتہ میں ایک عظیم الشان
انڈو پاک مشاعرہ کا اہتمام کیا اور اس کے ساتھ ہی انجمن کی دعوت پر کل ہند انجمن ترقی اُردو
سالانہ کانفرنس بھی منعقد ہوئی۔ ان دنوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کلکتہ آئے ہوئے تھے
سابقہ نیاز مندی کے تعلق سے ایک روز میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور انجمن ترقی اردو
سالانہ کانفرنس اور انڈو پاک مشاعرہ کا افتتاح کرنے کی درخواست پیش کی لیکن مجھ کو سخت
سی ہوئی۔ جب ڈاکٹر صاحب نے درخواست کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے ازراہِ معذرت
ایا۔ اب میں اردو کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں۔ مجھے سخت افسوس ہوا۔ واپس آکر دوستوں کے
مشورے سے ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے۔ وزیر اعلیٰ مغربی بنگال کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہی
درخواست پیش کی۔ موصوف بے چون و چرا فوراً رضامند ہو گئے۔ لہٰذا جو حضرات اس کانفرنس میں
وقت موجود تھے۔ انہیں یاد ہوگا کہ ڈاکٹر رائے نے کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اُردو میں تقریر کی اور
اردو کے کاز کی حمایت میں بڑی حوصلہ افزا باتیں کہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اس وقت گورنر
۔ اس کے بعد وہ برابر بلند ہوتے چلے گئے یہاں تک بلندی کا کوئی اور زینہ ہی نہ رہا۔ موصوف
کے علاوہ اردو تحریک کے ابتدائی دور کے چند اور حضرات ہیں جن کو حکومت کی نظرِ عنایت
ہا گئی۔

بہرحال حکومت نے اب تک بہلاؤ پھسلاؤ کی جو پالیسی اختیار کی ہے. اب مرکز میں ترقی اردو بورڈ اور اترپردیش میں اردو اکاڈمی اور اُردو بورڈ وغیرہ کا قیام یہ سب اسی سلسلے کی کڑی ہیں. مقصد یہ ہے کہ اردو والے اس ہمرنگِ زمین دام میں گرفتار ہو گئے تو اُردو کا قصہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا. آج اگر مرزا غالب ہوتے تو ان ترقی اُردو بورڈوں اور اکاڈمیوں سے متعلق یہ برجستہ فرماتے.

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

چنانچہ خدا بھلا کرے مسلمانوں کی .... نام نہاد قیادت کا! حکومت کی اس نظرِ عنایت پر بہت مسرور اور مطمئن نظر آتی ہے. حالانکہ پچھلے دنوں اترپردیش کے وزیر اعلیٰ نے یہ فرما کر "اردو کے علاقائی زبان ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے. اُردو کے حق میں سزائے موت یا کم از کم جلا وطنی کا فیصلہ سنا دیا ہے. لیکن کوئی پوچھے اس اعلان کے بعد بھی اُردو تحریک کا اس ملک میں کوئی وجود ہے؟ (باقی آئندہ)

ضروری گذارش

حضرات ممبران ادارہ اور برہان کے معزز ناظرین سے گذارش ہے کہ ادارہ کی جانب سے آپ حضرات کی خدمت میں یاد دہانی کے جو خطوط ارسال کیے جاتے ہیں. ان پر فوری توجہ فرما کر دفتر کو اپنی ہدایات سے مطلع فرما دیا کریں۔

خطوط ارسال فرماتے وقت یا منی آرڈر ارسال کرتے ہوئے کوپن پر اپنی ہدایات ---- اردو. اور انگریزی میں مکمل پتہ اور چٹ پر لکھا ہوا اپنا خریداری نمبر درج فرمانا نہ بھولیں۔ نیاز مند (منیجر)

مقالات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۱)

از سعید احمد اکبر آبادی

فرض کیجئے آپ نے اپنا ایک گھر بڑی تمناؤں اور آرزوں سے بنایا ہے۔ جس میں موجودہ زمانہ کی تمام سہولتیں اور آسانیاں فراہم ہیں۔ یہ مکان بنایا تو دراصل آپ نے اپنے اور اپنی اولاد کی آسائش و راحت کے لئے تھا۔ لیکن آپ کے تعلقات وسیع تھے۔ اس لئے آپ کے دوست احباب جو ہر مذہب و ملت کے لوگوں پر مشتمل تھے۔ ان کے لئے اس مکان کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوا۔ یہ لوگ آتے تھے اور بے تکلف تھوڑے بہت دن یہاں مقیم رہ کر مکان کی آسائشوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ مکان بہر حال آپ کا تھا۔ اس کا درد بست دیکھ بھال اور نگرانی یہ سب آپ کی تھی۔ آپ اس حالت میں کس اطمینان اور خود اعتمادی سے رہتے تھے۔ لیکن ایک دن صبح کو جب آپ کی آنکھ کھلی تو اچانک معلوم ہوا کہ لک میں انقلاب آگیا ہے۔ جاگیر جائداد اور املاک کے قاعدے اور قانون بدل گئے ہیں' وران قوانین کے ماتحت آپ کے مکان پر کسٹوڈین کا قبضہ ہوگیا ہے آپ رہیں گے اب بھی اسی کان میں وہ مکان ہوگا۔ اب بھی آپ کے نام سے منسوب ہا بلکہ آپ اس مکان میں پہلے سے زیادہ وسعت ر آرام کا و آسائش کا سامان ہوگا۔ فرنیچر بھی پہلے سے زیادہ قیمتی اور بافراط ہوگا۔ لیکن درو بست ر اس کا انتظام کسٹوڈین کے ہاتھ میں ہوگا۔ جو ہوسکتا ہے کہ آپ کا بھائی بند ہی ہو اور غیر ہو۔ فرمائیے! اگر آپ کے مکان ساتھ یہ معاملہ پیش آئے تو آپ کو طبعی طور پر صدمہ اور نج ہوگا یا نہیں؟ ہوگا۔ اس بنا پر ہم کو شروع میں ہی یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) بل ۱۹۷۲ء سے جو حال میں ہی پارلیمنٹ سے منظور ہو کر صدر کی تصدیق و توثیق کے بعد نافذ ہوا ہے، مسلمانوں کو عام طور پر مایوسی ہوئی ہے اور اس یونیورسٹی کے ساتھ ہمیشہ جو ان کو گہرا تعلق اور جذباتی لگاؤ رہا ہے۔ اس کو شدید ٹھیس لگی ہے جس سے وہ بلبلا اٹھے اور سراسیمہ و مضطرب ہو گئے ہیں۔ لیکن زمانہ سدا یکساں نہیں رہتا۔ وہ بدلتا ہے۔ تو سماج کی قدریں بدلتی ہیں۔ رہن سہن اور آپس کے علائق و روابط کے قاعدے قانون اور ضابطے بدلتے ہیں۔ اور اس وقت وہی لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں جو وقت کی دیوار پر ان لکیروں کو پڑھ کر جدید دور کے ساتھ مطابقت پیدا کر لینے کی کوشش بیدار مغزی اور روشن دماغی کے ساتھ اس طرح کرتے ہیں کہ ان کی انفرادیت ختم نہیں ہوتی اور وہ زمانہ کے ساتھ آگے بھی بڑھتے رہتے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کا بل موجودہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے تاریخ کا ایک نہایت اہم موڑ ہے۔ اور ان کی آئندہ نسلوں پر اس کے بہت دور رس اثرات پڑیں گے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مسلمان جذباتیت سے الگ ہو کر حقیقت پسندی کی نظر سے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس یونیورسٹی کے ماضی اور حال کا جائزہ لیں اور اس کی روشنی میں یہ طے کریں کہ مستقبل میں جو امکانات ہیں۔ ان سے کس طرح عہدہ برا ہو سکتے ہیں زمانہ کا آہنگ بدلا ہے تو انہیں بھی اپنے نغمہ کے لیے ایک ایسی لے تلاش کرنی ہوگی جو اس آہنگ کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے۔ قومی مسائل و معاملات کبھی جذباتیت کی راہ سے طے نہیں ہوتے ترجمانِ حقیقت نے اسی لئے کہا ہے۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

اب آئیے پہلے اسی یونیورسٹی کے ماضی کا جائزہ لیں۔

سرسید کا نصب العین | اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ۱۸۷۵ء میں سرسید نے جو ایم اے او کالج قائم کیا تھا۔ اگرچہ اس کا دروازہ غیر مسلموں پر کبھی بند نہیں ہوا چنانچہ سرسید کی زندگی

میں اس کالج سے جو ایک سو بتیس طلبا گریجویٹ ہوئے ان میں ۹۰ مسلمان تھے اور باقی ۴۲ ہندو۔ لیکن اس کالج کے قیام کا اصل مقصد مسلمانوں کو تعلیم جدید سے بہرہ یاب کرنا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے ۱۸۵۷ء کے حوادث و واقعات کا سب سے زیادہ اثر مسلمانوں پر پڑا تھا۔ انگریزوں کے جذبۂ انتقام اور غیظ و غضب کا نشانہ سب سے زیادہ یہی بنے تھے۔ ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ان کی پسماندگی کا منظر نہایت دردانگیز اور تشویش افزا تھا۔ اس لیے سرسید نے اپنی زندگی مسلمانوں کی تعمیر و ترقی اور ان کی تشکیل نو کے لئے وقف کردی۔ فرقہ پرستی اور قوم پروری میں صرف ایک باریک فرق ہے اگر سرسید یہ سب کچھ اس نیت اور اس ارادے سے کرتے کہ انہیں مسلمانوں کو ہندوؤں کا مد مقابل اور برابر کا حریف بنانا ہے تو وہ فرقہ پرست کہلاتے۔ لیکن انہوں نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ جسم کا اگر کوئی ایک عضو کمزور رہ جائے تو پورے جسم کو تندرست نہیں کہا جا سکتا۔ تو پھر کون کہہ سکتا ہے کہ سرسید کا یہ عمل قوم پرورانہ نہیں تھا اور اس سے پوری ہندوستانی قوم اور ملک کو فائدہ پہونچنے والا نہیں تھا۔ چنانچہ سرسید کی پوری زندگی ان کے اسی بلند اور نیک ارادہ و مقصد کی ترجمان ہے۔ اس زمانہ میں جو انصاف پسند ہندو تھے وہ سرسید کی اس عظمتِ فکر و عمل کا اعتراف بھی کرتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال کی دیواروں میں جن چندہ دینے والوں کے نام کندہ ہیں آپ دیکھیں کہ ان میں ہندوؤں کے نام بھی ہیں۔ ایک طرف سرسید کی بلند نظری کا یہ عالم تھا کہ وہ ہندوؤں کو اپنی ایک آنکھ کہتے تھے۔ اور دوسری جانب ہندوؤں میں سرسید کی پذیرائی اس درجہ تھی کہ جالندھر میں جب ان کو ہندوؤں کی طرف سے استقبالیہ دیا گیا تو اڈریس میں صاف طور پر اس کا اعتراف کیا گیا تھا کہ سرسید صرف مسلمانوں کے نہیں بلکہ ہندوؤں کے بھی محسن ہیں۔ بہر حال سرسید نے یہ کالج اصلاً اور حقیقۃً مسلمانوں کے لیئے بنایا تھا اور کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کا یہ عمل آج کل کے اصطلاحی معنی میں فرقہ پرستانہ تھا۔

چونکہ مسلمان مذہب کے بغیر رہ نہیں سکتے اور اس کا تحفظ اور اس کے احکام کی پابندی ہر حال میں ضروری ہے۔ اس بنا پر سرسید نے کالج میں انگریزی اور علوم جدیدہ کی تعلیم کے ساتھ دینیات اور اسلامی علوم و فنون کی تعلیم کا بھی بندوبست کیا۔ اسلامی شعائر اور اسلامی تہذیب و روایات کے تحفظ و بقا اور ان کی نشو و نما کے لئے جو چیزیں ضروری تھیں ان کے بھی انتظامات کئے اور اس طرح انہوں نے مسلمان نوجوانوں کی اسلامی تربیت کو بھی ان کی تعلیم کا لازمی جزو قرار دیا۔ انہیں وجوہ کی بنا پر سرسید کے نزدیک تعلیم کے لئے اقامتی زندگی ناگزیر تھی۔ سرسید نے ایک موقع پر بڑی صفائی اور قوت سے کہا ہے: "کسی قوم کے لئے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کھو دے انہیں ان مسلمانوں پر سخت غصہ آتا تھا۔ جو اپنے بچوں کو مشنری اسکولوں میں بھیجتے تھے کہ وہاں تعلیم خواہ کتنی ہی اعلیٰ اور عمدہ ہو۔ لیکن بچے اپنے دین سے منحرف ہو جاتے تھے۔ ایک لکچر میں کس سوز و گداز اور درد سے کہتے ہیں۔ مسلمانوں کو شرم نہیں آتی کہ مشنری تعلیم گاہوں میں اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں۔ ان کو جوش پیدا نہیں ہوتا۔ ان کو غیرت نہیں آتی (لکچروں کا مجموعہ میں ۱۵۸)

سرسید کا یہ کالج صرف ایک تعلیم گاہ نہیں تھا۔ بلکہ درحقیقت انیسویں صدی کے ربع آخر میں ایک ایسی ہمہ گیر اور نہایت توانا تحریک تھی جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا اور ان کی حیاتِ ملی و قومی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا۔ جو اس تحریک سے متاثر نہ ہوا ہو۔ عجب اتفاق ہے سرسید نے جب اپنی تحریک شروع کی تو یہ زمانہ عالم اسلام میں بحران کا زمانہ تھا چنانچہ اسی زمانہ میں ترکی، مصر، انڈونیشیا، ایران اور مراکو اور نائجیریا میں بھی اصلاحی تحریکیں اور بڑے بڑے مفکر اور مصلح پیدا ہوئے۔ لیکن سرسید نے جن حالات میں تحریک شروع کی۔ اس کو جس طرح کامیاب بنایا اور اس تحریک نے مسلمانوں میں جو انقلابِ عظیم برپا کیا۔ اگر ان سب چیزوں کو سامنے رکھ کر سرسید کا موازنہ

اس زمانے میں عالم اسلام کے دوسرے مفکرین و مصلحین سے کیا جائے۔ تو بے مبالغہ مجموعی حیثیت سے سرسید سب سے زیادہ قدآور ثابت ہوں گے۔ یوں تو اس دنیا کی ریت یہ ہے کہ ایک شخص اپنی حیاتِ مستعار کی ہر راحت و آسائش قربان کرکے ایک چیز ایجاد کرتا ہے پوری دنیا اس ایجاد سے فائدہ اٹھاتی رہتی ہے۔ لیکن اس کے مرجانے کے بعد تاریخ کی چند کتابوں کے علاوہ دنیا اس شخص کا نام تک بھول جاتی ہے اس لیے اگر آج سرسید کو بھی لوگ بھول گئے تو اس پر حیرت اور اسی کا شکوہ کس سے اور کیوں کر کیجئے۔

سرسید کے ذہن میں یونیورسٹی کا تصور سرسید ایسا حوصلہ مند شخص یونیورسٹی سے کم کس چیز پر قانع ہو سکتا تھا! چنانچہ ان کا اصل ارادہ یونیورسٹی ہی قائم کرنے کا تھا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں۔ سید محمود نے جو اسکیم ۱۰ر فروری ۱۸۷۳ء کو کمیٹی میں پیش کی تھی۔ اس میں انہوں نے صاف صاف اس بات کی تصریح کردی تھی کہ ہماری غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ ایک یونیورسٹی قائم کرنی ہے۔ پس کمیٹی نے جو انگریزی میں اپنا نام محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج فنڈ کمیٹی رکھا ہے۔ اس میں بجائے کالج کے یونیورسٹی کا لفظ ہونا چاہیئے۔ اور اردو میں بجائے مدرسۃ العلوم کے دار العلوم نام رکھنا چاہیے۔ (حیاتِ جاوید جلد اوّل) اس یونیورسٹی کی نسبت سرسید کے عزائم اور مقاصد کس درجہ بلند اور اعلیٰ تھے۔ اس کا اندازہ ان کی ایک تحریر کے مندرجۂ ذیل اقتباس سے ہوگا فرماتے ہیں:۔

"یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کی سی ہے۔ ہم یونیورسٹیوں کے تابع ہیں۔ اس کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں۔ جو ٹکڑا ٹیرا علم کا وہ دیتی ہے اس کو کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں۔ اور اس پر قناعت کرتے ہیں۔ اے دوستو! ہماری پوری تعلیم اس وقت ہوگی جب کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ یونیورسٹیوں کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی۔ ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنے قومی علوم پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا۔ سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمۂ لا الٰہ الا اللہ

محمد رسول اللہ کا تاج سر پہ ہو یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو مجرنیالی ہے۔

اس کے بعد نہایت صفائی سے فرمایا۔

اے دوستو! میں خود بھی انہی میں ہوں۔ کیونکہ مجھکو ایک یونیورسٹی نے ال۔ال۔ڈی کی ڈگری دی ہے۔ ہم آدمی جب ہی بنیں گے جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ (حیات جاوید ۲۰۱)

سرسید کی یہ تقریر اور اس کے علاوہ اس سلسلے میں جو کچھ لکھا اور کہا ہے اس سب کو پیش نظر رکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ سرسید جس قسم کی یونیورسٹی مسلمانوں کے لئے قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس کی خصوصیات حسب ذیل تھیں۔

(۱) یہ یونیورسٹی کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے طرز پر ہوگی۔ اس بنا پر اس کے سلے اقامتی کردار اس کا جزء لاینفک ہوگا اور اس کا معیار تعلیم وہی ہوگا جو ان یونیورسٹیوں کا ہے۔ فرق صرف اسی قدر ہوگا کہ ان یونیورسٹیوں میں عیسائی عقائد اور مغربی تہذیب کی تعلیم ہوتی ہے اور اس یونیورسٹی میں اسلامی عقائد کی تعلیم دی جائے گی۔ اور اس کی فضا اسلامی تہذیب کی ہوگی۔

(۲) اس مقصد کے پیش نظر مغربی علوم و فنون اور انگریزی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ یہاں اسلامی علوم و فنون اور دینیات کا درس بھی ہوگا۔

(۳) یونیورسٹی حکومت کے کنٹرول اور اس کی مداخلت سے بالکل آزاد ہوگی۔

(۴) اس یونیورسٹی کا انتظام تعلیم تمام تر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور اس معاملہ میں وہ کسی کے تابع نہیں ہوں گے۔

(۵) اس مقصد کے لئے یونیورسٹی کے تمام اخراجات کا تکفل مسلمانوں کو خود کرنا چاہیے۔ گورنمنٹ کی امداد پر بھروسہ کرنا یونیورسٹی کے مقاصد سے اغراض برتنا ہے۔

تعلیمی خود مختاری و آزادی ان دفعات میں ہمارے مقصد کے پیش نظر دفعات ۳۔۴۔۵) زیادہ اہم ہیں جن میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یونیورسٹی حکومت کی

مداخلت سے آزاد ہوگی۔ مسلمان اپنی تعلیم کے خود مالک اور اس کے اخراجات کے خود متکفل ہوں گے۔ درحقیقت سرسید کی یہ رائے تعلیم سے متعلق اسلامی فکر کی بالکل صحیح ترجمان ہے۔

اسلام میں تعلیم دین کی ہو یا امور دنیویہ کی ایک نہایت مقدس اور ضروری فریضۂ انسانی ہے اس بنا پر اس کو بالکل آزاد اور حکومت وغیرہ کے دباؤ سے محفوظ ہونا چاہئے۔ اور ساتھ ہی خدمت بنی نوع انسان کے علاوہ اس کو ذریعۂ معشیت بنانا ایک مشہور مثل کے مطابق کشمیر کی بنی ہوئی ایک نہایت قیمتی شال سے جوتوں کے صاف کرنے کا کام لینا ہے۔ پوری تاریخ اسلام میں تعلیم سے متعلق ارباب علم اور اصحاب درس و تعلیم کا تذکرہ اس امر کی بیّن شہادت ہے کہ مسلمانوں نے اپنے تعلیمی نظام کو حکومت کے اثر سے ہمیشہ آزاد رکھا ہے۔ چنانچہ اسی علی گڑھ کالج سے دو تین برس بیشتر دیو بند میں مدرسہ قائم ہوا تو اس کے بانی مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے مدرسہ سے متعلق اپنے وصیت نامہ میں جو اب تک محفوظ ہے۔ مدرسہ کے ارباب انتظام کو سخت تاکید کی کہ مدرسہ کا تعلق حکومت سے (چاہے اپنی ہو یا غیروں کی) ہرگز کسی قسم کا نہ ہو۔ اور نہ گورنمنٹ کی کوئی گرانٹ منظور کی جائے [1]

---

[1] الحمدللہ دارالعلوم دیوبند آج بھی جب کہ اس کا سالانہ بجٹ تیرہ لاکھ روپے ہے اپنی اس وضع پر قائم ہے میری طالب علمی کے زمانے کی بات ہے۔ ایکمرتبہ سرمیاں محمد شفیع اور سرمیاں فضل حسین جو اس زمانے میں وائسرائے کی اکزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔ دیو بند تشریف لائے ان کے اعزاز میں مدرسہ کے نودرہ میں ایک جلسہ ہوا۔ سرمیاں محمد شفیع نے (مجھے اب یہ یاد نہیں کہ دونوں حضرات ساتھ آئے تھے۔ یا یکے بعد دیگرے) نے اپنی تقریر میں مدرسہ اور اس کی خدمات کی بڑی تعریف کی اور پھر حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے فرمایا۔ گورنمنٹ کی بڑی خواہش ہے کہ وہ مدرسہ کو گرانٹ دے۔ یہ گرانٹ بغیر کسی شرط کے ہوگی۔ اس سے مدرسہ کو ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ طلباء کو ریلوے کنسیشن مل جائے گا۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے وہ بات بھی کہی جو آج کل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اقلیتی کردار کے محافظ عام طور پر کہتے ہیں (بقیہ صفحہ ۱۸ پر)

سرسید کے دل کی یہی پکار تھی جس کا اظہار ان کے انتقال کے بعد حضرت شیخ الہند کی زبان سے اس وقت ہوا جب کہ ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کرتے ہوئے آپ نے علی گڑھ کی جامع مسجد میں فرمایا۔

”ضرورت اس کی ہے کہ وہ (جدید) تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے کلیتہً آزاد ہو۔ کیا باعتبار عقائد و خیالات اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال کے اور کیا باعتبار اوضاع و اطوار کے ہم غیروں کے اثر سے پاک ہوں۔ ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں میں غلام پیدا کرتے رہیں۔ بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنہوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے“

(جوہر جامعہ جوبلی نمبر ص ۱۵۳)

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷ انہوں نے کہا۔ آپ حضرات کو گورنمنٹ سے گرانٹ لینے میں تامل کیا ہے؟ گورنمنٹ آپ کو جو روپیہ دے گی یہ تو وہی روپیہ ہے جو وہ آپ سے وصول کرتی ہے۔ اس تقریر کے جواب میں مدرسہ کی طرف سے حضرت الاستاد مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے ایک نہایت فصیح و بلیغ اور پُرمغز تقریر کی اور مدرسہ کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے سرشفیع کی بات کے رد بلیغ فرمایا۔ جی ہاں آپ نے بجا فرمایا کہ گورنمنٹ گرانٹ کی صورت میں جو روپیہ ہم کو دے گی وہ دراصل ہمارا یعنی ملک و قوم کا ہی روپیہ ہوگا۔ لیکن یہ روپیہ جن ہاتھوں سے ہم کو ملے گا اس میں ان ہاتھوں کے اثر کا آجانا ضروری ہے۔ اور ہم مدرسہ کو اس اثر سے محفوظ رکھنا ضروری خیال کرتے ہیں، سب جانتے ہیں۔ مولانا ایک نہایت بلند پایہ مقرر بھی تھے۔ اس لئے انہوں نے روپیہ میں ہاتھوں کے اثر کا فلسفہ ایسے موثر اور دل نشین انداز میں بیان فرمایا کہ حاضرین پر اس کا بڑا اثر ہوا اور سرشفیع پھر کچھ نہ کہہ سکے اور اپنے مشن میں ناکام واپس ہوئے۔ یہ واقعہ انگریزوں کے زمانہ کا تھا۔ اب آزادی کے بعد کا تجربہ ملاحظہ ہو

ایک عبرت انگیز واقعہ قومی حمیت وغیرت، عزتِ نفس اور خودداری کا بھی وہ مقام رفیع و بلند تھا کہ جب کبھی ہم نے اسے نظرانداز کیا ہے، غیروں سے بے محابا طعنے سنے اور ذلتیں اٹھائی ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا حالی نے ایک سخت عبرت انگیز واقعہ لکھا ہے انہیں کی زبان سے سنیئے۔ فرماتے ہیں:۔

"جب دوسری بار سید محمود (فرزند سرسید) تفریحاً انگلستان کو گئے اور کیمرج میں اپنے دوستوں سے ملے تو معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کا سرمایہ بہت بڑھ گیا ہے۔ اور آج کل ارادہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸ کا) ایک واقعہ سنیئے۔ غالباً ۴۸ء ۴۹ء کا زمانہ تھا۔ اس وقت اتر پردیش (میں ڈاکٹر) سمپورنانند جی وزیر تعلیم تھے۔ ایک مرتبہ لکھنؤ میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم، مولانا محمد طیب (صاحب) مہتمم دارالعلوم دیوبند اور راقم الحروف ہم تینوں سمپورنانند جی سے ملاقات کے لئے ان کے (مک)ان پر گئے، حسبِ معمول بڑے تپاک سے ملے اور باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ اب جب کہ ملک (آز)اد ہوگیا اور ایک قومی حکومت قائم ہوگئی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کو گورنمنٹ کی گرانٹ پر اعتراض (نہیں) ہونا چاہیئے۔ مولانا محمد طیب صاحب نے فوراً جواب دیا "سمپورنانند جی اگر حکومت مسلمانوں (کی) بھی ہو تب بھی ہم مدرسہ کے بانی کی وصیت کے مطابق کوئی گرانٹ منظور نہیں کرسکتے، ہمارا (اص)ل ہی یہ ہے کہ ہماری تعلیم ہر قسم کے بیرونی اثر اور دباؤ سے آزاد رہے۔ اس کے بعد (صدر) جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم دیوبند تشریف لے گئے۔ (لیکن) الحمدللہ مدرسہ آج تک اپنی اسی وضع پر قائم ہے۔ درحقیقت یہ بھی وہ خاکساران (خد)ا ہیں جن کی نسبت مولانا شبلیؒ نے فرمایا تھا:۔

اے کہ پرسی چہ کسانیم وچہ سامان داریم ⁂ آنچہ باہیچ نیرزد بجہان آن داریم
ما نہ آنیم کہ بر شیوۂ اربابِ حشم ⁂ روئے در راہے بدر دولت سلطان داریم
خاکسارانِ جہانیم وز اسباب جہاں ⁂ بوریائیست کہ در کلبۂ احزان داریم

یہ ہورہا ہے کہ جیرچ متعلقہ ٹرینٹی کالج کو منہدم کرکے ایک نہایت عظیم الشان عمارت ازسرنو بنائی جائے اور دس لاکھ روپیہ اس میں صرف کیا جائے۔ سید محمود نے پرنسپل کالج اپنے دوست سے کہا کہ اچھی خاصی عمارت کو توڑ کر اس میں روپیہ ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ اگر یونیورسٹی کا سرمایہ اس کی ضرورتوں سے بڑھ گیا ہے تو دو چار لاکھ روپیہ مدرستہ العلوم (علی گڑھ) ہی کی امداد کے لیے دے دیں۔ ان کے دوست نے کہا۔ "ہندوستان میں کتنے مسلمان رہتے ہیں؟" سید محمود نے کہا۔ "چھ کروڑ" وہ (انگریز دوست) سن کر نہایت متعجب ہوا۔ اور یہ کہا: "جس قوم کے لوگ ایسے پست ہمت اور کم حوصلہ ہوں کہ چھ کروڑ آدمی اپنی اولاد کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ قائم نہیں کر سکتے ان کی اعانت کرنی گناہ ہے ان کو تباہ ہونے دو!" (حیات جاوید ج ۱ ص ۱۵۸)

یہ نوٹ کرلیجئے کہ آج بھی ہندوستان میں مسلمان کچھ زیادہ چھ کروڑ ہی ہیں۔ اور بدقسمتی سے ان کے تعلیمی مسائل آج بھی وہی ہیں جو مدرستہ العلوم علی گڑھ کی تاسیس کے وقت تھے۔ وائے واماندگی شوق دہی داماں آرزو! قومیں کہاں سے کہاں پہونچ گئیں ہمارا تیز گام کی گرد کاروان بھی نظر نہیں آتی اور ہم پوری ایک صدی کے بعد بھی آج وہیں ہیں جہاں سے ہم نے سفر شروع کیا تھا!

ہر پھر کے ایک ہی دائرہ میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں!!

سرسید کی مایوسی اور ناکامی یہ وہ وقت تھا جب کہ کوئی شخص نقرہ بھی حکومت کی اجازت کے بغیر نہ توڑ سکتا تھا اور یونیورسٹی کا معاملہ تو ایسا تھا کہ حکومت اگر اس کو تسلیم نہ کرے تو اس کا وجود ہی معتبر نہیں ہوتا۔ اس بنا پر یونیورسٹی اور اس کے مقاصد سے متعلق گورنمنٹ کو لکھا گیا۔ لیکن اس نے مسلم یونیورسٹی کے نام سے یونیورسٹی کے قیام کی اجازت اور اس کو گرانٹ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں۔ "لوکل گورنمنٹ سے

اس کا یہ جواب آیا کہ اگر کمیٹی محمڈن یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے۔ تو گورنمنٹ اس میں گرانٹ ان ایڈ نہیں دے گی، باوجود اس کے سرسید کا ارادہ یہی تھا کہ یونیورسٹی قائم کی جائے۔ ان کو یقین تھا کہ جب تک موجودہ یونیورسٹیوں کی تعلیم سے قطع نظر نہ کی جائے گی۔ اور مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ان کی ضرورتوں کے موافق تعلیم وتربیت کا اپنے طور پر انتظام نہ کیا جائے گا۔ تب تک اصلی لیاقت قوم کے بچوں میں ہرگز پیدا نہ ہوگی لیکن قطع نظر اس کے کہ ایسی یونیورسٹی صرف قوم کے بھروسہ پر قائم کرنا آسان کام نہ تھا نہ طالب علم اور نہ ان کے مربی کوئی اس بات پر رضامند ہونیوالا تھا کہ یونیورسٹیوں کی ڈگریوں سے جو گورنمنٹ کی نوکری کا ذریعہ ہیں۔ قطع نظر کی جائے اور فی الحقیقت مسلمانوں کی حالت اسی بات کی مقتضی تھی کہ صرف موجودہ یونیورسٹیوں کی ڈگریاں حاصل کرنے کو ہی فوز عظیم سمجھا جائے۔ الغرض سرسید کو اپنا منصوبہ پورا کرنے سے بالکل مایوسی ہوگئی۔ یونیورسٹی کا خیال انہوں نے بالکل چھوڑ دیا۔

(حیاتِ جاوید ج ۱ ص ۱۷۳-۱۷۴)

مدرستہ العلوم علی گڑھ کا قیام سرسید کو اپنے تصور اور جذبہ و ولولہ کے مطابق یونیورسٹی کے منصوبہ میں اگرچہ مایوس اور ناکام ہونا پڑا تھا۔ لیکن وہ حالات سے بددل ہوکر جی چھوڑ دینے والے انسان نہیں تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ سخت مجبور کن اور صبر آزما حالات میں بھی قوم کی فلاح وبہبود کے لئے زیادہ سے زیادہ جو کچھ کیا جاسکتا ہے وہ کرنا چاہئے اور دل شکستہ ہوکر بیٹھ نہیں رہنا چاہئے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے:۔
"مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ" یعنی جس چیز کو تمام و کمال حاصل نہیں کیا جاسکتا اس کو تمام و کمال ترک بھی نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ انہوں نے بقول مولانا حالی کے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی ہے کہ:۔

نہ ہو تابِ پرواز گر آسماں تک ؛ تو واں تک اڑیں ہو رسائی جہاں تک

اور ۲۴ رمئی ۱۸۷۵ء کو مدرستہ العلوم قائم کر دیا جو بعد میں مسلم اینگلو اورنیٹل کالج کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کالج میں سرسید کو مجبوراً کورس تو وہی اختیار کرنا پڑا جو موجودہ یونیورسٹیوں کا مجوزہ اور ان کے ہاں رائج تھا لیکن ایک اس کورس سے قطع نظر مسلمان نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے یونیورسٹی کے سلسلہ میں سرسید کا ادرجو کچھ منصوبہ تھا اس کو انہوں نے کالج کی راہ سے مکمل کرنے کا پختہ عزم کر لیا۔ سرسید کے سامنے یونیورسٹی کا جو ایک اعلیٰ منصوبہ تھا۔ اس کا ایک جزیہ بھی تھا کہ گورنمنٹ کے اثر سے اس کو آزاد رکھا جائے لیکن جیسا کہ آپ نے مولانا حالی کی زبان سے ابھی سنا اس وقت کے مسلمانوں کے پیش نظر ان ہونی بات تھی۔ اس لیے سرسید نے جب یونیورسٹی کا خیال ترک کیا تو اب گورنمنٹ سے بے تعلقی کے بارے میں بھی اپنا نقطۂ نظر بدل لیا کہ شیخ سعدی رہ ایسے ناصح مشفق کی نصیحت ہے سہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" چنانچہ کالج کے سلسلہ میں سرسید نے جو کچھ کیا اس کا اگر تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو ان سب کا مقصد تین چیزیں ہی نظر آتی ہیں۔

(۱) کالج میں اگرچہ کورس وہی ہوگا جو اور یونیورسٹیوں میں اور خصوصاً الہ آباد یونیورسٹی میں مروج ہے لیکن اس کورس کی تعلیم اعلیٰ سے اعلیٰ ہونی چاہیئے اور اگر اس کے لئے بیش قرار تنخواہوں پر یورپین اسٹاف درکار ہو تو اس میں تامل نہیں ہونا چاہیئے۔

(۲) کالج کے لئے گورنمنٹ کا اعتماد حاصل کرنا چاہیئے تاکہ ایک طرف گورنمنٹ کی امداد اعانت سے کالج ترقی کرے اور اس کے کام آگے بڑھیں۔ اور دوسری جانب کالج کے فارغ التحصیل طلباء کو سرکاری ملازمت حاصل کرنے میں سہولت اور آسانی ہو اور وہ حکومت کے معتمد علیہ بن سکیں۔

(۳) کالج میں علوم جدیدہ کے ساتھ دینیات اور اسلامی شعار اور روایات کی ایسی فضا پیدا کی جائے کہ علوم جدیدہ کے اثر سے مسلمان نوجوانوں کے مذہبی عقائد متزلزل نہ ہوں۔ اور

وہ کردار، اخلاق اور عمل کے اعتبار سے پکے سچے مسلمان رہیں۔

راہ کی مشکلات | لیکن سرسید کا کام آسان نہیں تھا۔ راہ میں سخت مشکلات اور دشواریاں حائل تھیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ۱۸۷۰ء میں انگلستان کے سفر سے واپس آنے کے دو ماہ بعد ہی انہوں نے مسلمانوں کے فکر و عمل کی اصلاح کی غرض سے تہذیب الاخلاق کے نام سے جو رسالہ جاری کیا تھا اس میں ان کے قلم سے ایسے متعدد مذہبی مضمون شائع ہو چکے تھے۔ جنہوں نے ان کے مذہبی افکار و عقائد سے متعلق مسلمانوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات اور غیظ و غضب کے جذبات پیدا کر دئے تھے۔ چنانچہ سرسید کی طرف سے کالج کی سکیم کا شائع ہونا تھا کہ ان کی مخالفت کا طوفان اُمنڈ پڑا۔ ان کی تذلیل و تنقیص میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا گیا اور عام طور پر کہا یہ گیا سرسید یہ کالج مسلمان نوجوانوں کو عیسائی بنانے کی غرض سے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ علماء سرسید سے کس درجہ بدگمان تھے؟۔ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ سے درخواست کی گئی کہ وہ مجوزہ مدرسہ میں دینیات کی تعلیم کا انتظام اپنی صوابدید سے کریں تو مولانا نے جواب دیا۔ "سرسید اس مدرسہ کے کاموں سے دست بردار ہو جائیں تب مذہبی تعلیم کا انتظام ہو سکتا ہے۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل از مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری باب پنجم میں ۲۱۶)

چندہ کی فراہمی | لیکن سرسید کو یقین تھا کہ ایک وہ قوم جو عرصۂ دراز سے جمود ذہنی اور اس کے باعث جہالت و عصبیت میں گرفتار ہو اس کی ---- اصلاح پھولوں کی سیج نہیں ہے' اس راہ میں قدم قدم پر ان کو عوائق و موانع سے سابقہ ہوگا۔ سرسید نے ان سب پر عبور پانے کا عزم بالجزم کر لیا تھا۔ چنانچہ مخالفتوں کے ان طوفانوں میں وہ مدرستہ العلوم کے لئے چندہ کرنے کے واسطے نکل کھڑے ہوئے۔ اور کالج کی لگن میں انہوں نے نہ اپنی صحت کا خیال کیا۔ نہ اچھے برے کا امتیاز برتا۔ نہ لوگوں کے سب و شتم اور ان کے طعن و تشنیع کی پروا

کی۔ جہاں کہیں جاتے دردِ دل کی کہانی اسی سوز و گداز سے سناتے کہ مخالفوں کے دل بھی نرم ہو جاتے تھے۔ کالج کے قیام کا ایک جنون تھا جو ان کے دل و دماغ پر مسلط تھا۔ اور جس نے ان کو پارہ صفت مضطرب و بے قرار بنا دیا تھا سفر کے درمیان لوگ ان کے اعزاز میں دعوتیں اور پارٹیاں کرنی چاہتے تھے تو دعوت کے بجائے اس کے خرچ کا روپیہ بھی چندہ میں وصول کر لیتے۔ شادی بیاہ کی تقریب میں دولہا کو جو روپیہ ملتا وہ مدرسہ فنڈ کے لیے ہتیا لیتے۔ حد یہ ہے اس کار خیر کے لئے انہوں نے ایک ناٹک بھی کر ڈالا اور آپ ہی خود سوانگ بھی بھرا نیکی کا کام بہرحال کار نیک ہے اس میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہیں۔ چنانچہ چندہ دینے والوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں اور عیسائیوں کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ بہرحال اسی طرح دن رات ایک اور اپنے آپ کو فنا کر کے ـــــ

بیس برس کی مدت میں سات آٹھ لاکھ (جو اب یقیناً ایک کروڑ سے کم نہیں) کی عمارت تیار ہو گئی اور کالج کی سالانہ آمدنی اسّی ہزار تک پہونچ گئی یہی وہ عمارت ہے جس کو دیکھ کر ایرانی سیاح نے کہا تھا: خدا کی قسم یہ تو معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ جو کام سلطنتوں سے نہیں ہو سکتا اسے تنہا ایک شخص نے کیسے کر دکھایا؟ (حیات جاوید ص ۱۷۵) لیکن یہ سب کچھ تو بعد میں ہوا۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو جب مولوی محمد کریم ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ کی صدارت میں اس مدرسہ کا افتتاح اور چھاؤنی کے پرانے بنگلوں میں ایک ماہ بعد ہی یعنی یکم جون کو مدرسہ میں باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا تو اس وقت کچھ بھی پاس نہ تھا۔ سرسید اس زمانے میں سرکاری ملازم تھے۔ پوری فضا تیرہ و تار تھی۔ اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ آج جس مدرسہ کا آغاز اس بے سروسامانی کے عالم میں ہو رہا ہے۔ کل وہ ایشیا کی ایک عظیم یونیورسٹی ہوگا۔

سرسید کی انتہا پسندی اور بے اعتدالیاں اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ سرسید کا یہ کارنامہ اس درجہ عظیم الشان، انقلاب آفریں، اور تاریخ ساز ہے کہ رہتی دنیا تک ان کا نام روشن رہے گا۔ اور تاریخ کے صفحات ان کی شخصیت کو فراموش نہیں کر سکیں گے

لیکن آج جب کہ ہم سو برس کی مسافت طے کر چکے ہیں اور اس مدت میں یہاں کیسے کیسے انقلابات آتے رہے اور یہ مدرسہ نشیب و فراز کی کیسی کیسی وادیوں سے گذرتا رہا۔ ایک ناقد مورخ کا فرض ہے کہ ان سو برسوں کا جائزہ لے کر یہ بتائے کہ مدرسہ نے اپنے اس طویل سفر میں کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے؟ کہاں اس سے کیا غلطی ہوئی ہے؟ اور کیوں! اس کے اسباب کیا تھے؟ آج ہندوستان کے مسلمان تاریخ کے جس موڑ پر کھڑے ہیں۔ فہم بصیرت اور عزم و ہمت کے ساتھ اس وقت تک آگے نہیں بڑھ سکتے جب تک وہ اپنے ماضی کا جائزہ اشخاص و افراد کی رُو رعایت کے بغیر، دیدہ وری کے ساتھ نہیں لیں گے۔ یہ بات بڑی افسوس ناک ہے کہ ملک کی تقسیم نے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے فنِ تاریخ نویسی کو بھی بہت نقصان پہونچایا ہے اور اس فن کے لئے جس معروضی (OBJECTIVE) نقطۂ نظر کی ضرورت ہے وہ مجروح ہو گیا ہے۔ چنانچہ تقسیم کے بعد سے اب تک سرسید کے عہد سے متعلق ہندوستان اور پاکستان میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس میں معروضی نقطۂ نظر کا فقدان صاف نظر آتا ہے۔ پاکستان کا مورخ سرسید کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ گویا وہ قومی نظریہ کے بانی مبانی وہی تھے۔ اور ان کے تمام کام ہندوؤں کے بالمقابل مسلمانوں کو اونچا کرنے کی غرض سے تھے۔ اس کے برعکس ہمارے ہندوستان کے مسلمان مورخ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سرسید ایک خالص ہندوستانی اور نیشنلسٹ تھے انہوں نے جو کچھ کیا۔ ہندوستانی قوم کے لئے کیا۔ اسلام اور مسلمانوں کے لئے سرسید کی جدوجہد یا برادرانِ وطن کی تنگ نظری سے مجبور ہو کر انہوں نے جو راہ اختیار کی اس کا تذکرہ زبان قلم پر لاتے ہوئے ان کو شرم آتی یا ڈر لگتا ہے۔ ان میں ایک ہندو دشمنی کا صید زبوں ہے اور دوسرا احساسِ کمتری کا شکار! یہ غیر معروضی طریقِ تاریخ نویسی نہ فن کے ساتھ انصاف ہے۔ نہ سرسید کے ساتھ اور نہ اپنے ملک اور قوم کے ساتھ!!

مولانا ابوالکلام آزادؒ

ایک جائزہ

از جناب محمد شعیب صاحب عمری بنگلور

امام الہند مولانا آزادؒ کے سانحۂ ارتحال پر چودہ سال گذر گئے، غور کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی کل یہ حادثہ پیش آیا ہو۔ وقت کی رفتار کا بھی عجیب حال ہے۔ چودہ سال ہوں یا چودہ دن، جب گذرنے پر آتے ہیں تو اس سرعت کے ساتھ گذر جاتے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کس طرح گذر گئے۔

بلاشبہ مولانا آزادؒ کی رحلت، تاریخ کا ایک ایسا عظیم واقعہ ہے کہ جس کے دردانگیز اثرات و نتائج امتداد زمانہ کے باوجود، آج بھی نہاں خانۂ قلب میں موجزن ہیں۔ لیکن رنج والم کے یہ تاثرات صرف اسی بنا پر نہیں ہیں کہ مولاناؒ نے انتقال فرمایا، بلکہ اس بنا پر ہیں کہ ان کی ذات گرامی میں مختلف علوم وفنون اور اوصاف وکمالات کی جو دولت سمٹ آگئی تھی۔ وہ بھی انہی کے ساتھ سپرد خاک ہوگئی اور دنیا اس انمول اور بے مثال خزانہ سے محروم رہ گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کیا عرض کروں، مولاناؒ کی یاد تازہ کیا ہوئی کہ میرے دل کی آرزومندیوں میں ایک تلاطم بپا ہوگیا اور جی بے اختیار چاہنے لگا کہ ان کے اوصاف وکمالات اور علوم وفنون کی جامعیت پر اپنے معلومات کو صفحہ ہائے قرطاس پر پھیلا دوں، مگر جب آمادۂ تحریر ہوا تو بڑی دشواری یہ پیش آئی کہ ایک طرف حقائق ومعارف اور مطالب ومفاہیم کی وسعت، مباحث کی گہرائیاں اور موضوع کی پیچیدگیاں، ایسی نکل آئیں، جو شرح واطناب کے بغیر قلم بند نہیں ہوسکتیں تو دوسری

ظرف، دائرۂ بیان کی تنگنائی اور الفاظ کی نا مساعدت اس درجہ شکیب آزما ثابت ہوئی کہ قدم قدم پر عنانِ قلم کھینچنی ہی پڑی۔

قلم را آں زباں نبود کہ سرِّ عشق گوید باز ؎ بروں از حدِّ تقریر ست شرحِ آرزومندی

اس عجیب صورتِ حال کے پیشِ نظر، میرے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ موضوع کی وسعت کو محدود کر کے، تعبیرِ بیان کے لئے انہی الفاظ کی وساطت اختیار کر دں۔ جو خود بخود سطحِ ذہن پر ابھر آئیں۔ چنانچہ میں نے اسی طریقۂ کار کو اختیار کیا۔

مولانا آزاد بحیثیت جامعیتِ علوم وفنون

مولانا آزادؒ، کرۂ ارضی کے ان اعاظمِ رجال واکابرِ علم وفضل میں سے ایک تھے۔ جن کی زندگی کو نیرنگ سازِ ازل نے رنگا رنگ علوم وفنون اور گوناگوں اوصاف وکمالات کے ایسے روشن اور تابناک جوہروں سے گوندھا تھا کہ جن کی شعاعیں ان کے ناصیۂ امامت پر سورج کی طرح چمک رہی تھیں۔

شرح اس اجمال کی یہ ہے کہ مولانا آزاد ایک ایسا خزینہ تھے۔ جس میں مختلف اور متضاد علوم وفنون کی پوری ایک دنیا سمٹ آگئی تھی۔ یعنی وہ بیک وقت، تحریر وتقریر کے شہنشاہ تھے۔ تو علم وحکمت کے سلطان بھی، بحرِ شریعت کے ماہر غواص تھے تو رموزِ حقیقت اور اسرارِ طریقت کے عارفِ کامل بھی۔ عدیم النظیر مفسرِ قرآن تھے تو بے مثال محدث بھی بلند پایہ مورخ تھے تو جلیل القدر سیرت نگار بھی۔ ادیبِ اریب تھے تو طبیبِ حاذق بھی، انشا پردازی کے امام تھے۔ تو سیاست کے سپہ سالار بھی، محیر العقول مفکر تھے۔ تو حیرت انگیز مدبر بھی، مایۂ ناز فلسفی تھے تو چوٹی کے منطقی بھی، تصنیف وتالیف کے بادشاہ تھے تو صحیفہ نگاری کے رہبرِ کامل بھی۔ غرض کہ علوم وفنون کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا، جس کو مولاناؒ کی تاجداری میں رہنے کا شرف حاصل نہ ہوا ہو۔ وَلَیسَ عَلَی اللّٰہِ بِمُستَنکَرٍ اَن یَّجمَعَ العَالَمَ فِی وَاحِدٍ

خود مولاناؒ نے بھی مبدءِ فیاض کے اس فیضانِ خاص کا اظہار فرمایا ہے۔

" مذہب، علوم وفنون، ادب، انشا وشاعری۔ کوئی وادی ایسی نہیں جس کی

بے شمار نئی راہیں مبداءِ فیاض نے مجھ نامراد کے دل و دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن و ہر لحظہ بخششوں سے مالا مال نہ ہوا ہو۔ بلکہ یک بہ یک دفعۃً اپنے آپ کو عالم معانی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر مقام کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں" (نقش آزاد صفحہ ۱۵۷)

بلاشبہ مذکورہ حیرت انگیز کمالات اور جملہ علوم و فنون میں ہمہ گیری، محض کار فرمائے غیب ہی کی بخشش خاص تھی، جس سے آپ نوازے گئے چنانچہ مولانا نے بطور تحدیثِ نعمت اعتراف فرمایا۔

"جو کچھ پایا ہے، صرف بارگاہِ عشق سے پایا ہے، جتنی رہنمائیاں ملیں صرف اسی مرشدِ فیض و ہادیٔ طریق سے ملیں، علم کا دروازہ اسی نے کھولا عمل کی حقیقت اسی نے بتلائی معرفت کے صحیفے اسی کی زبان پر تھے۔

حقیقت کے خزانے اس کے دستِ کرم میں تھے، شریعت کے حقائق کا وہی معلم تھا، طریقت کے نشیب و فراز میں وہی رہبر تھا، قرآن کے بھید اسی نے بتلائے۔ سنت کے اسرار اسی نے کھولے۔ نظر اس نے دی۔ دل اس نے بخشا، کون سی مشکل تھی جو اس کی ایک سلجھی ہوئی نظر سے سلجھ نہ گیا، اور یہ جو کچھ کہا گیا تو یہ نہ سمجھا جائے کہ اپنے عیبوں کو بھی ہنر بنا کر دکھلانا مقصود ہے جس عالم میں ہنر کو بھی ہنر سمجھنا معصیت ہو، وہاں عیب کو حسن بنانے کا وہم بھی گذرے تو کفر سمجھا جائے۔ مقصود تو صرف یہ تھا کہ

وَكَمْ لِلّٰهِ مِنْ لُطْفٍ خَفِيٍّ ۔۔۔ يَدِقُّ خَفَاهُ عَنْ فَهْمِ الذَّكِيِّ (تذکرہ)

درحقیقت مولانا آزادؒ، اپنے بے پناہ علم و فضل اور اوصاف و کمالات کے تنوع کے اعتبار سے مافوق الفطرت انسان تھے، قدرت نے انہیں جو اوصاف بخشے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں وصف ان کا اجتہادِ فکر و نظر تھا، چنانچہ علم و فن کی ہر وادی میں اُن کے مجتہدانہ تخیل نے جدت و ندرت کی جو گل کاریاں کی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ تقریر و

یہ تھی کہ مجلسی گفتگو کے میدان میں بھی انہوں نے بلحاظِ انداز و اسلوبِ بیان، الفاظ و تراکیب
کے استعمال، مطالب و ادائے مطالب، ترتیب دلائل و مواد، اور اندازِ استدلال و اخذِ
نتائج، اپنی شاہراہ آپ بنائی، لیکن کبھی انہوں نے کسی پیش رو کی تقلید کی اور نہ متابعت

لانا آزاد کی مجلسی گفتگو | جن خوش قسمت افراد کو مولانا سے قرب حاصل تھا، وہ اس امر
سے بخوبی واقف ہیں کہ اُن کی زندگی، بالعموم سیاسی میدانوں کے حوادث سے گھری رہتی تھی۔
شاید ہی کوئی دن ان پر ایسا گذرا ہو، جس میں وہ سیاسی زندگی کے بے کیف اشغال سے
بے تعلق رہے ہوں، لیکن بسا اوقات ایسے مواقع بھی پیش آتے کہ عین اس عالم میں جب کہ
ان کے قیمتی لمحات، سیاسی گتھیوں کے سلجھانے میں گذر رہے ہوتے۔ ان کا کوئی ہم ذوق و
ہم نفس اچانک آپہونچتا، تو ان کی بے کیف طبیعت کا رنگ، نہایت حیرت انگیز طریقہ سے
بدل جاتا اور چہرہ گلاب کی طرح شاداب ہو جاتا جیسے ان کے کیف و ذوق میں راحت و سرور
کی ایک نئی لذت سما گئی ہو، شرکاءِ مجلس صاف طور پر محسوس کرتے کہ مولانا گرد و پیش کے تمام
خیالات سے کنارہ کش ہو کر، عالمِ باغ و بہار میں جلوہ افروز ہو چکے ہیں۔ اس وقت وہ اپنے
ہم ذوق کی طرف، ہمہ تن متوجہ ہو کر کوئی موضوع چھیڑ دیتے تو محسوس ہوتا، چمنستانِ ہزار رنگ
کھل گیا ہے، جب مسلسل بولنے لگتے تو حقائق و معارف کے رنگا رنگ پھول جھڑنے لگتے۔
ادب و انشا اور شعر و سخن کے مباحث نکل آتے تو معلوم ہوتا، گہر افشانی فرما رہے ہیں۔
قرآن حکیم اور حدیث کے معارف و حِکم بیان کرتے لگتے تو محسوس ہوتا گویا قیمت و جواہر کی بارش
ہو رہی ہے اس وقت مولانا کی گفتگو کا شیریں طرز، افہام و تفہیم کا دلنشیں انداز اور
ان کے نگاہوں کی پُر اثر کیفیت، مشاہدہ کی خاص چیز ہوتی، دیکھنے اور سننے والے تعلیم یافتہ
ہوں یا غیر تعلیم یافتہ مسحور و بے خود ہو کر رہ جاتے تو ساتھ ہی اپنی روح کے ایک ایک گوشہ میں
ان حیاتِ تازہ کی لہر کو دوڑتے ہوئے بھی پاتے۔ اس طرح چند گھنٹوں تک، اُن کے انوار و
تجلیاتِ علوم سے بزمِ سخن منور رہتی اور جب اختتام پر پہنچتی تو ہر شخص مولانا مسعود عالم ندوی

مرحوم کی طرح، یہ تاثر لے کر اٹھتا کہ:-

"ابوالکلام ایک مجتہد النظر عالم، ایک نکتہ شناس ادیب، بلند آہنگ خطیب اور بے مثال انشاء پرداز ہیں، ان کی مجلسی گفتگو تقریروں سے زیادہ موثر اور سادہ و سلیس انشاء الہلال کے خطبیات مقالات سے زیادہ دل نشین ہوتی ہے۔ ان کے ادبی نکتے، دوسروں کی تصنیفوں پر بھاری اور اچھوں اچھوں کی سرمایۂ ناز تحقیقات ان کے علمی چٹکلوں کے سامنے گرد ہیں۔[1]

اس خصوص میں مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کی شہادت ملاحظہ فرمایئے علوم و فنون میں مولانا آزادؔ کی ہمہ گیری کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"خدا معلوم کتنے مختلف علوم اور متعدد فنون کے خزانے دماغ میں جمع ہو گئے تھے۔ اور ہر وقت مستحضر، طب ہو کہ الہیات، فقہ ہو یا کلام، شعر و ادب ہو یا موسیقی، تاریخ ہو کہ سیاست، جس فن سے متعلق جو بھی موضوع ہو بس گفتگو چھیڑنے کی دیر تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سامنے کوئی معمولی واقف کار ہی نہیں ماہر فن تقریر کر رہا ہے اور تقریر بھی ایسی دل آویز و مربوط کہ فصاحت و بلاغت بلائیں لیتی جا رہی ہے۔ غضب کا حافظہ تھا اور غضب کی خوش دماغی"

(چند یادیں۔ صدق جدید مورخہ ۱۴ر مارچ ۱۹۵۸ء)

مولاناؒ کی خطابت مولاناؒ کی خطابت بھی نہ صرف جلوۂ صد رنگ ہوتی تھی بلکہ صفات جلال و جمال کے حسین مظاہر کا ایک دل کش مجموعہ ہوتی تھی۔ وہ تقریروں سے بالعموم گریز کرتے تھے، اور یہ ان کی طبیعت کی خاص بات تھی۔ انہیں تقریر کے لئے آمادہ کرنا بڑا مشکل کام ہوتا تھا، لیکن جب وہ آمادہ ہو جاتے اور ان کی روح پرور تقریر کا اعلان کر دیا جاتا تو اس کی جاذبیت و کشش کا یہ عالم ہوتا کہ جس طرح پروانے روشنی کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح ہزارہا انسانوں کے دل اطراف و جوانب ملک سے بے اختیار کھنچے چلے آتے تھے۔

مولانا تقریر شروع کرتے اور اثناء تقریر میں جب ان پر جلالی رنگ غالب ہوتا تو جیتی تصویر

[1] مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم "ابوالکلام" مطبوعہ ندیم ۱۹۴۲ء

کے سامنے ایسا سماں طاری ہوتا جیسے جلالِ ربانی کے شعلے ان کی نگاہوں سے نکل رہے ہیں، سمندروں میں طوفان بپا ہے، بارش اور ابر و باد ہنگامہ آرا ہیں، بادل گرج رہے ہیں، اور بجلیاں کڑک رہی ہیں، لیکن جوں ہی ان کی خطابت، جمال زیبائی اور حسن و دل آویزی کے ایک نئے پیکر میں نمایاں ہونے لگتی تو ایسا منظر طاری ہوتا جیسے نور الہٰی کی کرنیں، اُن کی نگاہ سے چھن چھن کر نکل رہی ہیں، صبحِ تجلی نمودار ہو کر ہر آنکھ کو بینا بنا رہی ہے سورج اپنی تمام بوقلمونیوں کے ساتھ طلوع ہو کر دنیا کے گوشے گوشے کو زیور طلائی پہنا رہا ہے، پہاڑ اپنی بلندی و عظمت کے ساتھ وقار اور استقامت کے پیکر بنے ہوئے ہیں، زمین کا گوشہ گوشہ، روئیدگی و سرسبزی سے مالا مال ہو کر نزہت و سرور بخش رہا ہے، شاخیں وجد میں آ آ کر جھوم رہی ہیں، کلیاں مسکرا رہی ہیں تو پھول اپنی رنگین اداؤں کے ساتھ جھک رہے ہیں آب رواں ترنم ریز ہے تو طیور نغمہ سنج ہیں۔ بہ الفاظِ مختصر مولاناؒ کی خطابت مظاہر جلال و جمال کا ایسا حسین مرقع ہوتی جس کا ہر منظر دیدۂ بصیرت کے لئے بہشت زار جمال ہوتا جس کا ہر نغمہ گوش حق نیوش کے لئے ملکوتی ترانہ ہوتا اور جس کی ہر بُو فردوس کی ہواؤں کی طرح عطر بیز ہوتی۔ سامعین جب مجلسِ تقریر سے اٹھتے تو نہ صرف لذتِ سماع کی محویت سے بے خود ہو کر اٹھتے بلکہ لذتِ مشاہدہ اور لذتِ عمل کے حصول کا بے تاب ولولہ بھی لے کر اٹھتے، نیز زبانِ حال سے پکار اٹھتے:

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر   محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر

مولاناؒ کی یہ عظیم الشان تقریریں، اُس روشن دور کی ہیں، جب کہ ان کی شوکت و عظمت کا آفتاب آسمانِ قبول پر درخشاں تھا۔ یہ دور وہ تھا جب کہ فتنۂ معاصرت خوابیدہ تھا۔ عیارانِ سیاست حکومتِ انگریزیہ کے آلۂ کار نہ بنے تھے اور حکومتِ وقت کے ایوان دکھل میں زلزلہ برپا ہوا تھا، لیکن حکومت نے مولاناؒ کے عظیم المرتبت وجود کو خطرہ محسوس کرنے کے باوجود اپنی شاطرانہ چالوں کا آغاز نہ کیا تھا اور حریفانِ سیاست نے بھی

ان کی ذات گرامی پر طرح طرح کی تہمتیں اور نوع بنوع کے الزامات عائد کر کے مسلمان عوام کے جذبات کو ان کے خلاف مشتعل نہ کیا تھا۔ نیز ان کی امامت وخطابت عیدین کے مقاطعہ کا تصور بھی مخالفین و حاسدین کے ذہن میں پیدا نہ ہوا تھا۔ اس مقام پر رشتہ سخن دراز ہے، لیکن جو باتیں عرض کی گئی ہیں وہ از قبیل اشارات ہیں۔ ارادہ ہے کہ انشاءاللہ تاریخ ہند کے ان المناک واقعات کی توضیح و تفصیل کے لئے لمحات فرصت نصیب ہوں تو ایک مستقل مضمون حوالۂ قلم کروں۔

مولاناؒ کی نگارشات | مولاناؒ کی تحریروں میں بحیثیت جامعیت وہمہ گیری، معنی خیزی، سحر آفرینی اور اثر انگیزی وہ تمام محاسن بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ جو ان کی مجلسی گفتگو اور تقریروں میں جلوہ افروز تھے۔

دیدہ وران علم وادب اس امر سے بخوبی واقف ہیں۔ کہ مولاناؒ کی تحریریں۔ علم کی گہرائیوں کے ساتھ ادب وانشاء کی گلکاریوں، علمی لالہ کاریوں اور زبان و بیان کی لطافتوں کا ایک ایسا حیرت انگیز مجموعہ ہوتی ہیں کہ ان میں بحیثیت اوصاف وخصائص، فرق و امتیاز قائم کرنا کہ فلاں تحریر فلاں تحریر پر فوقیت رکھتی ہے۔ ایک نہایت کٹھن کام ہے۔ لیکن میں نے اس تعلق سے جس حد تک غور کیا یہی محسوس کیا کہ ان کی ہر نگارش اپنے مرکزی مقاصد کے اعتبار سے جن مخصوص اوصاف کی مقتضی ہوتی تھی ان سے متصف ہو کر ان تمام اوصاف وکمالات کو بھی اپنے وسیع دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ جو ان کی دیگر تحریروں میں بالعموم پائے جاتے ہیں۔ البتہ مولاناؒ نے اپنی نگارشات اور تصانیف میں جن اوصاف وخصائص کو اجاگر کیا ہے۔ ان کا تفحص واستقرا ممکن ہے۔ چنانچہ میں نے ان نگارشات اور تصانیف پر اس غرض سے غائرانہ نظر ڈالی تو درج ذیل اوصاف ومحاسن نظر افروز ہوئے۔

اوصاف وخصائص تحریر | (۱) ہر فن اپنا خاص رنگ رکھتا ہے اور وہ رنگ اسی وقت نمایاں طور پر ابھر سکتا ہے۔ جب کہ اُس کا ایک ایسا خاص اسلوب ہو۔ جو اس کو دیگر فنون

کے رنگ ڈھنگ سے متاثر کردے۔ چنانچہ مولانا کے ذوقِ سلیم نے علوم و فنون کے اس فطری تقاضے کو محسوس کیا۔ اور ان کے مجتہدانہ ذہن نے علم و فن کے تنوع کے اعتبار سے کئی ایسے اسلوبِ نگارش تخلیق کئے، جو آپس میں ایک دوسرے سے مختلف تھے یعنی جو فن جس اسلوبِ خاص کا متقاضی تھا۔ مولانا نے وہی اسلوب اس کو عطا کر دیا۔ لیکن انہوں نے ہر نگارش کے لئے ایک ہی قسم کا اسلوب جیسا کہ تمام اہلِ قلم کا وتیرہ ہے۔ کبھی اختیار نہ کیا۔

(۲) ایک عجیب مگر لطیف خوبی جو مولانا کے ہر اسلوب میں غیر محسوس طور پر جلوہ افروز رہتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کا ہر اسلوب مجرد اسلوب نہیں ہوتا بلکہ اس میں دلیل بھی مضمر رہا کرتی ہے یعنی وہ ہر فن کے تقاضے کے مطابق جو اسلوب اختیار کرتے تھے اس کی دل نشینی و اثر آفرینی اس غضب کی ہوتی تھی کہ اسی سے استدلال کی روشنی نمودار ہوجاتی اور مخاطب کے ذہن کو بے اختیار دلیل کی طرف مائل کر کے اس طرح مطمئن کر دیتی کہ اس کو صحیح تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہ ہوتا۔

بلاشبہ مذکورہ حیرت انگیز خوبی قرآن حکیم کی ہے۔ مولانا نے اس کو قرآن حکیم ہی سے اخذ کیا ہے اور یہ بات عرض کی جائے تو اس کو کسی طرح مبالغہ آمیز نہ سمجھا جائے گا کہ ان کی شخصیت کی تکوین و تکمیل اور تزئین و آرائش میں قرآن حکیم ہی کی روح کارفرما رہی۔ انہوں نے اپنی تمام خداداد صلاحیتوں اور دل کے کامل اخلاص کے ساتھ قرآن حکیم کا اس طرح عمیق اور وسیع مطالعہ کیا کہ اس کی روح ان کے قلب و دماغ کے ایک ایک ریشہ میں جذب ہو گئی۔ چنانچہ انہوں نے قرآن حکیم کے ایک ایک لفظ پر جس انہماک و توجہِ خاص کے ساتھ شب و روز غور و فکر کیا ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے۔ اس کی ایک ایک سورت ایک ایک مقام۔ ایک ایک آیت ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں

قطع کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کئے ہیں. تفاسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے. میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گذر چکا ہے اور علوم قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے حتی الوسیع ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو"

(ترجمان القرآن جلد اول صفحہ ۱۹ مطبوعہ زمزم کمپنی لاہور)

مولانا کی اس مخلصانہ سعی وعمل کا ثمرہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر قرآن حکیم کے بیشمار معارف وحکم اور اَن گنت اوصاف و کمالات کے دروازے کھول دیئے اور ان کے قلب و نظر کو اس کی روشنی سے منور کر دیا. چنانچہ فرماتے ہیں:-

"فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کا مخصوص احسان اس عاجز پر یہی ہے کہ اس نے تفسیر بالرائے کی آلودگی سے پاک رکھ کر حقائق قرآنیہ کو منکشف کر دیا.

وذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم"

(البلاغ نمبر ۲ صفحہ ۱۲)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:-

"اگر تم کہو کہ ... حقائق و معارف (قرآن) کی طرف رہنمائی ایک فعل مخصوص ہے جس کے انکشاف کے لئے خدا تعالیٰ نے اس عاجز درماندہ قلب کو چن لیا تو یہ فی الحقیقت سچ ہے

وَیَالَیْتَ قَوْمِی یَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِی رَبِّی وَجَعَلَنِی مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ" (البلاغ نمبر ۲)

حاصل کلام یہ کہ مولانا کا مزاج چونکہ قرآنی ادب و بلاغت کے سانچے میں ڈھلا تھا اس لئے ان کے حقیقت نگار قلم نے اردو ادب کے دامن کو قرآنی حقائق و معارف کے پھولوں سے بھر دیا اور اُس کے پُر شوکت باعظمت اور دل آویز اسلوب اور لب و لہجہ کو علم و ادب کی تمام قسموں میں منتقل کر دیا.

ایں سعادت بزور بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ

(۳) مولاناؒ کی تحریریں متعدد پیراگرافوں سے اس طرح مرکب ہوتی ہیں کہ ہر پیراگراف اپنے سابق ولاحق پیراگرافوں سے مربوط ہوکر مرتب مضمون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ اکثر پیراگراف اپنا مستقل وجود رکھتے ہیں، یعنی ان کو نفسِ مضمون سے علٰحدہ کر دیجئے تو وہ اپنے مفہوم کی توضیح میں محتاجِ ماقبل و مابعد نہیں ہوتے۔

(۴) مولانا آزاد کے طرزِ نگارش کی ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ایسے بلند پایہ حکیمانہ جملے بکثرت جلوہ آرا رہتے ہیں، جو بحیثیت معنی خیزی، اثر انگیزی اور سبق آموزی اپنا مستقل وجود رکھتے ہیں اگر ان روشن اور تابناک جواہر پاروں کو اخذ کر کے مختلف عنوانوں کے تحت مرتب کیا جائے تو اس کام کے لئے کئی دفتر مطلوب ہوں گے۔ لیکن یہ خدمت بے انتہا مفید ثابت ہو گی۔ الحمد للہ راقم الحروف نے اس کام کا آغاز کر دیا ہے۔

(۵) مولانا کی تحریروں میں ایک حیرت انگیز خوبی یہ ہے کہ ان کے اکثر پیراگراف اور جملے اس درجہ جامع ومانع اور وجیز ہوتے ہیں کہ ان کے مفہوم کو صفحۂ قرطاس پر پھیلا دیجئے تو ان کا ایجاز اطناب سے بدل کر مستقل مضمون کی شکل اختیار کر لے گا۔ چنانچہ مولاناؒ نے اس حقیقت پر ایک دوسرے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔

"مباحث ومعارف کا ایک پورا دفتر دماغ میں پھیل رہا تھا مگر نوک قلم پر پہنچا تو ایک سطر یا ایک جملہ بن کر رہ گیا

اب کتاب کے صفحے پر وہ ایک جملہ ہی رہے گا، لیکن اہل نظر چاہیں تو اپنے ذہن وفکر میں پھر اسے ایک دفتر کی صورت میں پھیلا دے سکتے ہیں"

(ترجمان القرآن دوم)

کہا جاتا ہے کہ مولانا آزادؒ۔ ایجاز کے نہیں۔ اطناب کے بادشاہ تھے، لیکن مولاناؒ کے زرنگار قلم نے ایجاز نگاری میں بھی محیر العقول کمالات کو اجاگر کر کے ثابت کر دیا ہے

کہ وہ بلاشک ورہب ایجاز کے بھی بادشاہ ہیں۔ یہاں ضرورت مثالوں کی ہے لیکن چونکہ مثالیں تفصیل وتوضیح کی طالب ہیں۔ اس لئے اختصار کے پیش نظر قارئین کی توجہ کو ترجمان القرآن کی طرف مبذول کرانا مناسب سمجھتا ہوں۔ بلاشبہ ترجمان القرآن، ایجاز نگاری کی سب سے زیادہ روشن اور تابناک مثال ہے۔ اس کے مطالعہ سے آپ پر یہ حقیقت نہایت جمال وزیبائی کے ساتھ بے نقاب ہوگی کہ اس کے ایک ایک صفحہ، ایک ایک جملہ اور ایک ایک سطر میں ایجاز کا رنگ بحدِ کمال جلوہ آرا ہے۔ چنانچہ خود مولانا آزادؔ تفسیری نوٹ کے تعلق سے رقمطراز ہیں

"یہ نوٹ عبارت میں مطول نہیں ہو سکتے تھے اور مطول نہیں ہیں، لیکن معانی واشارات میں مفصل ہو سکتے تھے اور پوری طرح مفصل ہیں اور اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی سطر تفسیر کا ایک پورا صفحہ بلکہ بعض حالتوں میں ایک پورے مقالہ کی قائم مقام ہے"۔ (ترجمان القرآن جلد دوم)

درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ مزید روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"یہ (نوٹ) قدم قدم پر مطالب کی تفسیر کرتے ہیں۔ اجمال کو تفصیل کا رنگ دیتے ہیں۔ مقاصد ووجوہ سے پردے اٹھاتے ہیں۔ دلائل وشواہد کو روشنی میں لاتے ہیں۔ احکام ونواہی کو مرتب ومنضبط کرتے ہیں۔ اور زیادہ سے زیادہ مختصر لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی ومعارف کا سرمایہ فراہم کرتے جاتے ہیں۔

(ترجمان القرآن جلد دوم)

نیز طریق بیان کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ایسا طریقِ بیان اختیار کیا گیا کہ لفظ کم سے کم ہیں لیکن اشارات زیادہ سے زیادہ سمیٹ لیے گئے ہیں۔ جس چیز کی لوگ کمی پائیں گے وہ صرف مطالب کا پھیلاؤ ہے، نفسِ مطلب میں کوئی کمی محسوس نہ ہوگی ان کے ہر لفظ اور جملہ پر جس قدر غور کیا جائے گا مطالب ومباحث کے نئے نئے دفتر کھلتے

جائیں گے۔ (ترجمان القرآن جلد اوّل)

(۶) مولانا آزادؒ کے گنجینۂ دماغ میں اردو، عربی اور فارسی کے حسین، شان دار اور پرشکوہ الفاظ کے کتنے ذخائر موجود تھے۔ اس کا علم کسی کو نہیں حتیٰ کہ خود انہیں بھی نہیں تھا۔ لیکن جوں ہی ان کا اشہب قلم برق رفتاری کرنے لگتا، اور مطالب و معانی کے اظہار کے لیے الفاظ کی ضرورت ہوتی تو وہ اپنے حافظہ سے جس میں اعلیٰ درجہ کی تنظیم و ترتیب کے ساتھ الفاظ ہمیشہ صف آرار ہتے تھے۔ مناسب اور موزوں لفظ نکال لیتے اور اس کو عبارت میں اس کی مناسب جگہ پہاڑ کی سی مضبوطی کے ساتھ جما دیتے تھے۔ الفاظ کی اس نشست کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ہر لفظ اپنے سابق و لاحق لفظ سے اس قدر مربوط ہو جاتا کہ ان میں تغیر و تبدل کی گنجائش رہتی اور نہ حذف و اضافہ کا امکان۔

(۷) مولاناؒ کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کی ترکیبیں سُبک اور بے وقار نہیں ہوتیں، بلکہ اس قدر دل آویز، دل فریب، حسین اور شگفتہ ہوتی ہیں کہ نکتہ شناسان علم و ادب اور دیدہ ورانِ حسن و جمال جھُوم جھوم اٹھتے ہیں۔ ان نادر اور بدیع ترکیبوں میں ایسا ترنُم، حسُن اور اثر جلوہ افروز رہتا ہے کہ پڑھنے اور سننے والوں پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

(۸) قدرت نے مولانا کو جن خصائص سے نوازا تھا۔ ان میں ان کے حافظہ کی دولت سب سے بڑی نعمت تھی۔ پورا قرآن مجید ان کے حافظہ میں ہر موضوع اور ہر عنوان کے تحت بالترتیب ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ جب وہ دینی یا مذہبی مضمون لکھنا شروع کرتے تو ہر موقعہ اور محل کی مناسب آیتیں ان کے بے مثال حافظہ سے بالترتیب اُبھر آتیں اور ان کے حقیقت نگار قلم کی نوک پر آکر اس عمدگی و نفاست کے ساتھ پیوستِ عبارت ہو جاتیں کہ گویا عبارت اپنے ظاہری و باطنی مقتضیات کی تکمیل کے لیے ان آیاتِ کریمہ کی محتاج تھی۔ اس طرح پورا مضمون قرآنی جواہرات سے مُرصّع ہو کر مینارۂ ہدایت بن جاتا، پڑھنے والے اس کے اعجاز اور اثر سے اس قدر متاثر

ہوتے کہ انہیں محسوس ہوتا کہ ان کے دل ودماغ کے بند دروازے کھل گئے ہیں اور ان میں قرآن حکیم کے علوم ومعارف کی روشن شمعیں جگمگا اٹھی ہیں۔

(۹) مولانا آزادؔ جب نثر میں شاعری کرنے لگتے اور ان کا جواہر نگار قلم منو ترقاس پر دوڑنے لگتا تو معلوم ہوتا، نہایت بے ساختگی کے عالم میں۔ الفاظ فصاحت و بلاغت کے سانچے میں ڈھلتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن جونہی معانی ومطالب کی مناسبتیں ابھرنے لگتیں تو وہ اپنے عجائب خانۂ ذہن سے جس میں قدیم اساتذۂ فن کے، ہر نوع اور ہر قسم کے بلند پایہ اشعار کا ذخیرہ ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ موقع اور محل کی کامل مناسبت سے جس شعر کی ضرورت ہوتی، فوراً نکال لیتے اور اس کو نثر سے اس طرح مخلوط ومربوط کر دیتے۔ جس طرح بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں پرو دیا جاتا ہے۔ اس ترکیبی عمل کا قدرتی اثر یہ ہوتا کہ وہ شعر نثر کے مطالب سے جڑ کر نفس مطلب کا ایک لازمی جزء بن جاتا اور عبارت بھی ایک جمالِ تازہ کے ساتھ حسن ورعنائی کا جلوہ گاہ بن جاتی۔ فی الحقیقت نظم ونثر کا ایسا حیرت انگیز ور دل آویز ارتباط واختلاط، مولانا آزادؔ کی تحریر کی ایسی خوبی ہے جس میں ان کا سہیم و شریک کوئی نہیں۔

(۱۰) مولانا کی تحریریں۔ ادب وانشاء کے محاسن سے اس طرح مرصع اور مزین ہوتی ہیں۔ جیسے معلوم ہوتا فصاحت وبلاغت کی طلائی دلفریب جدولیں، نہایت حسین و لطیف سزا بی کیفیت کے ساتھ بل کھا کھا کر دوڑ رہی ہیں تو استعارات کی نیرنگی و دل ربائی، تمثیلات کی خوبروئی و دل آویزی تشبیہات کی رعنائی و زیبائی کا روح پرور جلوہ بھی اس کے ظہور میں نظر افروز ہے۔

(۱۱) مولانا کی تحریریں صوری ومعنوی محاسن کا جمال افروز مرقع ہوتی ہیں۔ یعنی الفاظ پرشکوہ اور ان کی جگمگاہٹ، فقروں کی چمک دمک اور سجع ومقفی کے ساتھ، معانی ومطالب رعلوم ومعارف کی اس قدر فراوانی ہوتی ہے، جیسے زمین کی تہہ میں آب شیریں کی

سوتیں بہہ رہی ہیں تو اس کی سطح لہلہاتے ہوئے کھیتوں، طرح طرح کے پھلوں اور رنگا رنگ پھولوں سے لدی ہوئی ہے۔ بعض حضرات مولانا کے طرزِ تحریر پر، اُدق، مغلق اور پُرتکلف انشاء پردازی کا طعن توڑتے ہیں لیکن خطابت اور انشاء پردازی کے اداشناس اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ الفاظ اور تراکیب کے سہل و مغلق اور فصیح و غیر فصیح ہونے کا مسئلہ اس قدر اہم نہیں ہے جس قدر نہایت سلیقہ اور عمدگی سے مناسب اور اور موزوں مقام پر ان کا استعمال کرنا ہے، یعنی ادق سے ادق تراکیب اور مشکل سے مشکل الفاظ بھی نہایت حُسنِ تناسب کے ساتھ برمحل مستعمل ہوں تو وہ صحیفۂ ادب بن جاتے ہیں اور اداءِ مطالب میں کوئی پیچ و خم نہ ہو تو عبارت میں حیاتِ تازہ کی روح دوڑنے لگتی ہے چنانچہ مولانا کی تمام تحریروں کا یہی حال ہے، مطالعہ کیجئے گا تو آپ پر مذکورہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکارا ہو گی اور آپ محسوس کریں گے کہ مشکل سے مشکل الفاظ اور ادق سے ادق ترکیبیں بھی ان کے خداداد کمال اور وہبی ذوق کی بدولت اس طرح شگفتہ ہو گئی ہیں کہ تحریر کے ہر لفظ میں فصاحت و بلاغت کی روح اپنی مؤثر قوت کے ساتھ بولنے لگی ہے نیز پیرایۂ بیان کی معنویت جس قدر ہمہ گیر ہے۔ اسی قدر الفاظ نے بھی ترجمانی کا مکمل حق ادا کر دیا ہے۔ یعنی معانی کے نمود کے لئے الفاظ کا مناسب، موزوں اور برمحل استعمال اس حُسن و دل آویزی سے کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ مولانا نے ایک طرف الفاظ میں معانی و مطالب کے فانوس روشن کر دئے ہیں تو دوسری طرف فقروں میں جذب و کشش سے بھرپور دل کے ٹکڑے پھیلا دیئے ہیں۔ اس خصوص میں صاحب طرز ادیب مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی۔ الہلال کے خصائص و کمالات کا ذکر کرتے ہوئے الفاظ و تراکیب کی جدت و ندرت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"خدا جانے کتنے نئے اور بھاری بھرکم لغات اور نئی ترکیبیں نئی تشبیہیں

نئے استعارات اور نئے اسلوب بیان، ہر جتنے ابن ادبی و علمی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر باہر نکلنے لگے اور جاذبیت کا یہ عالم کہ نکلتے ہی سکۂ رائج الوقت بن گئے۔ حالی و شبلی کی سلاست وسادگی سوچتی رہی اور اکبر الہ آبادی اور عبدالحق موجودہ بابائے اُردو اسب اُٹھا ہا تھ کرتے رہ گئے"۔ (چند یادیں، صدق جدید ۱۴ر مارچ ۱۹۵۹ء)

(۱۳) مولانا آزادؒ کے طرزِ نگارش کا ایک کمال یہ ہے کہ موضوع اگر سہل اندازِ بیان کا متقاضی ہو تو وہ نہایت سلیس، زود فہم، معنی خیز، حقیقت فزا اور دل آویز زبان اختیار کرتے ہیں۔ لیکن وہ اس اندازِ بیان میں بھی ایک مسیحا نفس کی طرح زندگی پیدا کرتے ہیں۔ فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے ہیں تو علوم و معارف کے رنگارنگ پھول صفحہ ہائے قرطاس پر بکھرنے لگتے ہیں۔ نیز ایک عجیب دل کش اور اثر آفریں طرز سے معانی و مطالب کو ٹھوس اور مستحکم دلائل و براہین کی روشنی میں اس طرح منضبط کرتے ہیں کہ پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہیں علم و حکمت کے موتی چن رہی ہیں۔ اس سلیس طرزِ نگارش کی سب سے زیادہ روشن مثال ان کی عدیم النظیر تفسیر "ترجمان القرآن" ہے، چنانچہ خود مولاناؒ نے ترجمہ کے سہل اور عام فہم ہونے کے تعلق سے فرمایا۔

"یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ ترجمان القرآن کے نوٹ تشریح و وضاحت کا مزید درجہ ہیں، ورنہ قرآن کا صاف صاف مطلب سمجھ لینے کے لئے متن کا ترجمہ پوری طرح کفایت کرتا ہے میں نے تجربہ کے لیے سورۂ بقرہ کا مجرد ترجمہ ایک چودہ پندرہ برس کے لڑکے کو دیا جو اردو کی آسان کتابیں روانی کے ساتھ پڑھ لیتا ہے۔ پھر ہر موقع پر سوالات کر کے جانچا۔ جہاں تک مطلب سمجھ لینے کا تعلق ہے وہ ایک مقام پر بھی نہ اٹکا اور تمام سوالوں کا جواب دیا گیا پھر ایک دوسرے شخص پر تجربہ کیا، جس نے بڑی عمر میں لکھنا پڑھنا سیکھا ہے

اور ابھی اس کی استعداد اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اُردو کے تعلیمی رسائل پڑھ لیتا ہے۔ یہ تین جگہ فارسی لفظوں پر اڑکا۔ لیکن مطلب سمجھنے میں اسے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی، میں نے وہ الفاظ بدل کر نسبتاً زیادہ سہل الفاظ رکھ دیئے " (ترجمان القرآن جلد اوّل)

(۱۲) عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ معقولات، فلسفہ اور اجتماع ایسے خشک موضوع ہیں کہ جن کی نگارشس میں زبان و بیان کی شگفتگی، رنگینی، دل کشی اور لطافت و حلاوت کا جلوہ گر ہونا ایک امر مستبعد ہے۔ لیکن مولاناؒ کے معجز نگار قلم نے نہایت مؤثر فصاحت اور طرز نو و اسلوب جدید اختیار کر کے اس خشک وادی کو بھی گلستانِ ہزار رنگ میں تبدیل کر دیا ہے، چنانچہ مولاناؒ کی فلسفیانہ تحریروں پر نظر ڈالئے۔ آپ محسوس کریں گے کہ ان میں پیچ و خم ہے اور نہ الجھاؤ بلکہ ان کا ایک ایک فقرہ ایک ایک جملہ اور ایک ایک لفظ ایسا صاف روشن اور دل نشین ہے جیسے معانی کا نگینہ ہے جو انگوٹھی میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ جڑ دیا گیا ہے۔ مولانا آزادؒ اس نوع کی نگارشس کو اللہ تعالیٰ کا فضل قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ الہلال مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۱۲ء میں ایک نئے باب کا بعنوان "فلسفہ" افتتاح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

340911

" اس باب کی خصوصیت یہ ہوگی کہ اس کے تحت جس قدر مضامین شائع ہوں گے۔ انہیں ہر طرح کے مذہبی معتقدات و آراء سے الگ رکھا جائے گا اور کوشش کی جائے گی کہ محور فکر و نظر فلسفہ و اجتماع ہو۔

ضمناً یہ امر بھی پیش نظر رہے گا کہ اجتماعی و فلسفی مباحث کے لیئے ایک نئے طرز بیان و انشاء کا نمونہ پیش کیا جائے، بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ فلسفیانہ مضامین وہی ہو سکتے ہیں۔ جن کی عبارت نہایت روکھی پھیکی اور بے مزہ ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اسے فلسفیانہ استدلال

د نظر سے بالکل خالی سمجھنا چاہیئے۔ مگر ہمارے خیال میں یہ قلبی
پست ہمتی کم از کم ان لوگوں کے لئے تو جائز نہیں مانی جاسکتی
جنہیں خدائے تعالیٰ نے اپنے ہر طرح کے افکار کو بہترلفظوں
اور موثر فصاحت کے ساتھ بیان کرنے کی قدرت دے
دی ہے۔ وَذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ ادران پر لائعنت
قرآنی کے درس وافادہ سے فیضانِ بیان کا ایک ایسا
دروازہ کھول دیا ہے کہ دقیق سے دقیق خشک مطالب کو
بھی وہ حسن وعشق کی دلچسپ داستان بنا سکتے ہیں۔

آں نیست کہ صحرائے سخن جادہ ندارد
وا از دل روشن کج نظری را چہ کند کس ؟

(۱۵) مولانا آزاد کی تحریر کی ایک خصوصیت مرقع نگاری ہے۔ ان کا سحر نگار قلم صدہا رنگینیوں اور حسن آرائیوں کے ساتھ جس دل کش اور مؤثر طریقہ سے قدرتی مناظر اور بزم و رزم کی صحیح تصویر الفاظ میں کھینچتا ہے۔ اس پر عقل حیران ہے۔
ان کا حقیقت نگار قلم اگر بزم وانجمن کی تصویر کشی کرنے لگے تو چشم تصور کے سامنے اس محفل کا سارا ماحول اور جملہ مناظر گھومنے لگتے ہیں۔ اور اگر ان کے اشہب قلم کی باگ رزم کی طرف مڑ جائے تو معلوم ہوتا ہے اعلیٰ درجہ کی عسکری تنظیم و ترتیب کے ساتھ مجاہدین صف آرا ہیں، بے نیام تلواریں اپنی چمک دمک سے نگاہوں کو خیرہ کر رہی ہیں۔ موت و زیست کی قیامت خیز جنگ شباب پر ہے۔ لاشیں تڑپ رہی ہیں، مقتولین کے حلق بریدہ سے خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ تو زخمیوں کے جسم سے خون اُبل رہا ہے۔
مولانا آزادؔ نے واقعات و مناظر کی بھرپور مصوری کے لیے جس غیر معمولی

سلیقہ سے مناسب، موزوں اور حسنِ انشار و بیان سے مزین الفاظ، نادر اور برجستہ ترکیبوں، اُچھوتی مثالوں اور استعاروں کا استعمال کرکے اس نوع کے محاکاتی طرزِ نگارش کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

(۱۶) مولانا آزادؒ کے طرزِ نگارش کی ایک لطیف خوبی یہ ہے کہ وہ "اَلْکِنَایَۃُ اَبْلَغُ مِنَ التَّصْرِیْحِ" کے مطابق اپنی زندگی کے حالات و واردات کو نہایت دھیمے اشاروں اور ھندسے کنایوں میں اس جدت و ندرت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ شاعرانہ انداز بیان تمام تفصیلات کا آئینہ دار ہو جاتا ہے۔

اس نوع کی تحریروں کے مطالعہ کے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اُن کا جادو نگار قلم بلاغت کے جوش اور فصاحت کی مستی کے ساتھ رقص کرنے لگا ہے تو اس سے چمنستانِ عبارت میں رنگا رنگ اور نوع بنوع کے پھول کھل گئے ہیں اور معانی و مطالب اپنی اصلی شکل و صورت کے ساتھ الفاظ و تراکیب کے آئینہ میں اس طرح جلوہ گر ہو گئے ہیں کہ سارا گلستانِ ادب ان کی جگمگاہٹ سے روشن ہوگیا ہے۔

مختصر یہ کہ مولاناؒ نے اپنی حیات زریں کی تیس سالہ سرگزشت کو پردۂ مجاز میں بیان کرکے نثر میں جو وجد آفریں شاعری کی ہے وہ ان کے کمالِ نگارش کا ایسا روشن پہلو ہے جس کی مثال موجودہ دنیائے علم و ادب میں نہیں ملتی۔

(باقی آئندہ)

(تصحیح)

مئی ۱۹۷۶ء کے برہان میں محمد مجیب صاحب کے عنوان سے درج مضمون میں مشتاق احمد صاحب کے نام سے پہلے نوابزادہ کی بجائے نواب لکھا گیا ہے۔ قارئینِ کرام صحت فرمالیں۔

فارسی شاعری میں لطافت وظرافت

خان محمد عاطف ملیح آبادی دانشگاہ تہران

لطافت وظرافت، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی ایک ہی تصویر کے مختلف رخ ہیں۔ اس سے قوموں کے ادبی ذوق اور خوش مزاجی کا پتہ چلتا ہے۔ بذلہ سنجی اور لطافت وظرافت کے ذریعہ ہی کسی قوم کی ذہنیت کو پہچانا جاسکتا ہے۔ جواب چبھتا ہوا ہونا چاہیے۔ ذرا سا بھونڈاپن پورے جملوں کو حدودِ ادب سے خارج اور سامع کی طبیعت کو مکدر کر دیتا ہے اور ذہنِ انسانی ایک بوجھ سا محسوس کرنے لگتا ہے۔ دنیا کے تمام بڑے لوگ حاضر جواب، پرمذاق اور نکتہ رس ہوئے ہیں۔ یہی وہ حضرات ہیں جو دنیائے ادب کو بقائے دوام عطا کرتے ہیں۔ عربی و فارسی ادب میں حاضر جوابی، لطافت وظرافت اور بذلہ سنجی کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ اہلِ فارس کے استاد عرب ہیں۔ عربوں نے اس میدان میں بہت زیادہ ترقی کی اور اس فن کو معراجِ کمال تک پہنچایا۔ شاگردوں نے اساتذہ کی روایات کو قائم رکھتے ہوئے اس میدان میں ترقی کی راہیں طے کیں۔

لطافت وظرافت آزادانہ فضا اور ماحول کی دین ہے۔ آزاد اور باذوق و دربار ی ماحول میں ہی ظرافت اور بذلہ سنجی پروان چڑھتی ہے۔ جابرانہ اور استبدادی نظامِ حکومت ذہنوں کو کند اور تنگی عطا کرتا ہے، ساتھ ہی انسان رواداری کے اعلیٰ جذبہ سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور وسیع النظری پیدا نہیں ہوسکتی۔ وسیع النظری کا پہلا زینہ رواداری کا جذبہ ہے اور رواداری کے بغیر وسیع النظری کا تصور ہی باطل ہو کر رہ جاتا ہے۔

فارسی ادب کا زریں عہد ہندوستان (برصغیر) میں سلطنت اسلامیہ کا قیام اور

مغل بادشاہوں کی قدردانی اور علم پروری کا مرہونِ منت ہے یہی وہ عہد ہے جب ہمیں فارسی زبان و ادب میں اعلیٰ پایہ کا مذاق، بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور لطافت و ظرافت کے لطیف و نازک انداز ملتے ہیں جو ذوقِ سلیم کے عین مطابق، باذوق، اور رسا طبیعتوں کے لیے لذت کا سامان فراہم کرکے کبھی مسکرانے اور کبھی قہقہہ لگانے کا موقع عطا کرتے ہیں میدانِ ظرافت میں فارسی ادب کو ایک خاص مقام حاصل ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس ادب میں تنوع اور وسعتِ خیال کی کمی ہے لیکن منظوم لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی میں فارسی ادب دنیا کے کسی ادب سے پیچھے نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ظرافت و لطافت کو صنعتِ شاعری میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک تو حاضر جوابی اور لطافت دوسرے قالب شعری! اس سے پتہ چلتا ہے کہ اہلِ فارس کے مزاجوں میں شاعری اور مزاح رچ بس گئے تھے اور ان کے ذہنِ طبع رسا اور مزاجِ موزوں کا تقاضا یہی تھا کہ ہر بات کو شعر کے قالب میں ڈھال کر اس کو بقائے دوام عطا کر دیں۔

اچھے اور ستھرے مزاحیہ ادب کے لیے ضروری ہے کہ اس معاشرہ میں آزادیٔ خیال کے ساتھ ہی ساتھ، احساس کا شدید جذبہ موجود ہو۔ لیکن یہ جذبہ حدودِ اعتدال کو نہ پار کرلے۔ وسعتِ نظر تنگ نظری کے پردوں میں گم نہ ہوجائے۔ اس لیے کہ وسیع النظری کے بغیر خوش طبعی کا تصور ناممکن ہوجاتا ہے اور آزادی کے بغیر یہ جوہر نمایاں نہیں ہوتا۔ مزاح کے لیے ایک آزاد معاشرہ اور فلاحی ریاست کی تشکیل ضروری ہے۔ اس کے بغیر معیاری مزاح پیدا نہیں ہوسکتا۔ طنز و مزاح اور لطافت و ظرافت کے درمیان فرق پیدا کرنا مشکل امر ہے طنز ہی دراصل مزاح ہے اور لطافت و ظرافت اس تصویر کا دوسرا رخ ہے۔ یہ بات مزاح نگار پر تکیہ کرتی ہے۔ یا اس کی نازک طبعی پر منحصر ہے کہ وہ تلوار کی طرح کام کرے یا کُند و زنگ آلود چاقو کی طرح تڑپائے۔ ذرا سا بھونڈا پن یا پھوہڑپن مزاح کو حدِ ادب سے گزار کر ابتذال کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ قومی آزادی کی پختگی کے ساتھ ہی ساتھ اعتدال و وسعتِ نظر قوموں میں پیدا ہوجاتی ہے۔ جس کو کئی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وقت

کے ساتھ ساتھ قومی آزادی کی بنیادیں مضبوط ہو جاتی ہیں جو معاشرہ میں امن و سکون کی فضا پیدا ہوتی جاتی ہے اور عوام کو سماجی سکون و تحفظ اور افکار گندم و خوف و دہشت سے نجات ملتی جاتی ہے۔ طنز و مزاح میں بلندگی افکار اور اعتدال پیدا ہوتا جاتا ہے اور اس سے ہر طبقہ کو لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔

مزاح اور جذباتِ لطیف کا اظہار اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب با اقتدار و حکمراں طبقہ اور درباری ماحول اعتدال پسند رہا ہو۔ اگر حاکم سخت گیر، جابر اور آمرانہ ذہن کا مالک ہو اور وہ دوسرے کی بات سننے پر گرانی محسوس کرتا ہو یا لوگوں کو اس کی ہیبت سے زبان ہلانے کی جرأت نہ ہو تو ظاہر ہے کہ خوش مزاجی کا ماحول پیدا نہیں ہو سکتا اور حاضر جوابی کا گلا گھٹ کر رہ جائے گا۔ لیکن اگر بادشاہ اور امراء خود باذوق اور شوخ طبع ہوں اور خوش مزاجی اور شوخیٔ طبع کو پسند کرتے ہوں تو درباری ماحول حاضر جوابی، مزاح و لطیف و نازک جذبات و خیالات کا مرکز بن جاتا ہے۔ بلندیٔ افکار اور بذلہ سنجی پورے ماحول پر چھا جاتی ہے۔ ہر بات میں نکتہ اور ہر نکتہ میں کام کی بات نکل آتی ہے۔

عرب فطرتاً جری، بہادر اور نڈر تھے۔ اس لیے حاضر جواب بھی تھے۔ حاضر جوابی اور بذلہ سنجی میں عربوں کا مرتبہ انتہائی بلند رہا ہے۔ اہلِ فارس عربوں کے شاگرد تھے۔ اسلامی نظریات اور آزادیٔ خیال ان کو ورثہ میں ملے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی کا ادب لطائف و نازک خیالی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی میں دنیا کے دوسرے ادبیات سے بہت آگے ہے۔

شاہی درباروں، بادشاہوں اور امرائے سخت گیر کی موجودگی میں ایک شاعر و ادیب ایسے چبھتے ہوئے اشعار و فقرات چست کرتا کہ وہ اس سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

سلطان محمود سبکتگین کے زمانہ میں صوبہ قبا پر بغو بن طوغان حکمران تھا اس کی موت کے بعد اس کی سلطنت اس کے پانچ بیٹوں کے حصہ میں آئی۔ محمود معاملاتِ حکمرانی

میانہال سخت گیر تھا۔ اس نے جب سمرقند اور ٹرانسکیشیا فتح کر لیا تو حکم دیا کہ پانچوں بھائیوں کو باجگذاری پر مجبور کیا جائے۔ انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور مندرجہ ذیل اشعار جواب میں لکھ بھیجے ؎

ما پنج برادر از قبائیم — دریا دل و آفتاب رائیم
ما ملک زمین ہمہ گرفتیم — اکنون بتفکر سمائیم
گر چرخ بکام ما نگردد — چنبر ز ہمش فرد کشائیم

ترجمہ:۔ ہم پانچوں بھائی اہل قبا۔ دریا دل ہیں اور آفتاب کی طرح روشن ہیں۔
ہم نے تمام زمین کی سلطنت حاصل کر لی ہے اور اب آسمان کی فکر میں ہیں۔
اگر آسمان کبھی ہماری موافقت نہ کرے تو اس کو بھی کھینچ کر گردن کے بل گرادینگے۔

ان کو سزا دینے کے لیے بادشاہ نے ایک لشکر روانہ کیا اور درباری شاعر الضاری سے خط لکھنے کو کہا۔ جسے الضاری نے اس طرح شروع کیا ؎

نمرود بہ عہد پور آذر — می گفت خدای خلق مائیم
جبارینم پشہ اورا — خوش داد سزا و ما گوائیم

ترجمہ:۔ نمرود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں تھا اور کہتا تھا کہ میں خالق مخلوق ہوں، لیکن ایک مچھر اس پر غالب آیا۔ اس کو کیسی اچھی سزا ملی ہم اس کے شاہد ہیں۔

اب ان کو ہوش آیا اور مندرجہ اشعار روانہ کیے ؎

ما پنج برادر از قبائیم — در قحط و نیاز مبتلائیم
شاہا تو عزیز مصر جودی — واخوان گناہگار مائیم
مارا بضاعتی است مزجات — شرمندۂ حضرت شمائیم
بر حالت زار ما ببخشای — از فضل و کرم کہ بی نوائیم

ترجمہ :- ہم پانچوں بھائی اہل قبا قحط اور پریشانی میں مبتلا ہیں۔ اے شاہ تو کریم ہے یعنی ادیوسف علیہ السلام! ہم تیرے گنہگار بھائی کرم کے طالب ہیں ہمارے پاس تھوڑی سی پونجی ہے۔ ہم آپ سے شرمندہ ہیں۔ ہماری حالت اچھی نہیں ہے ہم بے نواؤں پر فضل و بخشش کر۔

یہ جواب سن کر بادشاہ مسکرایا اور ان کو باجگذاری سے معاف کر دیا۔ ان اشعار میں ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ کر کے خاص قسم کی لذت پیدا کر دی ہے۔ جس کو سن کر آدمی بے اختیار مسکرا دے پہلے جواب میں دون کی ہانکنے کے بعد عجز و انکساری کو ایک لطیف پیرائے میں بیان کرنا لطافت و نزاکت کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ اس پر بادشاہ کا مسکرا کر انھیں معاف کر دینا یہ بتاتا ہے کہ اس طرح کا ماحول پیدا کرنے میں خود شاہان وقت کس قدر دل چسپی لیتے تھے۔ وہ عفو و درگزر سے کام لے کر دوسروں کو موقع دیتے تھے تاکہ لوگوں کی ذہنی صلاحیتیں آزاد فضا اور آزاد ماحول پا کر وسعتِ خیال کا روپ دھار سکیں۔

عبداللہ خان ازبک رستم کے مقبرہ کے پاس سے نکلا اور یہ شعر پڑھا ؎

سر از خاک بردار و ایراں ببیں بکامِ دلیرانِ توراں زمین

ترجمہ :- خاک سے سر اٹھا اور ایران کو دیکھ جو دلیرانِ توران کے قبضہ میں آچکا ہے۔

عبداللہ خاں کا وزیر ساتھ تھا اس نے کہا اگر رستم زندہ ہوتا تو میں جانتا ہوں کہ کیا جواب دیتا۔ عبداللہ خاں نے پوچھا کیا جواب دیتا؟

اس نے کہا رستم کا جواب یہ ہوتا ؎

چو بیشہ تہی ماند از نرہ شیر شغالانِ بیشہ در آید دلیر

ترجمہ :- جب کچھار شیروں سے خالی ہو گیا تو گیدڑ دلیرانہ طور پر چلنے لگے۔

شاہی درباروں میں شعر و شاعری کا ایک ماحول پیدا ہو چکا تھا بادشاہ

کی شاعرنوازی، درباروں میں ذہنی آزادی، اچھی اور بہتر بات کو شعر کے قالب میں فی حال کر فی البدیہہ کہنے پر جس طرح شاہان کج کلاہ شاعروں کو نوازتے تھے۔ اس نے ایسی فضا پیدا کرنے میں مدد دی تھی۔ خود شاہوں اور ان کے حرم میں شاعرانہ ہنسی مذاق اور نوک جھونک کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ جہانگیر اور نورجہاں کی ادبی نوک جھونک بہت شہرت رکھتی ہے۔ ایک بار جہانگیر نورجہاں کے ساتھ بالاخانہ پر کھڑا تھا۔ نیچے ایک بوڑھا آدمی کمر جھکائے جا رہا تھا۔ جہانگیر نے اس کو دیکھ کر کہا ؎

چرا خم گشتہ می گردند پیرانِ جہاں دیدہ

ترجمہ:۔ بوڑھے آدمی کمر جھکائے کیوں گھومتے ہیں۔

نورجہاں نے جواب دیا ع

بہ زیرِ خاک می جویند ایامِ جوانی را

ترجمہ:۔ مٹی میں اپنی کھوئی ہوئی جوانی کو تلاش کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ نورجہاں باغیچہ میں ٹہل رہی تھی اتفاقاً ایک شاعر سے سامنا ہو گیا اسے دیکھتے ہی نورجہاں نے مذاق کے طور پر کہا۔ ع

زمیں ترقید و پیدا شد سرِ خر

ترجمہ:۔ زمیں پھٹی اور گدھا ظاہر ہوا

شاعر نے فی البدیہہ کہا۔ ع

شمیدہ بوی مادہ آمدہ نر

ترجمہ:۔ مادہ کی بو پر نر آ گیا۔

لیکن ملکۂ نورجہاں نے اس جواب کو بھی برداشت کیا اور کوئی سزا نہ دی۔ اگر شاہی درباروں میں گھٹن کی فضا پیدا ہو جاتی اور شاعروں، ادیبوں اور دوسرے لوگوں کو آزادانہ طور پر اپنی بات کہنے کی اجازت نہ ہوتی تو ادبی نکات ظاہر نہیں ہو سکتے تھے۔

اور نہ ہی طنز و مزاح کا ماحول پیدا ہو سکتا تھا۔

خاقانی نے منوچہر شیروانی شاہ کو یہ شعر روانہ کیا۔

دشتی دہ کہ در بر ہم گیرد یا دستاتی کہ در برش گیرم

ترجمہ :۔ ایک لونڈی عطا کر کہ وہ میری بغل میں بیٹھے یا عامہ اونٹنی کہ میں اس کی کوکھ میں بیٹھوں۔

لفظ "یا" نے خاقان کو ناراض کر دیا۔ اس نے سوچا کہ میری سخاوت پر شک کیا ہے۔ شاعر سے کہلا بھیجا کہ سزا کے لیے تیار ہو جاؤ۔ خاقانی نے شاہی قاصد کی موجودگی میں مکھی کی طرف دیکھا اس کی "ٹانگ" اور "پر" کاٹ لیے اور کہلا بھیجا کہ میں نے لفظ "با" لکھا تھا "یا" نہیں لیکن یہ بدبخت مکھی آ گئی روشنائی نم تھی جس کی وجہ سے دو نکتے ہو گئے۔ خاقان اس جواب سے بہت خوش ہوا اور اسے معاف کر دیا۔

شاہوں کا ادبی ذہن و مزاج کچھ اس طرح بن گیا تھا کہ اورنگ زیب جیسا شخص جو شعر و شاعری کو پسند نہیں کرتا تھا بعض اوقات مجبور ہو جاتا تھا کہ شعر و شاعری میں دلچسپی لے ایسی بات نہیں ہے کہ وہ ادبی ذوق کا مالک نہیں تھا یا شعر و سخن سے لگاؤ نہ رکھتا تھا اصل بات یہ ہے کہ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہ تھا کہ وہ شعر و سخن کی محفلیں سجاتا اور دادِ سخن دیتا۔ اس کی ساری عمر گھوڑے کی پیٹھ پر گزر گئی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں ایران سے ایک مصرعہ بھیجا گیا۔ اورنگ زیب نے شاعروں سے اس پر گرہ لگانے کو کہا لیکن جب کوئی مصرع اسے پسند نہ آیا تو اس نے اپنی بیٹی کو بلا کر اس پر مصرع لگانے کو کہا۔

زیب النساء نے کہا آپ کا حکم نہیں ہے کہ شعر و شاعری کروں۔

اورنگ زیب نے اجازت دی۔ تو مصرع کے بارے میں پوچھا۔ بادشاہ نے مصرع سنایا۔

کہ آسمان رود و کار آفتاب کند

زیب النساء نے اس پر گرہ لگائی ۔ ع

اگر بہ ذرہ نظر مہر بو تراب کند — کہ آسمان رود و کار آفتاب کند

ترجمہ۔ اگر بو تراب یعنی حضرت علیؓ ذرہ کو محبت کی نظر سے دیکھ لیں تو وہ آسمان پر پہنچکر مثل آفتاب چمکنے لگے۔

شعر و شاعری کا تبادلہ باپ اور بیٹوں کے درمیان بھی ہوا کرتا تھا نظام الملک آصف جاہ اول بانی سلطنت نظام دکن، اچھے شاعر تھے۔ ان کا دربار شعراء سے بھرا رہتا تھا۔ ناصر جنگ شہید آصف جاہ کے بیٹے تھے۔ وہ بھی شعر کہتے تھے۔ باپ بیٹے کے درمیان شعری موشگافیاں چلتی رہتی تھیں۔ ناصر جنگ نے ایک شعر باپ کی خدمت میں روانہ کیا ۔

مرنجان خاطر جانا مزاجی نازکی دارم — تو گر از حسن مغروری من از عشق تو مغرورم

ترجمہ:۔ میری جان مجھے دکھ نہ دے، میں انتہائی نازک مزاج ہوں۔ تو اگر اپنے حسن کا غرور رکھتا ہے تو میں بھی اپنے عشق پر مغرور ہوں۔

نواب آصف جاہ نے شعر دیکھنے کے بعد کہا کہ قباحت یہ ہے کہ عاشق کے لیے مغرور ہونا اچھا نہیں اس پر بیٹے نے کہا بجز حضرت کے میرا عاشقی و معشوقی کا کوئی رشتہ موجود نہیں اور یہ میں نے حضرت کے بارے میں کہا ہے، یہ کہا اور روانہ ہو گئے۔

آصف جاہ نے ناصر جنگ کو یہ مصرع روانہ کیا ع

اندکی بگذار تا سیر تجلی می کنم

ترجمہ:۔ تھوڑی دیر ٹھہر تاکہ میں تیرے جمال کا نظارا کردں ۔

اس کے جواب میں ناصر جنگ نے یہ مصرع روانہ کیا ع

گر تو استغنا کنی من ہم تغافل می کنم

ترجمہ:۔ اگر آپ نے بے پروائی کا اظہار کیا تو میں بھی چشم پوشی کروں گا۔

اس طرح کی آزاد فضا میں فارسی علم و ادب کی ترقی جاری رہی تھی آداب شاہانہ خوردگی و بزرگی باپ و بیٹے کا حجاب ' درباری رسم و رواج اور آداب بالائے طاق رکھ دیئے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر موضوع پر آپ کو فارسی اشعار ملیں گے۔ نازک خیالی' لطافت و نزاکت ' ہجو لطائف ' مبالغہ آرائی ' پہیلیاں ' ایک ہی لفظ کے مختلف معنی لینا اور شعر کے مطلب کو کہیں سے کہیں پہنچا دینا ' فارسی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

خواجو کرمانی اور عصمت ہم عصر تھے۔ ایک دوسرے سے شاعرانہ رشک و حسد بھی رکھتے تھے۔ بادشاہ کو بھی یہ بات معلوم تھی اور وہ کبھی کبھی دونوں میں نوک جھونک کرا دیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ بادشاہ اور عصمت ایک جشن میں شریک تھے خواجو آ گیا۔

بادشاہ نے عصمت کو مخاطب کر کے کہا۔ " لو تمہارا دوست آ گیا۔ کیا تم اس سے ملو گے نہیں ؟

عصمت نے اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا ؂

خواجو نگر ' خواجو نگر ' خواجو ز کرمان آمدہ
کرمان زگہ بیرون شوند اے گہ ز کرمان آمدہ

ترجمہ :۔ خواجو کو دیکھو ! خواجو کو دیکھو خواجو کرمان سے آیا ہے۔ کرمان (کیڑے) کبھی گھورے میں چلے جاتے ہیں اور کبھی باہر آ جاتے ہیں۔

غرض یہ کہ بادشاہوں نے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے ادب لطیف کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔

ظرافت کے لغوی معنی تو خردمندی اور خوبی کے ہیں۔ ایسا شخص جس کی تقریر میں خوبی و دانائی پائی جائے اسے ظریف اللسان کہتے ہیں۔ ساتھ ہی خوش

اور بشاشت کا پہلو بھی رکھتی ہو جو لوگوں پر گراں نہ گزرے. لیکن ایسی گفتگو جو ہنسی اور مذاق سے پر ہو مگر بے معنی ہو لطافت و ظرافت کہے جانے کی مستحق نہیں. اس طرح کے جملے یا اشعار محض استہزاء مخول یا ٹھٹوں کا نمونہ ہونگے اخلاقی دنیا میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی۔

مزاح کی تاریخ دراصل طلوع اسلام سے ہی شروع ہوتی ہے. اسلام سے پہلے عرب مزاح کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے. ذرا سا مذاق یا خوش طبعی تلوار زنی میں بدل جاتی ہے. اسلام نے چہروں کی خشکی اور رکھائی کو دور کر کے خوش طبعی میں بدل دیا۔

ظرافت کے لیے ذکاوت اور حاضر جوابی ضروری ہے. لیکن فحش نہیں، دائرۂ اخلاق کے اندر رہ کر حاضر جوابی کے جوہر دکھانا ہی دراصل ظرافت ہے۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں قدیم رنگِ ظرافت نہیں بھاتا. موجودہ عہد کی بیہودہ اور مضحک باتوں کو ظرافت کی معراج اور فن مانتے ہیں. قدیم ظرافت میں کچھ فحش باتیں آ گئی ہیں. لیکن زیادہ باتیں کام کی ہیں تو تہذیب سکھاتی ہیں. آدابِ محفل سے روشناس کراتی ہیں. بات کرنے کا ایک اچھوتا قرینہ معلوم ہوتا ہے. حاضر جوابی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں. طرزِ معاشرت کے لیے اصلاحی پہلو تلاش کرتی ہیں. لیکن موجودہ عہد میں بے ہودہ افسانوں اور فرضی معاشقوں کو افسانوں کی شکل دے دینا ظرافت کا معیار بن گیا ہے. اس طرح سے جو ادب پروان چڑھ رہا ہے اسے لطافت و ظرافت تو کہا نہیں جا سکتا. ظرافت روحانی سکون عطا کرتی ہے. اس کو مجروح نہیں کرتی۔

جنوبی افریقہ کے مسلمان

از جناب احمد ثبات صاحب

براعظم افریقہ کے اقصی الجنوب میں جنوبی افریقہ کا (ساؤتھ افریقہ) ملک واقع ہے اس کا رقبہ تقریباً پانچ لاکھ مربع میل ہے مورخین کے قول کے مطابق یورپین قومیں ۱۶۵۲ء مغربی طرف سے آئیں اور حبشی اقوام شمال کی طرف سے آکر آباد ہوئیں اور بعض حبشی قومیں پہلے سے آباد تھیں ہندی قومیں ۱۸۶۰ء مزدورانہ حیثیت سے لائی گئیں اور اس کے بعد صوبہ گجرات سے بعض قومیں تاجرانہ حیثیت سے آکر آباد ہوئیں اور ان سب کے اختلاط سے ایک دوسری قوم جو کلرڈ کہلاتی ہے ہستی میں آئی۔

حبشی ایک کروڑ دس لاکھ ہیں جن میں تھوڑے مسلمان ہیں جو مشرقی افریقہ سے یہاں کام کرنے آئے ہیں اور بعضے یہاں اسلام قبول کرتے ہیں۔ یورپین چالیس لاکھ۔ ملائی پچھتر ہزار (جو ملایا سے غلام حیثیت سے لائے گئے تھے) کلرڈ پندرہ لاکھ اور ہندی چھ لاکھ ہیں ہندی میں مسلمان بھی ہے اور ہندو بھی۔ تقریباً چار حصہ ہندو ہیں اور ایک حصہ مسلمان۔ ہندوؤں میں زیادہ تر مدراسی علاقہ سے ہیں اور تقریباً ایک تہائی دہلی بہار وغیرہ علاقے سے آئے ہیں چونکہ یہ لوگ کلکتہ بندرگاہ سے آئے ہیں اس لیے کلکتیہ اور ہندوستانی کہلاتے ہیں۔ گجرات کاٹھیاواڑ کے ہندو بنیا کہلاتے ہیں۔ مدراس کے بہت سے ہندو عیسائی ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں میں اکثریت گجرات کے مسلمانوں کی ہے گجرات کے بوہرہ (سنی) اور کاٹھیاواڑ کے میمن ہیں۔ گجرات کاٹھیا کے علاوہ تمام قومیں اپنے آبائی وطن سے بالکل انجان ہیں۔ کوئی رشتہ تعلق باقی نہیں

اور نہ دلچسپی ہے۔ یہ تمام قومیں اسی کو اپنا وطن سمجھتی ہیں۔ اور یہاں جینا مرنا پسند کرتی ہیں۔ یورپینوں اور حبشیوں میں بہت سی لڑائیاں ہوئیں۔ یورپین غالب آئے انکی حکومت قائم ہو گئی اور اب تک قائم ہے لیکن دنیا کے تغیر اور تبدل سے حبشیوں کو انکے علاقے میں دستوری حکومت (یورپینوں کے زیر سایہ) دینا شروع کیا ہے۔ ہندی مزدورانہ حیثیت سے آئے مزدوری کا عہد پانچ برس پورا کرنے کے بعد آزاد کر دیئے گئے بہت سے اسی کاموں میں ہیں۔ بعضے زمیندار ہو گئے اور بعضے تاجر۔ گجرات، کاٹھیا واڑ کے ہندی اصل سے تجارت میں ہیں اور زیادہ تر انہیں کا قبضہ ہے۔ ہندیوں کو انکی آبادی ۔ ۔ ۔ والے شاؤنوں (آبادیوں) میں ممبری کا حق ملا ہے اور مرکزی مشاورتی کمیٹی بھی پچیس ممبروں کی بنائی ہے۔ صوبائی اور مرکزی حکومت میں نہ انکی نمائندگی ہے اور نہ آواز۔

اس ملک کو اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص نعمتوں سے نوازا ہے سونا ہیرے لوہا کوئلہ وغیرہ معدنیات بڑے پیمانہ پر نکالے جاتے ہیں موسم معتدل ہیں اس لیے زراعت بہت کامیابی کے ساتھ کی جاتی ہے یورپین قوموں نے محنت و کوشش سے تعلیم اور سائنس کی روشنی میں خداداد قابلیت کے ساتھ اس ملک کو بہت آباد، شاداب اور خوش حال بنا کر اس ملک کو رشکِ ارم بنا دیا ہے اور جانفشانی اور فیاضی سے دن بدن آبادی میں اضافہ کر کے افریقہ کا سب سے آباد سب سے خوشحال اور ترقی یافتہ اور سب سے مضبوط طاقتور ملک بنا دیا ہے اور یہ مبالغانہ ہوگا کہ آج کے زمانہ میں اگر امریکہ کے برابر نہیں تو اس کی صف میں تو ضرور کھڑا رہ سکتا ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ آج کی دنیا کے باشندہ یورپین قومیں ہیں گو کہ انھوں نے ایشیا اور افریقہ کو آزاد کر دیا ہے لیکن زندگی کی ضروریات میں بالخصوص سائنس میں ایشیا اور افریقہ ان کے دست نگر ہیں۔ اس ملک کو یورپینوں نے اپنی والہانہ کوششوں سے صرف آباد اور مضبوط ہی نہیں بنایا بلکہ اپنے اثر و اقتدار سے حبشی اور ہندی قوموں

کی کایا پلٹ دی ہے گو کہ یہ ملک افریقہ کا حصہ ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یورپ کا حصہ ہے یا امریکہ کا کنارہ ہے یورپین قومیں بچپن ہی سے تعلیم تربیت حاصل کوشش اور محنت اور جانفشانی سے کرتی ہیں، بلند ہمتی عالی حوصلگی، ہمدردی ظاہری وضعداری انصاف قوم و وطن کے لیے ہر قسم کی قربانی کرنا، اپنے حصولِ مقصد میں جان و مال کی پرواہ نہ کرنا نمود و نام آوری میں جان کھپانا، وقت کی پابندی، قوانین کی تابعداری اپنی مثال آپ ہیں۔ ہندی قوم کے آباؤ اجداد سیدھے سادے بھولے بھالے ان پڑھ تھے مدراس کا مزدور اور گجرات کا تاجر اس میں برابر تھے لیکن ان کی اولاد آج وکیل ڈاکٹر نرس ٹیچر کلرک وغیرہ نامور تاجر بڑے بیوپاری فیکٹری اور کارخانہ جات والے لکھپتی ہوگئے ہیں یورپینوں حبشیوں اور ہندیوں کے سکول الگ الگ ہیں مگر بچپن ہی سے وقت کی پابندی اصول کی تابعداری سرداروں کی اطاعت قوانینِ ملک کی رعایت انسانیت کی خیرخواہی سکھلائی جاتی ہے اولوالعزمی شغف جانفشانی محنت عرق ریزی ان کا خمیر ہوتا ہے نام نمود آوری اور حصولِ مادیت ان کی طبیعت بن جاتی ہے۔ مڈل ایسٹ (مشرق وسطیٰ) اور ہندوپاکستان کی میری مسافری میں یہ فرق صاف صاف نمایاں معلوم ہوتا تھا۔ قوم چونکہ طبعاً عقل و ذکاء اور وفاداری میں دوسری قوموں سے بڑھی ہوئی ہے جلد اثر قبول کرلیتی ہے اس لیے تعلیم تربیت اور ماحول کے اثر سے اس کی اصلیت "مشرقیت" سے "مغربیت" اور "روحانیت" سے "مادیت" میں تبدیل ہوچکی ہے سکولوں کی پابندی عام ہے لیکن تجارت میں اوقات کی پابندی کارخانوں میں علی الصباح ہندی جوان لڑکے لڑکیاں سرعت اور پابندی سے جاتی ہیں اور ان کی روزانہ زندگی اور کاروبار میں اسی تعلیم تربیت اور ماحول کا اثر ہے اور یہی سب وہ عمل ہے جس سے روزانہ میں فراخی معیشت اور معاشرہ کے طریقوں میں تنوع اور جدت اور وسعت بہت پیدا ہے۔ رہائش و زیبائش کے حصول میں کوشش اور شغف خورد و نوش لبس اور زینت

تنوع مادیت کے حصول میں اپنی پوری کوشش خرچ کرتے ہیں اور ساتھیوں سے میل جول میں ہمہ تن کوشاں رہتے ہیں۔ یہی وہ سبب ہے کہ جب یہاں کا ہندی اپنے مادرِ وطن جایا کرتا ہے تو اس کو ہر چیز نئی اور انوکھی اور انسان بھی دوسری دنیا کا انسان معلوم ہوتا ہے۔ الغرض یہاں کا ہندی اپنے آباء و اجداد جیسا ہندی نہیں ہے بلکہ اکل و شرب لبس و زینت گفتار و رفتار بود و باش معاش و معاشرہ میں پورا مغربیت سے بھرا ہوا ہے اور الناس علیٰ دین ملوکہم کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اصولِ مغربیت کے مطابق لڑکے لڑکیاں ساتھ مخلوط تعلیم حاصل کرتے ہیں کارخانہ میں ساتھ کام کرتے ہیں سینما کھیل کود سیر و تفریح سب کا جزءِ زندگی ہے دکانوں دفتروں میں ساتھ کام کرتے ہیں۔ اس بنا پر یہاں کا ہندو نہ تو کٹر مہا سبھائی ہندو ہے اور نہ مسلمان پکا سرحدی مسلمان بلکہ سب کے مدِ نظر حصولِ مادیت ہے۔ بدنی اعضاء ہونٹ، رخسار، پلک، بھوں، سر کے بال، آگے اور پیچھے کا حصہ وغیرہ سبکو خصوصیت سے زیادہ خوبصورت بنانا اور لباس ایسا پہننا جس میں بدن زیادہ جھلکے اور میلان زیادہ بڑھے۔ مکانوں کی سجاوٹ۔ حصولِ مال و جاہ و تفریحِ قلب منتہائے نظر و مقصود ہے۔ بسا اوقات لوگوں کو اکل و شرب سے زیادہ کو سمیٹیک (پاؤڈر کریم عطر وغیرہ) میں خرچ کرتے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ستمبر ۷۰ء میں ڈربن دنٹ بول ٹیم کی جوہانسبرگ ٹیم کے ساتھ میچ جوہانسبرگ میں ہوا۔ ڈربن سے جوہانسبرگ چار سو میل سے زیادہ دور ہے۔ کھلاڑی سب یورپین تھے۔ ہندیوں کو یورپینوں کے ساتھ کھیلنے کا قانوناً حق نہیں ہے۔ صرف دیکھنے کے لیے اور اپنی طبعی دل چسپی کے لیے جوہانسبرگ جانا چاہتے تھے۔ پندرہ سو ٹکٹ آئے اور بک گئے پھر اور زیادہ دو سو آئے ان کی خریداری کے لیے دو ہزار ہندی جمع ہو گئے۔ قریب تھا کہ طوفان مچ جاتا۔ دیکھنے کے لیے خاص عزت و راحت کی جگہ نہیں ہوتی۔ صرف دیکھنے کے لیے اتنا لمبا سفر کیا۔

مزید برآں ٹکٹ نہ ملنے کے باوجود مزید پندرہ سو اور پہنچ گئے۔ عورتیں بھی گئیں۔ موٹر کے ایکسیڈنٹ میں دو موتیں بھی ہوئیں۔ بس وغیرہ کے حادثوں میں کئی زخمی ہوئے۔ ع

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

اللہ کے فضل و کرم سے ہر مسلم بستی میں مساجد و مدارس ہیں علماء اساتذہ ائمہ اور مبلغین کی خدمات سے مسلمان مسلمان تو ہے۔ بستی کے تناسب کے اعتبار سے یہاں کے مسلمان خصوصاً جوان طبقہ اور رحجے میں دنیا میں ریکارڈ ہے اور اپنی اولاد کو اعلیٰ دینی تعلیم دینے کے لیے ہند و پاکستان بہت کافی تعداد میں بھیج رہے ہیں لیکن دینی تعلیم دن بدن کمزور ہو رہی ہے بعض عربی زبان دانی کے شوق میں قرآنی تعلیم چھوڑ رہے ہیں یہاں زبان انگلش ڈچ اور زولو ہے سب کاروبار اسی میں ہوتا ہے اسلیے گجراتی اردو زبان ختم ہو گئی ہے بہت سے مدراس میں انگلش میں مسائل سکھائے جاتے ہیں۔ تھوڑی بہت اردو پڑھتے ہیں وہ مدرسہ چھوڑنے پر استاد کو واپس کرکے آجاتے ہیں۔ ملائی مسلمان خور و نوش لباس و زینت رہائش و زیبائش سیر و تفریح تمام اصول زندگی میں پورا مغربیت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ان میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ایک داماد مسلمان دوسرا ہندو تیسرا عیسائی ہے۔ رفتار زمانہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ ہندی مسلمان اسی رو میں بہہ رہا ہے اس لیے اس کا انجام بھی وہی ہوگا یہاں قانوناً یورپینوں کے ساتھ مناکحت وغیرہ منع ہے۔ یہ اللہ کا فضل و احسان ہے ورنہ کب سے ہماری ہندیت اور اسلامیت ختم ہو جاتی۔ یہاں ہندو مسلمان لڑکے لڑکیاں سب ساتھ تعلیم حاصل کر رہے ہیں تعلیم اور زیادہ عام اور اعلیٰ بنائی جارہی ہے۔ عورتیں کارخانوں دکانوں اور زندگی کے تمام شعبوں میں حصہ لے رہی ہیں پہلے ہندی جہاں چاہتے رہ سکتے تھے لیکن ہندیوں کے لیے الگ شہر بسائے جا رہے ہیں ہندو مسلمان سب ساتھ بود و باش کر رہے ہیں اخبار و رسائل روزانہ کی زندگی ہے

بیٹھ کر جز ولانیفک ہے پینا کوئی عیب نہیں ہے اس اثر میں مسلمان اولاد میں اسلام اور دوسرے مذاہب سے فرق اٹھتا جاتا ہے. سب مذاہب میں برابر ہیں صرف اسلام ہی سچا مذہب نہیں ہے آخرت کی نجات اور قبولیتِ اعمال کے لیے صرف اسلام شرط نہیں ہے. مسلمان عورت اپنا لباس بدل چکی ہے تنگ و باریک نیم عریاں لباس عام ہو رہا ہے. محفلِ رقص و سرود میں شرکت انتخاب حسینہ اور انتخاب خوبصورتی لباس میں شرکت مسلمانوں میں عام ہو رہی ہے اور ان باتوں کو اسلام کے خلاف نہیں سمجھا جاتا اپنا شوہر خود پسند کرتی ہے. بلکہ تلاش کرنا بھی شروع کر دیا ہے. نکاح سے پہلے منگیتر کے ساتھ آزادانہ اختلاط عام ہو رہا ہے. روک تھام بسا اوقات منگنی ٹوٹنے کا باعث ہو جاتا ہے. ہنی مون (شبِ وصال) گھروں کے بجائے ہوٹلوں میں ہو رہا ہے اس سے زیادہ یہ ہے کہ ہندی مسلمان اپنا سورتی، میمن، سید، حیدرآبادیت وقبائلیت تو کھو چکا ہے لیکن اب مسلمان لڑکے لڑکیاں ہندو مسلمان کا فرق بھی اٹھا رہی ہیں. بہت سے مسلمان لڑکے لڑکیاں ہندو لڑکا لڑکی پسند کرتی ہیں اور ہندو بن کر ہندو مذہب کے موافق نکاح کرتی ہیں یا گورنمنٹ کے قانون کے موافق نکاح رجسٹر کرا لیتی ہے یا بغیر نکاح کے ایسے ہی ساتھ رہتے ہیں ماں باپ اور قوم کی ناراضگی اور احتجاج بے سود ہوتا ہے پسند کی عورت اور نکاحی زندگی مغربیت میں تبدیل ہو رہی ہے. سودی لین دین عام ہے خودکشی بڑھ رہی ہے گھوڑ دوڑ عام ہے شراب نوشی اور عام ہو رہی ہے اور اس کی تجارت کا پروانہ بھی ہندی کو مل رہا ہے الغرض معاشرہ مغربیت میں تبدیل ہو رہا ہے. یہ حالات صرف جنوبی افریقہ کے نہیں ہیں بلکہ ہر اس ملک کے ہیں جہاں مسلمان یورپینی قوموں کے زیر اثر رہتے ہیں. چنانچہ مغربی جزائر میں ایک مسلمان اپنے مہمان سے تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ میرے بہنوئی مسٹر نائیڈو ہیں، مذہبی تعلیم کی کتابیں انگلش میں بہت کم ہیں

مزید برآں ٹکٹ نہ ملنے کے باوجود مزید پندرہ سو اور پہنچ گئے۔ عورتیں بھی گئیں۔ موٹر کے اکسیڈنٹ میں دو موتیں بھی ہوئیں۔ بس وغیرہ کے حادثوں میں کئی زخمی ہوئے۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

اللہ کے فضل وکرم سے ہر مسلم بستی میں مساجد و مدارس ہیں علماء و اساتذہ ائمہ اور مبلغین کی خدمات سے مسلمان مسلمان تو ہے۔ بستی کے تناسب کے اعتبار سے یہاں کے مسلمان خصوصاً جوان طبقہ اور رجحے میں دنیا میں رکورڈ ہے اور اپنی اولاد کو اعلیٰ دینی تعلیم دینے کے لیے ہند و پاکستان بہت کافی تعداد میں بھیج رہے ہیں لیکن دینی تعلیم دن بدن کمزور ہو رہی ہے بعض عربی زبان دانی کے شوق میں قرآنی تعلیم بھی رہے ہیں یہاں زبان انگلش ڈچ اور زولو ہے سب کاروبار اسی میں ہوتا ہے اسلیے گجراتی اردو زبان ختم ہو گئی ہے بہت سے مدراس میں انگلش میں مسائل سکھائے جاتے ہیں۔ تھوڑی بہت اردو پڑھتے ہیں وہ مدرسہ چھوڑنے پر استاد کو واپس کر کے آجاتے ہیں۔ ملائی مسلمان خورد ونوش لباس وزینت رہائش وزیبائش سیر وتفریح تمام اصول زندگی میں پورا مغربیت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ان میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ایک داماد مسلمان دوسرا ہندو تیسرا عیسائی ہے۔ رفتار زمانہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ ہندی مسلمان اسی رو میں بہہ رہا ہے اس لیے اس کا انجام بھی وہی ہوگا یہاں قانوناً یورپینوں کے ساتھ مناکحت وغیرہ منع ہے۔ یہ اللہ کا فضل واحسان ہے ورنہ کب سے ہماری ہندیت اور اسلامیت ختم ہو جاتی۔ یہاں ہندو مسلمان لڑکے لڑکیاں سب ساتھ تعلیم حاصل کر رہے ہیں تعلیم اور زیادہ عام اور اعلیٰ ہو گئی جارہی ہے۔ عورتیں کارخانوں دکانوں اور زندگی کے تمام شعبوں میں حصہ لے رہی ہیں پہلے ہندی جہاں چاہتے رہ سکتے تھے لیکن ہندیوں کے لیے الگ شہر بسائے جا رہے ہیں ہندو مسلمان سب ساتھ بود و باش کر رہے ہیں اخبار و رسائل اور روزانہ کی زندگی ہے

ریڈیو جو دلانیگک ہے سینما کوئی عیب نہیں ہے اس اثر میں مسلمان اولادیں اسلام اور دوسرے مذاہب سے فرق اٹھتا جاتا ہے۔ سب مذاہب میں برابر ہیں صرف اسلام ہی سچا مذہب نہیں ہے آخرت کی نجات اور قبولیتِ اعمال کے لیے صرف اسلام شرط نہیں ہے۔ مسلمان عورت اپنا لباس بدل چکی ہے تنگ دبا ریک نیم عریاں لباس عام ہو رہا ہے۔ محفلِ رقص و سرود میں شرکت انتخاب حسینہ اور انتخاب خوبصورتی لباس میں شرکت مسلمانوں میں عام ہو رہی ہے اور ان باتوں کو اسلام کے خلاف نہیں سمجھا جاتا اپنا شوہر خود پسند کرتی ہے۔ بلکہ تلاش کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔ نکاح سے پہلے منگیتر کے ساتھ آزادانہ اختلاط عام ہو رہا ہے۔ روک تھام لبا اوقات منگنی ٹوٹنے کا باعث ہو جاتا ہے۔ ہنی مون (شبِ وصال) گھروں کے بجائے ہوٹلوں میں ہو رہا ہے اس سے زیادہ یہ ہے کہ ہندی مسلمان اپنا ۔ورثی ہمیں سیٹھ حیدرآبادیت وقبائلیت تو کھو چکا ہے لیکن اب مسلمان لڑکے لڑکیاں ہندو مسلمان کا فرق بھی اٹھا رہی ہیں۔ بہت سے مسلمان لڑکے لڑکیاں ہندو لڑکا لڑکی پسند کرتی ہیں اور ہندو بن کر ہندو مذہب کے موافق نکاح کرتی ہیں یا گورنمنٹ کے قانون کے موافق نکاح رجسٹرڈ کرالیتی ہے یا بغیر نکاح کے ایسے ہی ساتھ رہتے ہیں ماں باپ اور قوم کی ناراضگی اور احتجاج بے سود ہوتا ہے پسند کی عورت اور نکاحی زندگی مغربیت میں تبدیل ہو رہی ہے۔ سودی لین دین عام ہے خودکشی بڑھ رہی ہے گھوڑ دوڑ عام ہے شراب نوشی اور عام ہو رہی ہے اور اس کی تجارت کا پروانہ بھی ہندی کو مل رہا ہے الغرض معاشرہ مغربیت میں تبدیل ہو رہا ہے۔ یہ حالات صرف جنوبی افریقہ کے نہیں ہیں بلکہ ہر اس ملک کے ہیں جہاں مسلمان یورپینی قوموں کے زیر اثر رہتے ہیں۔ چنانچہ مغربی جزائر میں ایک مسلمان اپنے مہمان سے تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ میرے بہنوئی مسٹر نائیڈو ہیں۔ دینی تعلیم کی کتابیں انگلش میں بہت کم ہیں

لہٰذا ضرورت ہے کہ عقل ونقل کی روشنی میں انگلش میں کتابیں شائع کی جائیں کہ اسلام کیا مذہب ہے؟ دوسرے مذاہب سے کیا تعلق ہے؟ اسلامی تہذیب کلچر معاشرہ کیا ہے؟ مسلمان دوسرے مذاہب والوں کے ساتھ کہاں تک مخالطت کرسکتا ہے غیر مسلموں کو اپنے گھر لانا۔ اس کے گھر جانا کیسا ہے؟ غیر مسلموں کے ساتھ نکاح کرنیکا حکم کیا ہے مسلم عورت کا ستر کیا ہے لباس کیا ہے؟ سینما رقص وسرود اتحاد حسینہ میں شرکت۔ نکاح سے پہلے منگیتر کا حکم و اسلامی اخلاق تہذیب و معاشرہ کیا ہے؟ مغربی تہذیب کے مطابق محبت کرنے کے بعد نکاح کرنا کیسا ہے اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب میں کیا فرق ہے ریہ تمام امور وضاحت کے ساتھ رازی وغزالی کے فلسفوں میں تفصیل سے بیان کیے جائیں۔

بعض بااثر صاحب خیر کتاب کو انگریزی میں ترجمہ کرا کر چھپوا کر ثانوی درجہ کے نصاب میں داخل کرانا چاہتے ہیں اس عظیم الشان تبلیغی خدمت کی طرف ارباب علم وفضل اہل فہم وفراست صاحب تحقیق وبصیرت حضرات کو دعوت دیجاتی ہے

ایں کار از تو آید ومرداں چنیں کنند

ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین

تہذیب کا دورِ جدید اور اجتہاد کی ضرورت

از ڈاکٹر محمد احسان اللہ خاں صاحب

تقریباً پچاس ہزار سال قبل انسان نے موجودہ شکل و صورت اختیار کی۔ اس زمانے میں وہ زیادہ تر کچے گوشت پر گزارہ کرتا تھا۔ یہ حجری دور کہلاتا تھا۔ جو تقریباً چالیس ہزار سال تک کم و بیش یوں ہی قائم رہا۔ اس دور کا سماجی ڈھانچہ شکار کی تہذیب (HUNTING CIVLIZATION) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

لیکن تقریباً دس ہزار سال قبل اس زمانے کے انسان کو اس کا احساس ہوا کہ وہ محض شکار پر گزارہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایک طرف انسانی آبادی بڑھ رہی تھی اور دوسری جانب انسانی آبادی کے تناسب سے ان جانوروں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی جن کے گوشت پر ان کا گزارہ ہوتا تھا۔ اس وقت انسانی جان کی قیمت اسی کی تہذیب کے مقابلے میں زیادہ ہونے کی بنا پر اس نے مجبوراً یہ فیصلہ کیا کہ دھیرے دھیرے قدیم تہذیب کے مقابلہ میں ایک نئی تہذیب کو جنم دیا جائے۔ جانوروں کا شکار کرنے کے بجائے ان جانوروں کو پالا جائے جو آسانی سے پالے جا سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں بھیڑ اور بکریوں کے ریوڑ پالے جانے لگے۔ اب شکار کے لیے کم اور پالتو جانوروں کی دیکھ بھال پر زیادہ وقت صرف کیا جانے لگا اور ریوڑوں کو ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ میں لے جایا جانے لگا۔ ایسی صورت میں ایک دوسرا ہی سماجی ڈھانچہ بنا جس کو خانہ بدوش تہذیب (NOMADIC—CIVILIZATION) کہا جاتا ہے اس دور میں جنگلی اناج کے استعمال کا رواج بھی عام ہو گیا۔

مگر انسانی آبادی میں اضافہ نے اس طریق زندگی پر بھی دباؤ ڈالا اور بالآخر یہ معا
نظام بھی روزافزوں انسانی آبادی کے لیے ناکافی ثابت ہوا۔ تقریباً پانچ ہزار سال
انسان نے کاشتکاری کی جانب رخ کیا۔ ابتدا میں اس نے پہاڑوں کے دامن میں دریا
کے کنارے باقاعدہ کاشت شروع کردی۔ جگہ کا انتخاب اس لحاظ سے کیا گیا تھا کہ پہاڑ
اور جھیل یا دریا میں شکار کھیلا جائے اور جنگلات کے میدان یا اس کے گرد پالتو جانور
کو چرایا جائے گا۔ مگر یہ حکمت عملی بھی زیادہ دنوں تک نہیں چل سکی اور بالآخر ان کو
میدانوں میں آکر وسیع پیمانے پر کاشت کرنی پڑی۔ اس پیشہ کے اختیار کرنے سے
سماجی ڈھانچہ بنا اس کو زراعتی تہذیب GRICULTURE CIVILIZATION
کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پندرھویں صدی عیسوی میں اس کا پھر احساس ہونے لگا کہ انسانی آبادی
اضافہ کا دباؤ بڑھ رہا ہے اس دباؤ کا اثر زیادہ تر سرد علاقوں میں بسنے والوں
نتیجتہً سرد علاقے کے لوگوں کو زراعتی تہذیب کو خیرباد کہنا پڑا۔ ان لوگوں نے بتدریج
نیا ذریعہ معاش ڈھونڈ نکالا یعنی نئے کارخانے وجود میں آنے لگے جن کا تیار کردہ سا
دور دراز علاقوں میں بھیجا جانے لگا۔ جس جگہ ایک کارخانہ قائم ہوا۔ اسی کے قریب
کارخانہ قائم ہونے میں زیادہ آسانی ہوئی۔ اس طرح صنعتی شہر آباد ہونے لگے اور آبا
کے علاقے سے صنعتی شہروں میں منتقل ہونے لگی اس طرح جو سماجی ڈھانچہ بنا اسے
صنعتی تہذیب (INDUSTRIAL CIVILIZATION) کہا جاتا ہے۔

اس طرح انسانی تہذیب کو چار واضح تہذیبوں میں تقسیم کیا گیا ہے مگر جب
ایک قدیم تہذیب کے افراد نے ترقی یافتہ تہذیب کی سمت میں قدم اٹھانے کی کوش
کی ہے تو ان کو دو قسم کی طاقتوں کا بیک وقت مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ ایک ان
اندر افراد کی مخالفت جو اپنی پارینہ تہذیب کی برتری کا راگ الاپتے ہیں اور بد

زمانے سے بے نیاز ہو کر اسی تہذیب کے احیا کے لیے اپنی تمام قوت ضائع کرتے رہتے ہیں
دوسرا مقابلہ بیرونی محاذ پر غالب تہذیب کے افراد سے ترقی کے ہر میدان میں ایسی حالت
میں مقابلہ کرنا ہوتا ہے جبکہ ان کو کسی طرف کی ہمدردی حاصل نہ ہو۔ ایسی صورت میں
قدیم تہذیب کے وہی افراد کامیاب ہوتے ہیں جو اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ بلند قوتِ
ارادی کے مالک ہوں اور مصائب سے نبرد آزما ہونے میں تکلیف کے بجائے لذت
محسوس کرتے ہوں۔ یہ بھی قدرت کا دائمی قانون رہا ہے کہ ہر زمانے میں وہی قوم
حاکم رہی ہے۔ جو علمی سماجی فوجی اور سیاسی میدان میں برتر رہی ہے۔ جو قومیں ایک
زمانے میں ان شعبوں میں برتری حاصل کر چکی ہوں اور بدلتے ہوئے حالات میں اپنی
برتری برقرار نہ رکھ سکی ہوں ان کی تعمیرات محکمہ آثارِ قدیمہ کے حوالے کر دی جاتی ہیں
دوران کے افراد ترقی کے ہر میدان سے نکال باہر کیے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ ازل سے
ب تک چل رہا ہے۔ تاریخ میں کہیں بھی اس کی مثال نہیں ملتی ہے کہ قدیم تہذیب
بدید دور میں بالکل اسی شکل میں دوبارہ غالب ہوئی ہو۔ لہٰذا یہ قدرت کا قانون معلوم
ہوتا ہے کہ قدیم تہذیب کو جوں کا توں واپس لانے کی کوشش قوت اور وقت کا زیاں ہے۔
مسلمان عام طور سے یہ یقین رکھتے ہیں کہ انسانیت کے ہر موڑ پر ایک پیغمبر کی بعثت
ئی ہے مگر اسلامی تاریخ اور موجودہ کھدائی کے نتیجہ میں جو بات سامنے آئی ہے اس سے یہ
ازہ ہوتا ہے کہ شکار اور خانہ بدوش تہذیبوں میں کسی ایک پیغمبر کی بھی بعثت نہیں
ئی۔ یہاں تک کہ ابتدائی زراعتی تہذیب میں جب انسان نے باقاعدہ پہاڑوں کے
ن میں کاشت شروع کر دی تھی کسی پیغمبر کی بعثت نہیں ہوئی۔ حضرت نوح کا زمانہ
زمانہ ہے جب انسان کھلے میدان میں کاشتکاری کرتا تھا۔ مگر وہ اس زمانے
تھا دریں کاشت کاری کرتا تھا۔ جہاں کھیتوں کو جوتتا نہ تھا بلکہ سیلاب کے آجانے
مٹی پر بیج ڈال دیتا تھا لہٰذا اس دور کے انسان کو مسلسل سیلابی طوفان کا مقابلہ

مگر انسانی آبادی میں اضافہ نے اس طریقِ زندگی پر بھی دباؤ ڈالا اور بالآخر یہ معاشی
نظام بھی روز افزوں انسانی آبادی کے لیے ناکافی ثابت ہوا۔ تقریباً پانچ ہزار سال پہلے
انسان نے کاشتکاری کی جانب رخ کیا۔ ابتدا میں اس نے پہاڑوں کے دامن میں دریا یا جھیل
کے کنارے باقاعدہ کاشت شروع کردی۔ جگہ کا انتخاب اس لحاظ سے کیا گیا تھا کہ پہاڑی
اور جھیل یا دریا میں شکار کھیلا جائے اور جنگلات کے میدان یا اس کے گرد پالتو جانوروں
کو چرایا جائے گا۔ مگر یہ حکمت عملی بھی زیادہ دنوں تک نہیں چل سکی اور بالآخر انسان کو کھلے
میدانوں میں آکر وسیع پیمانے پر کاشت کرنی پڑی۔ اس پیشہ کے اختیار کرنے سے جو
سماجی ڈھانچہ بنا اس کو زراعتی تہذیب (AGRICULTURE CIVILIZATION)
کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پندرھویں صدی عیسوی میں اس کا پھر احساس ہونے لگا کہ انسانی آبادی کے
اضافہ کا دباؤ بڑھ رہا ہے اس دباؤ کا اثر زیادہ تر سرد علاقوں میں بسنے والوں پر ہوا
نتیجۃً سرد علاقے کے لوگوں کو زراعتی تہذیب کو خیرباد کہنا پڑا۔ ان لوگوں نے بتدریج ایک
نیا ذریعہ معاش ڈھونڈ نکالا یعنی نئے کارخانے وجود میں آنے لگے جن کا تیار کردہ سامان
دور دراز علاقوں میں بھیجا جانے لگا۔ جس جگہ ایک کارخانہ قائم ہوا۔ اسی کے قریب دوسرا
کارخانہ قائم ہونے میں زیادہ آسانی ہوئی۔ اس طرح صنعتی شہر آباد ہونے لگے اور آبادی کا
کے علاقے سے صنعتی شہروں میں منتقل ہونے لگی اس طرح جو سماجی ڈھانچہ بنا اس کو
صنعتی تہذیب (INDUSTRIAL CIVILIZATION) کہا جاتا ہے۔

اس طرح انسانی تہذیب کو چار واضح تہذیبوں میں تقسیم کیا گیا ہے مگر جب کبھی
ایک قدیم تہذیب کے افراد نے ترقی یافتہ تہذیب کی سمت میں قدم اٹھانے کی کوشش
کی ہے تو ان کو دو قسم کی طاقتوں کا بیک وقت مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ ایک ان کے
اندر افراد کی مخالفت جو اپنی پارینہ تہذیب کی برتری کا راگ الاپتے ہیں اور بدلتے ہوئے

زمانے سے بے نیاز ہو کر اسی تہذیب کے احیا کے لیے اپنی تمام قوت ضائع کرتے رہتے ہیں
دوسرا مقابلہ بیرونی محاذ پر غالب تہذیب کے افراد سے ترقی کے ہر میدان میں ایسی حالت
میں مقابلہ کرنا ہوتا ہے جبکہ ان کو کسی طرف کی ہمدردی حاصل نہ ہو۔ ایسی صورت میں
قدیم تہذیب کے وہی افراد کامیاب ہوتے ہیں جو اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ بلند قوتِ
ارادی کے مالک ہوں اور مصائب سے نبرد آزما ہونے میں تکلیف کے بجائے لذت
محسوس کرتے ہوں۔ یہ بھی قدرت کا دائمی قانون رہا ہے کہ ہر زمانے میں وہی قوم
حاکم رہی ہے۔ جو علمی سماجی فوجی اور سیاسی میدان میں برتر رہی ہے۔ جو قومیں ایک
زمانے میں ان شعبوں میں برتری حاصل کر چکی ہوں اور بدلتے ہوئے حالات میں اپنی
برتری کا برقرار نہ رکھ سکی ہوں ان کی تعمیرات محکمہ آثار قدیمہ کے حوالے کر دی جاتی ہیں
اور ان کے افراد ترقی کے ہر میدان سے نکال باہر کیے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ ازل سے
اب تک چل رہا ہے۔ تاریخ میں کہیں بھی اس کی مثال نہیں ملتی ہے کہ قدیم تہذیب
جدید دور میں بالکل اسی شکل میں دوبارہ غالب ہوئی ہو۔ لہٰذا یہ قدرت کا قانون معلوم
ہوتا ہے کہ قدیم تہذیب کو جوں کا توں واپس لانے کی کوشش قوت اور دولت کا زیاں ہے۔

مسلمان عام طور سے یہ یقین رکھتے ہیں کہ انسانیت کے ہر موڑ پر ایک پیغمبر کی بعثت
ہوئی ہے مگر اسلامی تاریخ اور موجودہ کھدائی کے نتیجہ میں جو بات سامنے آئی ہے اس سے یہ
اندازہ ہوتا ہے کہ شکار اور خانہ بدوش تہذیبوں میں کسی ایک پیغمبر کی بھی بعثت نہیں
ہوئی۔ یہاں تک کہ ابتدائی زراعتی تہذیب میں جب انسان نے باقاعدہ پہاڑوں کے
دامن میں کاشت شروع کر دی تھی کسی پیغمبر کی بعثت نہیں ہوئی۔ حضرت نوح کا زمانہ
وہ زمانہ ہے جب انسان کھلے میدان میں کاشتکاری کرتا تھا۔ مگر وہ اس زمانے
کا تھا جس میں کاشت کاری کرتا تھا۔ جہاں کھیتوں کو جوتتا نہ تھا بلکہ سیلاب کے آجانے
والی مٹی پر بیج ڈال دیتا تھا لہٰذا اس دور کے انسان کو مسلسل سیلابی طوفان کا مقابلہ

کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے اس دور کے خاص دیوتا دریا اور پانی کے دیوتا تھے۔ حضرت ابراہیم کا وہ دور تھا جب لوہے کی ایجاد ہو چکی تھی۔ اور انسان نے باقاعدہ بنجر میں کاشت شروع کر دی تھی وہ زمین کو لوہے کے اوزار سے اچھی طرح جوت کر بیج ڈالتا تھا مگر اس دور کا خاص دیوتا سورج تھا کیونکہ اس کی وجہ سے خشک سالی کا خطرہ رہتا تھا۔

اس دور میں عام طور سے زراعتی پیداوار میں باقاعدہ اضافہ ہوا جس کی وجہ سے دور دراز علاقوں سے تجارت کا موقع فراہم ہوا اور تجارتی کارواں آنے جانے لگے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ حضرت ابراہیم نے کافی سفر کیا۔ حضرت موسیٰ کے دور میں کاشتکاری اپنے عروج پر تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ بھابھر زمین میں باقاعدگی کے ساتھ کاشت کے علاوہ نہروں کا بھی رواج ہو چکا تھا جس سے انسان زیادہ تر دقتی بارش پر قناعت کرنے کے بجائے آبی وسائل پر بہت حد تک قابض ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں گائے کا مقام بہت زیادہ بلند ہو چکا تھا اور گائے کی پرستش عام ہو چکی تھی حضرت موسیٰ کی کوشش کے باوجود گائے کی عزت انسان کے دل میں گھر کیے ہوئے تھی کیونکہ زراعتی تہذیب میں یہ بہت بڑی دولت تھی ایک طرف اس سے دودھ ملتا تھا اور دوسری طرف بیلوں سے کھیت جوتا جاتا تھا نیز ان کے ذریعہ اناج دیہات سے قصبوں و شہروں میں پہنچایا جاتا تھا اس کے علاوہ اس کے گوبر کو بطور کھاد کے استعمال میں لایا جاتا تھا۔ حضرت عیسیٰ کے دور تک یہ صورتحال کم و بیش قائم رہی۔

آخری پیغمبر کے دور میں زراعتی تہذیب بہت ہی اچھی شکل اختیار کر چکی تھی لیکن جس علاقے میں پیغمبر کی بعثت ہوتی وہاں اس وقت تک خانہ بدوشی کی تہذیب غالب حیثیت رکھتی تھی اور تجارت پیشہ کی وقعت بڑھ رہی تھی۔ لہٰذا اسلامی تہذیب نے خانہ بدوشی تہذیب میں جنم لیا۔ اس پر دھیرے دھیرے زراعتی تہذیب کا غلبہ بڑھا۔ یہ تہذیب اپنے آخری دنوں میں بڑی حد تک صنعتی رنگ اختیار کر چکی تھی۔ مگر یہ رنگ

کافی حد تک محدود علاقے میں رہا لہذا موجودہ دور میں اسلام کی ایک ہی تہذیب نہیں ہے بلکہ ہر علاقے کی اپنی ایک مخصوص (اسلامی) تہذیب ہے۔

مسلمانوں کی تہذیب نیم شکار گاہی تہذیب سے نیم صنعتی تہذیب تک پھیلی ہوئی اور خصوصاً ایک زراعتی تہذیب ہے۔ یہ تہذیب صنعتی دور میں کسی صورت میں بھی اپنی قدیم شکل میں غالب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مسلمان اپنی قدیم تہذیب کے احیا کے لیے جتنی کوشش کرینگے اسی حد تک ان کی غلامی کی زنجیریں بھی مضبوط ہوتی جائیں گی۔ ترقی یافتہ مسلم ممالک کو اس پیچیدگی کا احساس ہوتا جا رہا ہے۔ وہ ایک طرف ایسی تمام تحریکوں کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسری طرف اسلامی تہذیب کو جدید ترین صنعتی تہذیب میں تبدیل کرنے کے کوشاں ہیں مگر دوسرے غیر ترقی یافتہ مسلم ممالک ان کے لیے بہت بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کا مسئلہ ایسے ممالک میں اور پیچیدہ ہو جاتا ہے جہاں ان کی اپنی حکومت نہیں ہے بلکہ وہ مشترک حاکم ہیں اور حکومت میں ان کی شرکت یا تو کمزور درجہ کی ہے یا غالب حیثیت رکھتی ہے ایسے ممالک میں ترقی یافتہ مسلمان بحیثیت ایک فرد کے اجتہاد کرتا ہے اور ترقی کے میدان میں اپنا مقام پیدا کرنے کے لیے ایک نیا راستہ نکال لیتا ہے جس کو عموماً پس ماندہ مسلمانوں کی حمایت حاصل نہیں ہوتی اس طرح ان دونوں میں قربت کے بجائے بعد پیدا ہو جاتا ہے اور عام طور سے مسلمان اپنے مسلم حاکم سے بھی انصاف تک حاصل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

یہ صورتِ حال بہت ہی تشویشناک ہے اس مسئلہ کے حل کے لیے بہتر یہ ہوگا کہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ حضرات مل کر بیٹھیں اور ملک کے حالات اور وقت کا صحیح تجزیہ کر کے ایک جدید طریقہ زندگی طے کریں (ہندوستان میں فی الحال چند ایسے جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی ہیں جو براہ راست قرآن اور حدیث کا مطالعہ کر سکتے ہیں ان لوگوں کی شرکت بھی بہت ضروری ہے)

ایسا کیا جانا اسلیے ضروری ہے کہ ایک طرف علم کا میدان کافی وسیع ہو چکا ہے اور دنیا کی [illegible]
ہو گیا ہے دوسری طرف نہ علماء حضرات کا حلقہ نہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کا حلقہ الگ الگ اس قابل ہے کہ
صحیح اجتہاد کر سکے جب معاملہ کی نزاکت یہ ہو تو کیسے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ایک فرد خواہ وہ علماء
کے حلقہ کا ہو یا جدید تعلیم یافتہ حضرات کے حلقہ کا صحیح اجتہاد کر سکے اور کسی معاملہ میں صحیح فتویٰ دے سکے
مگر جس طرح جان بچانے کیلیے حرام کھانے کی بھی اسلام میں اجازت ہے اسی طرح موجودہ دور میں صحیح
اسلامی قانون کی عدم موجودگی میں ہر مسلمان کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے طور پر اجتہاد کرے اور ایسا
رویہ اختیار کرے جس سے انسانیت کی بھلائی ہو سکے۔

برہان:۔ فاضل مقالہ نگار نے جو سائنس کے مستند اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ خدا کے فضل و
کرم سے بڑے دیندار و صالح بھی ہیں ان کا یہ مضمون ہم نے اسی لیے شائع کیا ہے کہ ہم اس پر بحث شروع
کرنا چاہتے ہیں۔ یوں تو آجکل یہ کہنا ایک فیشن بن گیا ہے کہ زمانہ اب بدل گیا ہے۔ تہذیب بدل گئی ہے سماجی اور
معاشی قدریں بدل گئی ہیں اسلیے اسلام کو بھی بدلنا چاہیے چنانچہ اس میں بھی یہی بات دہرائی گئی ہے لیکن ہم پوچھنا
چاہتے ہیں کہ جی ہاں! زمانہ بدل گیا اور تہذیب بدل گئی بالکل درست فرمایا۔ لیکن اب صاحب یہ بھی بتلایئے کہ
تہذیب کے اسی دورِ جدید کے وہ کون سے تقاضے ہیں جن کے باعث اسلام کے احکام میں تبدیلی ناگزیر ہے کیا اسکے
تقاضے یہ ہیں کہ سوسائٹی میں عورتوں اور مردوں کا آزادانہ اختلاط و ارتباط ہو نائٹ کلبوں کی چہل پہل ہو شراب
نوشی اور جوئے پر قدغن نہ ہو! انسان عبادات کو ترک کر دے اور زندگی میں مکمل آزادی ہو یا اسکے تقاضے یہ ہیں کہ
سائنس اور ٹکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم ہو۔ یونیورسٹیاں ہوں تجربہ گاہیں ہوں ایجادات اور اختراعات ہوں صنعت و
حرفت اور زراعت و فلاحت میں علوم جدیدہ سے فائدہ اٹھایا جائے اور معیارِ زندگی بلند ہو۔

ہم امید کرتے ہیں کہ فاضل مقالہ نگار ان مسائل پر کھل کر بحث کریں گے جن میں انکے نزدیک تہذیب کے دورِ جدید کے
تقاضوں کے پیشِ نظر علمائے اسلام کو اجتہاد کی ضرورت ہے ہم انکے یہ مضامین بڑی خوشی سے برہان میں شائع کریں گے
اور اسکے بعد پھر خود اپنی معروضات پیش کریں گے۔ بہرحال اب وقت آ گیا ہے کہ بات گول مول نہ ہو جو ہو
پوری صفائی اور وضاحت کے ساتھ ہو۔ تاکہ ہم کسی قطعی نتیجہ تک پہنچ سکیں۔

تبصرے

نقدِ ابوالکلام مولفہ ڈاکٹر رضی الدین احمد تقطیع کلاں۔ ضخامت ایک ہزار پندرہ صفحات کتابت وطباعت بہتر۔ قیمت مجلد درج نہیں۔ شائع کردہ رجسٹرار سری وینکٹیشورا یونیورسٹی تردیتی آندھرا۔

فاضل مؤلف مذکورہ بالا یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔ یہ نہایت ضخیم کتاب وہ تحقیقی مقالہ ہے۔ جس پر یونیورسٹی نے ان کو ڈاکٹر کی ڈگری دی ہے اور یہ کتاب چھپی بھی یونیورسٹی کی طرف سے ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم جنہوں نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھا ان کے بقول اگرچہ نام نقدِ ابوالکلام ہے لیکن حقیقتہً یہ کتاب اردو کے انانیتی ادب کا ایک تفصیلی اور تقابلی مطالعہ ہے۔ چنانچہ کتاب جو چھ ابواب پر مشتمل ہے اس کے باب اول میں نہایت مبسوط و مفصل بحث " انانیت" پر کرکے بتایا گیا ہے کہ اس کی کیا تعریف ہے؟ اس کے طبعی اور نفسیاتی اسباب کیا ہوتے ہیں، اس کے عناصر ترکیبی کیا ہیں۔ ان میں سے ہر عنصر کی کیا خصوصیت ہے۔ ادب میں اس کا ظہور کس طرح ہوتا ہے اور اس کے کیفیات و مزایا کیا ہیں؟ لائق مؤلف نے اس بحث میں انگریزی اور فرانسیسی ادب سے بھی استفادہ کیا ہے۔ باقی پانچ ابواب میں موصوف نے سرسید احمد خاں، میر تقی میر، مرزا غالب، اور ڈاکٹر اقبال۔ ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ ایک مستقل باب میں کلام کرکے ان کے انانیتی رجحانات کو پیش کیا اور ان پر نقد و تبصرہ کیا ہے۔ اگرچہ وہ ان ابواب میں بھی اردو زبان کے ان ارکانِ اربعہ کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کا موازنہ کرتے گئے ہیں۔ لیکن آخری

باب مولانا ابوالکلام کے لیے مخصوص ہے جو کتاب کا اصل موضوع ہیں اور اس میں انانیتی ادب میں مولانا کی انفرادیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب درحقیقت ایک نہیں بلکہ پانچ اساطینِ ادب اردو کے انانیتی رجحانات کے مفصل تذکرہ و تبصرہ پر مشتمل ہے اور یہی وجہ اس کے اس درجہ ضخیم ہونے کی ہے۔ اس کتاب کی خصوصیات سے متعلق ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع اور بلیغ ہے۔ فرماتے ہیں :-

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نقدِ ابوالکلام کا کوئی گوشہ ایسا نہیں کہ جس پر قلم اٹھاتے وقت کوئی نقاد اس معیاری تصنیف سے بے نیاز رہ سکے۔ پھر کیوں نہ یہ تصنیف اردو تنقید میں ایک ممتاز اور معیاری جگہ پائے۔ اس تنقیدی کاوش سے انانیتی رجحانات پر جس قدر روشنی پڑتی ہے اور پہلی مرتبہ اس کے جتنے پہلو سامنے آگئے ہیں وہ فاضل نقاد کی تنقیدی صلاحیت اور صحتِ نظر کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم صدر جمہوریہ ہونے کے علاوہ اردو زبان کے نامور ادیب اور نقاد بھی تھے اور انہوں نے صرف رسماً نہیں بلکہ مسودہ کتاب پر نظر ڈال کر لکھا ہے۔ اس بنا پر اس کتاب کی فضیلت کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا سند ہو سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کے انانیتی ادب پر یہ پہلی کتاب ہے۔ جو نہایت جامع اور مبسوط ہے۔ لائق مؤلف نے جو کچھ لکھا ہے بے لاگ اور صاف لکھا ہے۔ اس سے تنقیدی شعور کے علاوہ موصوف کی جرأت و جسارت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ البتہ اول تو انانیت شعر کی طرح ایک ایسی انتزاعی صفت ہے جس کی حدِ تام ممکن نہیں ہے اور پھر اس کے حدود اور ان کی قدریں متعین کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ اس بنا پر ایسی ضخیم کتاب میں ایسے مقامات بھی کافی ہیں جہاں لائق مؤلف کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اردو لٹریچر میں اس کی اہمیت مسلم ہے۔ زبان و بیان بھی شگفتہ دلچسپ اور موثر ہے

آخر میں پچاس صفحات اشاریہ کے لیے وقف ہیں۔ شروع میں فہرست مضامین ہے لیکن تعجب ہے فہرستِ ماخذ کہیں نظر نہیں آئی۔ حالانکہ تحقیقی مقالہ اس فہرست کے بغیر بے وقعت ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر سید محمود مرحوم از جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب۔ ایم۔ اے تقطیع متوسط ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت درج نہیں ہے پتہ :۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

جیسا کہ لائق مرتب نے دیباچہ میں خود کہا ہے۔ یہ درحقیقت کوئی کتاب نہیں بلکہ ان ذاتی تاثرات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی وفات پر معارف کی دو قسطوں میں ظاہر کیے تھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ وہ مسلمانوں کی اس پرانی نسل کے ایک گلِ سرسبد تھے جن کو قدرت نے انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ اسلامی اخلاق و فضائل، دینی جذبہ و کردار اور ملی و قومی دردمندی سے بھی حصۂ وافر عطا فرمایا تھا اور اس بنا پر انھوں نے اپنی زندگی ملت اسلامیہ اور ملک و قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو دارالمصنفین سے بڑا تعلقِ خاطر تھا۔ وہاں جاتے تو کئی کئی دن قیام کر کے اپنی زندگی کے تجربات بیان کرتے اور چونکہ لائق مرتب بھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سب سے زیادہ ڈاکٹر صاحب سے ہی مانوس اور متاثر تھے اور اس لیے اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ اس بنا پر انہوں نے جو کچھ محسوس کیا اور خود ڈاکٹر صاحب سے جو کچھ سنا وہ سب دلچسپ انداز اور مؤثر زبان میں ان اوراق میں قلم بند کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب تحریک خلافت سے لے کر کانگرس کی تحریکِ آزادی تک۔ اور اس کے بعد بھی مختلف جماعتوں میں صفِ اول کے رہنماؤں میں رہے ہیں اس بنا پر اس داستان میں ڈاکٹر صاحب کی

زبان سے بہت سے اکابر ملک و قوم کا تذکرہ بھی آگیا ہے جو دلچسپ بھی ہے اور بعض مواقع پر عبرت انگیز و سبق آموز بھی اسی لیے اس کتاب کو عام طور پر قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

سید احمد خاں از پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ تقطیع متوسط ضخامت ۱۹۲ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت پانچ روپیہ۔ پتہ:۔ پبلیکیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات و نشریات پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی۔ ۱۔

حکومت ہند کی وزارت اطلاعات و نشریات کے ماتحت "جدید ہندوستان کے معمار" کے زیر عنوان مختلف اکابر ملک و قوم پر الگ الگ کتابیں شائع کرنے کا جو منصوبہ بنایا گیا ہے اور جس کے جنرل ایڈیٹر جناب آر۔ آر۔ دواکر ہیں۔ اس کے سلسلہ میں پروفیسر خلیق احمد نظامی نے یہ کتاب دراصل انگریزی میں لکھی تھی، جو طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے زیر تبصرہ کتاب اس کا شگفتہ اور رواں اردو ترجمہ ہے جو جناب اصغر عباسی صاحب نے کیا ہے۔ پروفیسر نظامی عصر حاضر کے مشہور مورخ ہیں اور پھر یہ کتاب انھوں نے لکھی ہے علی گڑھ میں بیٹھ کر جہاں مولانا آزاد لائبریری کے ماتحت سرسید سے متعلق ہر قسم کی معلومات کا ایک عظیم ذخیرہ محفوظ ہے اور اس کے لیے ایک شعبہ ہی الگ قائم ہے۔ اس بنا پر یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود اس قدر جامع ہے کہ سرسید کی زندگی کا کوئی گوشہ اوجھل نہیں رہا۔ یوں تو سرسید پر کتابوں کی کمی نہیں ہے لیکن اس کتاب کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ فاضل مصنف نے اس کی ترتیب و تالیف میں سرسید کے ان خطوط اور دستاویزات سے بھی مدد لی ہے جو علی گڑھ میں محفوظ ہیں اور اب تک عام نہیں ہوئیں۔ کتاب کے آخر میں دو ضمیمے ہیں جو سرسید اور ان کے عہد پر تحقیقی

کام کرنے والوں کے لیے بہت مفید اور کارآمد ہیں۔ پہلا ضمیمہ حیات سید احمدؒ کے زیر عنوان سرسید کے تمام واقعات وحالات کے سنین اور تاریخ پر مشتمل ہے۔ دوسرا ضمیمہ جو کتابیات پر ہے اس میں پہلے سرسید کی تصنیفات وتالیفات کی ایک طویل فہرست ہے۔ اس کے بعد سرسید پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان کی اور پھر ان مزید کتابوں کی جو اس تصنیف کے وقت فاضل مصنف کے پیشِ نظر رہی ہیں۔ غرض کہ کتاب بہت مفید پر از معلومات اور لائق مطالعہ ہے۔

اسباب بغاوتِ ہند از سرسید احمد خاں مرتبہ جناب فوق کریمی۔ تقطیع خورد۔ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد تین روپیہ۔ پتہ:۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶۔

سرسید کی یہ وہ مشہور اور معرکہ آرا کتاب ہے جو انہوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے اسباب ودواعی سے متعلق بڑی جسارت اور بیباکی سے لکھی تھی اور جس نے اس وقت کی برطانوی پارلیمنٹ کے ایوان میں زلزلہ پیدا کر دیا تھا۔ ایسی اہم کتاب ایک ہی مرتبہ چھپ کر رہ گئی تھی۔ عرصہ سے بالکل ناپید تھی۔ اب یہ بہت خوب ہوا کہ لائق مرتب نے اس کو دوبارہ اہتمام سے شائع کر دیا ہے اور اس پر اسّی صفحات کا ایک طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت اس کے اثرات اس عہد میں مغلیہ سلطنت کے حالات ملک کی سماجی، اقتصادی اور اخلاقی حالت ۱۸۵۷ء کے وجوہ واسباب، سرسید کے سوانح حیات ان کی خدمات وغیرہا ان سب پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ اصل کتاب تو نہایت اہم ہے ہی اس کا مقدمہ بھی فکر انگیز اور لائق مطالعہ ہے۔



بچے ہم پر امید لگائے ہوئے ہیں

ہاں۔ ہمیں ان کا خیال رکھنا چاہیئے۔

ان کی پرورش اور دیکھ بھال کی ذمہ داری ہم پر ہی ہے۔ اچھی خوراک، اچھے کپڑے اور اچھی تعلیم ان کا حق ہے۔ بڑا ہو کر انہیں اچھا روزگار بھی ملنا چاہیئے۔ لیکن اگر بچے زیادہ ہوں تو کیا ہم ان کی تمام ضروریات پوری کر سکتے ہیں؟ اس کا ایک ہی جواب ہے ... چھوٹا کنبہ ــــ کنبہ جتنا چھوٹا ہوگا اتنا ہی ہر بچہ کو زیادہ پیار مل سکے گا۔

مفت مشورہ اور خدمت کے لئے فیملی ویلفیئر سینٹر

دی مغل لائن لمیٹڈ (حکومت ہند کا تجارتی ادارہ)

پروگرام حج سنہ ۱۹۷۳ء

بمبئی سے بحری جہازوں کی روانگی:- ہم انتہائی مسرت کے ساتھ ذیل میں حج سنہ ۱۹۷۳ء کے لیے جہازوں کی روانگی کا عارضی پروگرام پیش کرتے ہیں۔

بمبئی سے روانگی		(قبل رمضان)	جدہ سے روانگی
۱- ایم، وی، اکبر	۳۰ ستمبر سنہ ۱۹۷۲ء	ایس، ایس، مظفری	۲۱ جنوری سنہ ۱۹۷۳ء
		(بعد رمضان)	
۲- ایم، وی، اکبر	۱۱ نومبر سنہ ۱۹۷۲ء	ایم، وی، اکبر	۲۷ جنوری سنہ ۱۹۷۳ء
۳- ایس، ایس، سعودی	۱۵ نومبر سنہ ۱۹۷۲ء	ایس، ایس، سعودی	۲۹ جنوری سنہ ۱۹۷۳ء
۴- ایس، ایس، مظفری	۲۰ نومبر سنہ ۱۹۷۲ء	ایس، ایس، مظفری	۷ فروری سنہ ۱۹۷۳ء
۵- ایم، وی، اکبر	۲۵ نومبر سنہ ۱۹۷۲ء	ایم، وی، اکبر	۱۱ فروری سنہ ۱۹۷۳ء
۶- ایس، ایس، سعودی	۴ دسمبر سنہ ۱۹۷۲ء	ایس، ایس، سعودی	۱۸ فروری سنہ ۱۹۷۳ء
۷- ایم، وی، اکبر	۸ دسمبر سنہ ۱۹۷۲ء	ایم، وی، اکبر	۲۴ فروری سنہ ۱۹۷۳ء
۸- ایس، ایس، مظفری	۱۲ دسمبر سنہ ۱۹۷۲ء	ایس، ایس، مظفری	۲۶ فروری سنہ ۱۹۷۳ء
۹- ایم، وی، اکبر	۲۱ دسمبر سنہ ۱۹۷۲ء	ایم، وی، اکبر	۱۰ مارچ سنہ ۱۹۷۳ء
۱۰- ایس، ایس، سعودی	۲۷ دسمبر سنہ ۱۹۷۲ء	ایس، ایس، سعودی	۱۲ مارچ سنہ ۱۹۷۳ء
۱۱- ایس، ایس، مظفری	۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۷۲ء	ایس، ایس، مظفری	۱۵ مارچ سنہ ۱۹۷۳ء

- مرچنٹ شپنگ ایکٹ سنہ ۱۹۵۸ء کے تحت روانگی کی یقینی تاریخوں کا اعلان ہر جہاز کی روانگی سے پندرہ دن پہلے کیا جائے گا۔

پلگرم پاس ہر عازم حج کے لیے پلگرم پاس (حج پاسپورٹ) حاصل کرنا ضروری ہے جو بمبئی میں حج کمیٹی کے دفتر سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ عازمین حج کی سہولت کی خاطر پلگرم پاس اور دیگر خدمات کی فیس مبلغ ۱۴ روپے فی حاجی، حج کمیٹی کے حق میں کرایۂ جہاز کے ساتھ ہی وصول کر لی جائے گی۔

جہاز کا کرایہ:- بمبئی، جدہ، بمبئی کے سفر کا کرایہ مندرجہ ذیل ہے۔ صرف واپسی ٹکٹ جاری کیے جائیں گے

فرسٹ کلاس	کرایہ مع خوراکی	محاصلی خدمات جدہ کرنسی	پلگرم پاس و دیگر خدمات کی فیس	مجموعی رقم
بالغ	۲۲۱۰ روپے	۱۳۹ روپے	۱۴ روپے	۲۳۶۳ روپے
بچے ۳ سے ۵ سال	۱۱۰۵ روپے	-	۱۴ روپے	۱۱۱۹ روپے
بچے ۱ سے ۳ سال	۹۵۷ روپے	-	۱۴ روپے	۹۷۱ روپے

بمبئی میں بکنگ کے وقت فرسٹ کلاس کے ہر عازم کو مجموعی کرایہ کے علاوہ فرسٹ کلاس کے کرایہ کی پندرہ فی صد مزید رقم فارن ٹراویل ٹیکس کے لیے ادا کرنی ہوگی۔

اسپیشل ڈیک کلاس (صرف ایم، وی، اکبر، میں) یہ انتظام بالائی ڈیک میں مزید سہولتوں مثلاً آرام دہ بستر اور چھ تا بارہ بستروں کے علیحدہ علیحدہ کمپارٹمنٹ کے ساتھ کیا گیا ہے ـــــــ

	کرایہ مع خوراکی	حاصل ضروریات خرچہ کرایہ مکان	خرچہ پاسپورٹ و دیگر فیس	مجموعی رقم
بالغ	۸۵۰ روپے	۱۳۹ روپے	۱۴ روپے	۱۰۰۳ روپے
بچے ۳ تا ۵ سال	۴۲۵ روپے	-	۱۴ روپے	۴۳۹ روپے
بچے ۱ تا ۳ سال	۳۸۰ روپے	-	۱۴ روپے	۳۹۴ روپے

ڈیک کلاس

بالغ	۸۰۰ روپے	۱۳۹ روپے	۱۴ روپے	۹۵۳ روپے
بچے ۳ تا ۵ سال	۴۰۰ روپے	-	۱۴ روپے	۴۱۴ روپے
بچے ۱ تا ۳ سال	۳۵۵ روپے	-	۱۴ روپے	۳۶۹ روپے
ایک سال سے کم	-	-	۱۴ روپے	۱۴ روپے

سالِ گزشتہ کے جن عازمین کا کرایہ مغل لائن کے پاس جمع ہے وہ اپنے حوالہ نمبر کے اندراج کے ساتھ صرف مزید درکار رقم کا ڈرافٹ روانہ کریں۔

پابندیاں

حکومتِ ہند نے عازمینِ حج کے مفادِ عامہ اور اُن کی بھلائی کے پیشِ نظر بعض پابندیاں عائد کی ہیں، لہٰذا عازمینِ حج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ ان عائد کردہ پابندیوں کو اچھی طرح سمجھ کر درخواست دیں، ورنہ ذیل عازمین کی درخواست ناقابلِ قبول ہوگی۔

الف:- وہ بچے جن کی عمر ۵ اور ۱۴ سال کے درمیان ہوگی

ب ۱- قبل رمضان سفر کرنے والے وہ عازمین جن کے پاس ۱۶۷۰ روپے اور بعد رمضان سفر کرنے والے وہ عازمین جن کے پاس ۱۳۰۰ روپے سے کم رقم ہو۔

ج:- وہ افراد جو گزشتہ ۵ سال یعنی ۱۹۶۸ تا ۱۹۷۲ کے درمیان ہندوستان کے کسی بھی حصہ سے فریضۂ حج ادا کر چکے ہوں۔ ایسے افراد حج بدل پر بھی نہ جا سکیں گے۔

د:- وہ خواتین جنہیں جہاز پر سوار ہوتے وقت ۵ ماہ یا اس سے زائد کا حمل ہو۔

ہ:- درج ذیل بیماریوں اور معذوریوں میں مبتلا افراد

۱- دماغی امراض ۲- تپِ دق یا سِل ۳- قلبی امراض

۴- شدید دمہ ۵- متعدی جذام ۶- دیگر شدید متعدی بیماری یا جسمانی معذوری۔

مشتبہ بیماری یا خاتون کے حمل پوشیدہ کی حالت میں بمبئی میں ان کا طبی معائنہ کیا جائے گا۔ لہٰذا عازمین غلط بیانی سے درخواست نہ دیں۔

درخواست بھیجنے کا طریقہ:- ہر عازم کے لیے لازمی ہے کہ وہ مقررہ درخواست فارم پر ہی درخواست دیں اور ہر درخواست کی دو کاپیاں مکمل خانہ پری کے ساتھ طے شدہ طریقے پر روانہ کرے، نامکمل درخواستیں ناقابلِ قبول ہوں گی۔

طبقات:- درخواستوں کا اندراج درج ذیل طبقوں کے مطابق کیا جائے گا۔

۱- حج ۱۹۷۲ء ویٹنگ لسٹ کی درخواستیں۔

[illegible]

/TTR/ ۲- عازمین حج جنہوں نے پہلے کبھی حج نہیں کیا ہے اور جن کی درخواستیں گزشتہ ۵ سال میں تین بار مسترد ہو چکی ہیں

/TR/ ۳- عازمین حج جنہوں نے پہلے کبھی حج نہیں کیا ہے اور جن کی درخواستیں گزشتہ ۵ سال میں دو مرتبہ مسترد ہو چکی ہیں۔

/R/ ۴- عازمین حج جنہوں نے پہلے کبھی حج نہیں کیا اور جن کی درخواست برائے حج ۱۹۷۲ء نامنظور ہو چکی ہو۔

/F/ ۵- جو درخواستیں مذکورہ بالا طبقات کے تحت نہیں ہوں (پہلی بار)

عازمین حج بطور خاص خیال رکھیں

۱- ایک لفافہ میں مختلف طبقات کی درخواستیں نہ ہوں۔ بالفاظ دیگر ہر طبقہ کی درخواست کے لیے علیحدہ لفافہ اور علیحدہ ڈرافٹ ہونا چاہیے۔

۲- درخواستوں کو فوقیت کے ساتھ اندراج نہیں کیا جائے گا تاوقتیکہ گزشتہ نامنظور درخواستیں حج ۱۹۷۳ء کی درخواست کے ساتھ منسلک نہ کی جائیں۔ اصل مسترد کردہ درخواستوں کی بجائے اُن کے حوالہ نمبر یا دیگر کاغذات بھیجنا غیر مفید ہوگا۔

اگر ایسا نہ کیا گیا تو لفافہ میں بھیجی گئی تمام درخواستوں میں سے جو درخواست سب سے آخری طبقہ کی ہوگی، تمام درخواستوں کو اُسی طبقہ میں شامل کر لیا جائے گا۔

درخواستیں وصول ہونے کی آخری تاریخ

سب کی اطلاع کے لیے اعلان کیا جاتا ہے کہ کمپنی کے دفتر کے کاونٹر پر کوئی درخواست قبول نہیں کی جائے گی۔ تمام درخواستیں مذکورہ بالا طریقے کے مطابق ہر طرح سے مکمل رجسٹرڈ پوسٹ سے روانہ کی جائیں جو کمپنی کے رجسٹرڈ آفس پر ۱۴/اگست ۱۹۷۲ء یا اس سے پہلے پہنچ جانی چاہیے۔ اُس کے بعد پہنچنے والی کوئی درخواست قبول نہیں کی جائے گی۔ اور اُسے بھیجنے والے کو واپس لوٹا دیا جائے گا۔

قرعہ

الف:- اگر کسی بھی ریاست کی کسی بھی طبقہ میں وصول شدہ درخواستیں اُس ریاست کے اُسی طبقہ کے مقررہ کوٹہ سے زائد ہوں تو مطلوبہ تعداد بذریعہ قرعہ لی جائے گی۔

ب:- درخواستیں وصول ہونے کی آخری تاریخ کے تقریباً ایک ہفتہ بعد قرعہ اندازی ہوگی۔ قرعہ اندازی کے فوراً بعد نتیجہ کارڈ لفافہ بھیجنے والے شخص کے پتے پر بھیج دیا جائے گا اور جو درخواستیں قرعہ میں کامیاب نہ ہونگی انہیں جس قدر جلد ممکن ہو ڈرافٹ وغیرہ کے ساتھ لفافہ بھیجنے والے (اور بصورت انتقال نامزد کردہ شخص یا وارث) کو لوٹا دیا جائے گا۔

جہاز اور نام کی تبدیلی:- قبل رمضان کے عازمین حج کو بعد رمضان اور بعد رمضان کے عازمین کو قبل رمضان میں قطعی طور پر تبادلہ نہیں دیا جائیگا تاہم بعد رمضان کے ایک جہاز سے دوسرے جہاز کے تبدیلی کی درخواست پر صرف غیر معمولی حالات میں

غور کیا جائے گا۔ مگر تبادلہ کی درخواست کے ساتھ عارضی قیمت پیش کرنا ضروری ہوگا۔ عازمین حج خیال رکھیں کہ نام یا اشخاص کے تبدیلی کی قطعاً اجازت نہیں دی جائے گی۔

درخواست فارم:- حج ۱۹۷۳ء کے لیے درخواست فارم صرف عازمین حج کو بلا قیمت مغل لائن مہیا کرتی ہے۔ اس لیے عازمین حج کو چاہیے کہ حج ۱۹۷۳ء کے لیے چھپے ہوئے نئے فارم کا استعمال کریں۔ یہ بات خاص طور سے یاد رکھنی چاہیے کہ فارم مہیا کرنے، درخواستیں اور کرایہ کی رقم قبول کرنے یا اسی طرح کا کوئی کام انجام دینے کے لیے مغل لائن نے اپنی کوئی شاخ، نمائندہ یا ایجنٹ مقرر نہیں کیا ہے۔

عدالتی کارروائی:- حج کے مذکورہ بالا طریقے کے سلسلہ میں کوئی تنازعہ پیدا ہونے کی صورت میں عدالتی کارروائی کا اختیار صرف شہر بمبئی ہی کی عدالتوں کو ہوگا۔

مندرجہ بالا عبارت مغل لائن کے اعلامیہ برائے حج ۱۹۷۳ء کا اختصار ہے۔ مکمل تفصیلات اور درخواست فارم کے لیے لکھیے۔

دی مغل لائن لمیٹڈ ٹیلیگرام:- "مغل بمبئی"

۱۶ بینک اسٹریٹ فون:- ۲۵۶۸۳۵

فورٹ بمبئی نمبر ا ٹیلیکس:- ۳۰۴۹-۱۱۰

اہل علم کے لیے چار نادر تحفے

۱۔ تفسیر روح المعانی:- جو ہندستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ قسط وار شائع ہو رہی ہے قیمت مصر وغیرہ کے مقابلے میں بہت کم یعنی صرف تین سو روپے

آج ہی مبلغ دس روپے پیشگی روانہ فرما کر خریدار بن جائیے اب تک ۱۴ جلدیں طبع ہو چکی ہیں باقی ۶ جلدیں جلد طبع ہو جائیں گی۔

۲۔ تفسیر جلالین شریف:- مکمل مصری طرز پر طبع شدہ حاشیہ پر دو مستقل کتابیں (۱) لباب النقول فی اسباب النزول للسیوطیؒ (۲) معرفۃ الناسخ والمنسوخ لابن الحزمؒ قیمت مجلد ۲۰ روپے

۳۔ شرح ابن عقیل:- الفیہ ابن مالک کی مشہور شرح جو درس نظامی میں داخل ہے۔ قیمت مجلد ۲۰ روپے

۴۔ شیخ زادہ حاشیہ بیضاوی سورۂ بقرہ تین جلدوں میں شائع ہو رہا ہے۔ پہلی جلد آ چکی ہے۔ نمونہ طلب فرمائیے۔

پتہ:- ادارہ مصطفائیہ دیوبند ضلع سہارنپور

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

ندوۃ المصنفین دہلی

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کراکر دفتر برہان سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب
سعید احمد اکبر آبادی

برہان

جلد ۶۹ | ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ مطابق اگست ۱۹۷۲ء | شمارہ ۲

فہرست مضامین

نظرات

۱- اردو کے معاملات و مسائل (۳) — سعید احمد اکبر آبادی — ۷۴

مقالات

۲- علی گڈھ مسلم یونیورسٹی (۲) — " " " " — ۸۳

۳- حافظ زکی الدین المنذری — جناب مولوی محمد عبداللہ صاحب رفیق، رفیق ندوۃ المصنفین دہلی — ۹۹

۴- عہد تاناشاہ کا ایک گمنام شاعر — جناب ڈاکٹر نورالسعید صاحب اختر بمبئی — ۱۱۶

۵- مولانا ابوالکلام آزاد (ایک جائزہ) — جناب مولوی محمد شعیب صاحب عمری بنگلور — ۱۳۰

ادبیات و تبصرے

۶- ادبیات (غزل) — جناب شمیم غفانی صاحب — ۱۳۸

۷- تبصرے — س - ع — ۱۳۹

نظرات

اُردو کے معاملات و مسائل

(۳)

مرکز میں ترقی اُردو بورڈ، اور اتر پردیش میں اردو اکاڈمی، اُردو زبان و ادب کو فروغ دینے اور علمی و ادبی حیثیت سے ان کو ترقی دینے کے لیے قایم ہوئے ہیں، اس سے قطع نظر کہ ان اداروں نے اب تک کیا کام کیا ہے؟ اور جن حضرات پر یہ ادارے مشتمل ہیں، ان کی گزشتہ زندگی کی بے علمی اور آرام طلبی کے پیشِ نظر ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے؟ حکومت کا یہ اقدام فی نفسہٖ مستحسن ہے۔ اسی طرح پچھلے دنوں حکومت کی طرف سے اردو کی ترقی اور اس کی مشکلات پر غور و خوض کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا ہے، جس کے ارکان سولہ افراد ہیں یہ آٹھ یا سات سرکاری اور باقی غیر سرکاری۔ اس کمیٹی نے ادب، صحافت اور تعلیم وغیرہ سے متعلق چار ذیلی کمیٹیاں بنائی ہیں، جو اپنی سفارشات مرتب کریں گی۔ اس کمیٹی نے جو وزیر مملکت شری اندر کمار گجرال کی صدارت میں ہونے کے باعث گجرال کمیٹی کے نام سے معروف ہے اردو کے ارباب فکر و نظر سے وہ تجاویز طلب کی ہیں جو ان کے نزدیک اردو کی ترقی کے لیے ضروری ہیں پہلے ان سفارشات اور تجاویز کے پہنچنے کی آخری تاریخ ۱۵ر جون تھی۔ ان سطور کی تحریر کے وقت توسیع کرکے ۱۵ر جولائی تک اسے بڑھا دیا گیا ہے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے "الغریق یتشبث بکلِ حشیش" اُردو میں اس کا ٹھیٹ ترجمہ: ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی اسی طرح مشہور ہے۔ اسی مثل کے مطابق مرکزی حکومت یا ریاستی حکومت کی طرف سے اس قسم کا جو اقدام بھی ہو اس کے ساتھ اردو والے کا پر خلوص جذبات

کرنا چاہیے۔ لیکن اس کم گستری پر اُردو کہہ سکتی ہے ؎

چلے ہیں بہرِ پرسش وہ لبِ مرگ   تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

حقیقت یہ ہے کہ جب تک اردو زبان قانونی حیثیت سے علاقائی زبان نہیں بنتی اور اس بنا پر جب تک اردو والوں کا احساسِ کمتری نہیں دور ہوتا اور ان کے ساتھ دفتری اور حکومتی معاملات میں جو امتیاز اور تعصب برتا جاتا ہے وہ ختم نہیں ہوتا۔ اس وقت تک آپ کروروں روپیہ خرچ کر کے سینکڑوں کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرڈالیے۔ بڑے بڑے لغات تیار کر دیجیے۔ اُردو کے مصنفوں اور ادیبوں پر اپنی نوازشات کی بھرمار کر دیجیے۔ ان سب کا یہ فائدہ ضرور ہو گا کہ اردو زبان کے لٹریچر میں وسعت پیدا ہو گی۔ اور اس کے ذخیرۂ ادبیات میں اضافہ ہو گا۔ لیکن جب تک خود زبان کی جڑیں اس ملک میں مضبوط نہ ہوں گی اور ایک چھوٹے سے علاقہ سے بھی محروم ہونے کے باعث اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی رہے گی۔ اردو زبان میں کتابوں کے اس انبار کی حیثیت وہی ہو گی، جو عربی، فارسی یا فرنچ اور جرمنی میں کتابوں کی ہو سکتی ہے یہی وہ احساس ہے جس کے باعث حکومت کی طرف سے بلند بانگ دعاوی کے باوجود ان اداروں کا ملک میں خاطر خواہ خیر مقدم نہیں ہو رہا ہے اور اردو کے حلقوں میں اس نوع کی خبروں کو لوگ سنتے بھی ہیں تو اس طرح گویا ایک شخص نے ان کی تمام مال و متاع چھین لی ہے اور اب اس کے ضمیر نے ملامت کی تو تلافی مافات کے لیے اسے کچھ دلاسا دے رہا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ادارے وہ خواب آور گولیاں ہیں جن کے ذریعے حکومت اردو کے اصل معاملہ کی طرف سے لوگوں کو غافل کرنا چاہتی ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے آرگن ہماری زبان میں لکھتے ہیں۔

"اردو کا مسئلہ کمیٹیوں، اکیڈمیوں اور بورڈوں کے قیام سے حل نہیں ہو گا۔ یہ سب طفل تسلیاں ہیں، حکومتِ ہند اردو کے بارے میں کوئی پروگرام نہ رکھتی اور نہ غالباً

رکھنا چاہتی ہے۔ اُردو کا بنیادی مسئلہ ایک اقلیت کی زبان کی مرکزی حیثیت کے تعین اور اس کے نظامِ تعلیم کی تنظیم کا مسئلہ ہے۔" اس اصل مسئلہ کی طرف سے پہلو تہی برتنے کے باعث اردو کی حالت کس درجہ ناگفتہ بہ ہو گئی ہے اس کی دردبھری داستان موصوف کی ہی زبان سے سنیے۔ لکھتے ہیں:۔ "پچھلے چند سال میں اردو کا مسئلہ ایک بحرانی دور میں داخل ہو چکا ہے۔ آزادی کے پچیس برس اردو کے لیے ستم قاتل ثابت ہوئے ہیں۔ اس کا تعلیمی نظام درہم برہم ہو چکا ہے اس کی نئی نسل کی زبان بدل چکی ہے یا بدل رہی ہے۔ اس عبوری دور میں اردو گھرانہ کا بچہ اچھی طرح نہ ہندی سے واقف ہے نہ اردو سے اور نہ انگریزی سے۔ وہ اپنی قوتِ اظہار کھو چکا ہے اور نتیجۃً ذہنی صلاحیتیں بھی موجودہ نسل ایک گونگی بہری نسل ہے، چالیس سال سے اوپر کی نسل اب تک اردو کا علم بلند کیے ہوئے ہے۔ لیکن ان کے بھی بہت سے کفن بردوش، زیرِ کفن ہونے جا رہے ہیں کچھ مذہب میں پناہ تلاش کر رہے ہیں۔ شاعر ہے تو اسے سامع نہیں ملتا۔ ادیب و ناشر ہے تو اسے قاری نہیں ملتا۔ طالب علم کو کتاب نہیں ملتی۔ قلم کار کو انعام مل جاتا ہے طرفدار نہیں ملتا۔"

پروفیسر مسعود حسین خاں نے اردو کی موجودہ زبوں حالی اور ابتری کی بڑی بلیغ عکاسی کی ہے اس تیرہ تاریک ماحول میں اُردو کا دم گھٹا جا رہا ہے اور وہ مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کی زبان سے کہہ رہی ہے ؎

اے دل یہ سُلگنا کیا، جلنا ہے تو جل بھی اُٹھ

دم گھٹنے لگا ظالم کیا دُھونی رَمائی ہے

تنگ آمد بجنگ آمد کے مطابق موصوف اپنے مضمون کا خاتمہ ان لفظوں پر کرتے ہیں۔

" اہلِ اُردو کے سامنے اب دو ہی راستے ہیں۔ تحریک یا تخریب! بہر صورت اپنی نئی پود کے ذہن میں ایک نہ ایک زبان دینا ہے۔ اسے زیادہ عرصہ تک گونگا بہرہ نہیں رکھا جا سکتا۔ جلد فیصلہ کیجیے یہ یا وہ؟ ؏

وقت برہنہ گفتن ست من بہ کنا یہ گفتم

(ہماری زبان مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۶۲ء)

اس مقالہ کے ایک ماہ بعد ہماری زبان (مورخہ ۲۲ جون ۱۹۶۲ء) میں ہی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اور اُردُو کے زیرِ عنوان فاضل موصوف نے جو گرانقدر مضمون لکھا ہے اس میں پھر لکھتے ہیں۔

"یو. پی اور بہار کی ریاستی سرکاروں کی اردو نواز پالیسی کی بدولت اردو نظام تعلیم کا جو حشر ان ریاستوں میں ہوا ہے اس سے ہر اردو گھرانہ واقف اور متاثر ہے پچھلے پچیس سال میں اُردُو کے لاکھوں بیٹوں اور بیٹیوں کو ان کی مادری زبان سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اُردُو والوں کی کوئی ایسی سیاسی تنظیم بھی نہیں جس کا دباؤ پڑ سکے اور دوم درجہ کے سیاست داں صرف سیاست کی زبان سمجھتے ہیں۔ قومی نقطۂ نظر یا مفاد ان کے اُفقِ ذہن سے کوسوں دور ہے چنانچہ اردو کی ترقی کے نام پر وہ سب کچھ کیا جارہا ہے جو نہ کرنے سے عبارت ہے۔ اس کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کی تنظیم سے قبل اس میں مختلف علوم پر کتابیں لکھوانے کے لیے ایک ایسا بورڈ قائم کر دیا گیا ہے جسے نہ اپنی حدِ اکبر کی خبر ہے اور نہ حدِ اصغر کی جب اردو میں یونیورسٹی سطح کی کتابوں کی تیاری لاحاصلی کا احساس ہوتا ہے تو اپنے حدودِ تفویض کے برا‌عظم منظور شدہ رقم کا معتد بہ حصہ بچوں اور بالغوں کی کتب کے لیے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ اکیڈمیاں بنائی جاتی ہیں۔ جن کی کارگزاری انعامات عطا کرنے اور کتابیں بانٹنے تک محدود رہتی ہے۔ کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں جن کی سعی لاحاصل چند ایسی سفارشات کی شکل اختیار کرتی ہے۔ جن پر غور کرنا مقصود ہی نہیں ہوتا۔"

ان سب لاحاصل اور بے نتیجہ اردو نوازی کے بجائے جو اصل کام کرنے کا ہے اس کے متعلق موصوف لکھتے ہیں:۔

اردو کے سلسلہ میں نہیں کام ہوتا تو یہ نہیں ہوتا کہ اس کس مپرسی کی قانونی اور سرکاری حیثیت کا تعین دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے مطابق صدر جمہوریہ کے ایک اعلامیہ کے ذریعہ کر دیا جائے اس اعلامیہ کے بعد ہی ریاستی حکومتیں اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں گی اور انہیں قانونی طور پر اس کے نظام تعلیم کی تشکیل کرنا پڑے گی، وزارتِ تعلیمات میں اردو کے شعبے کھولنا پڑیں گے اور اردو کے اداروں کو درسی کتابوں اور اساتذوں کی فراہمی کے احکامات جاری کرنا ہوں گے:

اس قیمتی اور حقیقت افروز مضمون کا آخری پیراگراف اور سن لیجیے لکھتے ہیں :-

"بدقسمتی سے اس وقت ہمارے ملک کی سیاست اور معیشت محض "نعروں" اور "لہروں" کے سہارے چل رہی ہے، میرے خیال میں ہماری جمہوریت کے لیے سب سے خطرناک رجحان آمریت کی وہ زریں لہر ہے جو چور دروازوں سے داخل ہو کر ہم سے ہمارے حقِ احتجاج کو چھین لینا چاہتی ہے اور اپنی سہولت کے مطابق مختلف ٹھپے لگا کر ہمارے مستند افراد کو، اداروں کو اور تحریکوں کو مذموم (؟) کرنے پر تلی ہوئی ہے جی دھڑکتا ہے کہ کسی دن اہلِ اردو کی مانگوں کو بھی لسانی ظلمت پسندی سے موسوم نہ کر دیا جائے۔

"دروغ راست نمائے کہ داشتی داری"

پروفیسر مسعود حسین خاں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک ایک لفظ حقیقت و واقعیت کا آئینہ دار ہے۔ لیکن ہم کو جس امر کا بے حد افسوس اور قلق ہے وہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں سارا الزام حکومت کے سر عائد کر دیا جاتا ہے اور اردو کے نقیب کبھی ایک لمحہ کے لیے گریبان میں منہ ڈال کر یہ نہیں دیکھتے کہ اردو کو اس کا طبعی حق دلانے کے لیے انھیں جو کرنا چاہیے تھا۔ وہ انھوں نے کیا یا نہیں ؟ مرکزی وزیر جناب فخرالدین احمد صاحب نے چند ماہ ہوئے، دہلی میں جمعیۃ علمائے ہند کی سالانہ کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے بالکل صحیح کہا تھا کہ ہاں بے شک حکومت اب تک اردو کے لیے وہ نہیں کر سکی ہے

جائے کرنا چاہیے تھا۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ آپ لوگوں نے بھی اردو کے واسطے وہ نہیں کیا جو آپ کا فرض تھا۔

وزیر موصوف نے اس کی تشریح تو نہیں کی کہ اردو کے لیے کیا کرنا چاہیے تھا۔ لیکن ہم کو اس میں ذرا شبہ نہیں ہے کہ اگر آج اردو تحریک زندہ ہوتی۔ فعال اور متحرک ہوتی اور اس کو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے گزشتہ ربع صدی میں جو کچھ کرنا چاہیے تھا وہ کرتی تو آج اردو کا معاملہ صرف مسلمانوں کا نہ ہوتا۔ بلکہ ایک نہایت اہم قومی اور ملکی معاملہ ہوتا۔ یہ صرف ایک زبان کا مسئلہ نہ ہوتا۔ بلکہ ایک قومی تہذیب کا مسئلہ ہوتا اور قرینۂ غالب یہ ہے کہ چونکہ آج مرکزی حکومت جس درجہ مستحکم اور مضبوط ہے اور اس کے اقتدار اور سطوت کا یہ عالم ہے کہ نہایت سخت سے سخت اقدام کرتی ہے اور اس میں کامیاب رہتی ہے رائے عامہ اس کا ساتھ دیتی ہے۔ جن سنگھ ایسی دو چار جماعتیں اس کی مخالفت کرتی ہیں۔ لیکن ملک میں اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور آخر کار کچھ دن شور و غل مچا کر وہ خاموش ہو کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اس بنا پر اگر ملک میں اردو تحریک نے اردو کے لیے قومی سطح پر ایک مناسب فضا پیدا کر دی ہوتی تو آج حکومت کو اردو کا حقِ طبعی دینے پر رضامند کر لینے میں زیادہ دشواری نہ ہوتی جکومت کی مخالفت ہی جن لوگوں کا دین اور ایمان ہے وہ بے شبہ چیختے چلاتے اور شور مچاتے لیکن حکومت کو ان کی پروا نہ ہوتی اور وہ یہ اقدام کر گزرتی۔ اگر خدا نخواستہ موجودہ حکومت کے دور اقتدار میں بھی اردو کو اس کا حق نہیں ملا تو پھر کبھی ملے گا بھی یا نہیں؟ اس کی پیش گوئی کوئی نہیں کر سکتا۔

اردو کے نام پر چھوٹی بڑی بہت سی تحریکیں پیدا ہوئیں اور فنا ہو گئیں لیکن اردو تحریک کی سب سے بڑی ذمہ داری انجمن ترقی اردو (کل ہند) کے سر عائد ہوتی ہے۔ یہ انجمن جو ۱۹۰۶ء میں قائم کی گئی تھی، درحقیقت اردو زبان میں علمی اور ادبی کتابوں کی

اشاعت کا ایک ادارہ بھی تھی اور ساتھ ہی ــ بلکہ اس سے زیادہ ــ اردو تحریک کا ایک مرکز بھی۔ دنیا جانتی ہے، مولوی عبدالحق نے اپنی شب وروز کی مصروفیت، ایثار وقربانی، محنت ومشقت اور جرأت وجسارت سے اس انجمن کے دونوں مقاصد کی کس طرح تکمیل کی اور اسے کس طرح تحت الثریٰ سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا۔ تقسیم کے بعد اردو کے مسائل ومعاملات نہایت پیچیدہ اور ابتر ہو گئے تھے اور اب ضرورت تھی کہ "نوا را تیز ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی" کے مطابق انجمن کو پھر کوئی اور عبدالحق ملتا جو انجمن کو پہلے سے زیادہ متحرک اور فعال بناتا۔ بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ تقسیم کے بعد بھی انجمن نے اپنا علمی اور ادبی وقار قائم رکھا چنانچہ اس کی طرف سے اچھی اچھی کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اگرچہ ان میں بھی صحت کا اہتمام خاطر خواہ نہیں ہوتا اور کتابت وطباعت کی افسوسناک غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ اس کا پندرہ روزہ آرگن اور سہ ماہی "اردو ادب" بھی معیاری ہیں لیکن انجمن اردو تحریک کے میدان میں کچھ نہ کر سکی۔ کسی تحریک کو چلانے کے لیے ابتدائی شرط یہ ہے کہ اس کی شاخیں ہوں اور مرکز کے ساتھ ان کا رابطہ قائم ہو یہاں یہ عالم ہے کہ متعدد مقامات پر تو اب تک کوئی شاخ ہی قائم نہیں اور جہاں تھوڑی بہت کچھ شاخیں ہیں بھی تو ادل تو ان کو مرکز کے ساتھ کوئی خاص ربط نہیں ہے اور پھر حیدرآباد وغیرہ دو چار جگہوں کی شاخوں کو مستثنیٰ کر کے کوئی ایک شاخ بھی سرگرم عمل اور پرجوش نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے سب پر بھیونڈچی ہوئی ہے اور ظاہر ہے جب مرکز ہی بیجان اور آسودۂ عمل ہو تو شاخوں سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔ برسوں سے انجمن کی سالانہ کانفرنس بھی نہیں ہوئی ہے اردو تحریک کا بڑا کام یہ ہونا چاہیے تھا کہ اردو کے مسئلہ کو (صرف مسلمانوں کا نہیں) ایک قومی مسئلہ کی طرح زیادہ سے زیادہ قوت کے ساتھ پیش کیا جاتا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ کانگریس کے علاوہ ملک کی دوسری سیاسی جماعتوں سے بھی ربط قائم ہوتا اور ربط

ان سب کی حمایت اور اعانت اردو کاز کے لیے حاصل کی جاتی۔ پھر اردو کے تعلیم بالغان کا بندوبست پورے ملک میں ہوتا۔ بچوں اور بچیوں کو اردو سکھانے کی آسان کتابیں کثرت سے شائع ہوتیں۔ نصاب کی کتابوں کی فراہمی۔ اساتذہ کا بندوبست اردو پرائمری مدارس کا قیام اور ان کا نظم ونسق فلم انڈسٹری سے ربط وضبط۔ سیاسی جوڑ توڑ :- اردو اخبارات کی توسیع اشاعت اردو ٹائپ کے اعلیٰ انتظامات۔ انگریزی اور ہندی کے اخبارات ورسائل میں اردو زبان وادب اور اردو کے مسائل ومعاملات پر کثرت سے مضامین شائع کرنا۔ ہندی اور ملک کی دوسری زبانوں سے اردو کے علائق وروابط قائم کرنا غرض کہ یہ اور اس کے علاوہ اور بہت سے کام ہیں جو اردو تحریک کے اجزا ہیں۔ انجمن ترقی اردو ان میں سے کوئی ایک کام بھی قابل ذکر طور پر نہیں کر رہی ہے اور عملاً صرف ایک ادارۂ نشر واشاعت ہو کر رہ گئی ہے۔ ہائے غضب۔ راقم الحروف کی ایک غزل کا شعر ہے :- ؎

گزری ہی نہیں جیسے کوئی سر پہ قیامت
یوں لب بہ سئے بیٹھے ہیں نہ شکوہ نہ شکایت

ہمارے ہاں عام قاعدہ یہ ہے کہ اس طرح کے جماعتی کاموں کی ابتری اور زبوں حالی کی ذمہ داری تنہا ایک شخص کے سر ڈال دی جاتی اور اس کو ہی مسئول قرار دیا جاتا ہے یہ بات اصولاً غلط ہے۔ جب وہ باقاعدہ ایک تنظیم ہے تو اس کے کاموں کی مسئولیت بھی تنظیم کے جملہ ارکان واعضاء پر عائد ہوتی ہے سخت حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ آج تک اردو کے ان ارکان واساطین کو یہ کیوں محسوس نہیں ہوا کہ —

(۱) مرکزی انجمن کا دفتر علی گڑھ میں ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ جہاں کی آب وہوا جذبۂ عمل اور ولولۂ کارکو راس نہیں آتی۔

(۲) انجمن کا سکریٹری اس شخص کو ہونا چاہیے جو بالکل آزاد ہو جری اور بیباک ہو

اور جو چوبیس گھنٹے انجمن کے کام کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہ کرے۔
(۳) انجمن کا سکریٹری آزیری نہ ہو بلکہ معقول اور حسب حیثیت مشاہرہ پر ملازم ہو۔
(۴) اس کے پاس اتنا فنڈ ہونا چاہیے کہ وہ پورے ملک کا دورہ کرتا رہے۔
(۵) اس کو اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی کا بھی ادیب اور انشا پرداز ہونا چاہیے۔

(۶) سکریٹری کے ساتھ کم از کم پانچ پانچ سو روپیہ ماہوار پر دو اور شخص ہونے چاہئیں جو علمی اور ادبی کاموں کے ساتھ تحریک کے کاموں میں بھی اس کے مدد معاون ہوں جیسے مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ پنڈت دتاتریہ کیفی اور سید ہاشمی فرید آبادی تھے۔ اگر اب تک انجمن کا کام اس نہج پر ہوا ہوتا تو کوئی شبہ نہیں آج اردو کا کام بہت سہل ہو گیا ہوتا اور وہ وقت آ گیا تھا جب اندرا جی کی قیادت میں حکومت اردو کو اس کا حق دینے کا فیصلہ کر دیتی اور ہمارے نزدیک فخرالدین احمد صاحب نے اردو والوں کی اسی کوتاہی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اب اگر یہ کام نہیں ہوا تو یہ ماتم فقط ایک انجمن اور اس کے اعیان و ارکان کا ماتم نہیں ہے بلکہ یہ ماتم ہے اس بدنصیب قوم کا جو دنیا بھر میں شور مچاتی رہتی ہے اردو یونیورسٹی کے خواب میں بدمست رہتی ہے لیکن جو کام کرنے کا ہے اس کی طرف دھیان نہیں دیتی اس نے گورنمنٹ کی گرانٹ پر انجمن کے زندہ رہنے پر قناعت کر لی اور خود کبھی پلٹ کر نہیں پوچھا کہ انجمن کا اصل کام کیا ہونا چاہیے اور یہ کام کس طرح انجام پذیر ہو سکتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ اردو کا مسئلہ مسلمان جماعتوں کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گیا اور اس سے اردو کاز کو نقصان پہنچا۔ اب حکومت اردو کے لیے جو کچھ کر رہی ہے وہ نیم شعوری طور پر اس کو خالص مسلمانوں کا معاملہ سمجھ کر کر رہی ہے۔ اس صورتِ حال نے سلجھانے کے بجائے معاملہ کی اصل پوزیشن کو کمزور بنا دیا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۲)

سعید احمد اکبر آبادی

سرسید کے حالات وسوانح کا مطالعہ جس شخص نے بھی کیا ہے وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سرسید میں دو وصف خاص طور پر تھے۔ ایک یہ کہ وہ ہر معاملہ میں انتہا پسند تھے۔ یعنی جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتے تھے تو ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ چیز اعلیٰ سے اعلیٰ ہو۔ کسی درمیانی درجہ پر قناعت کرنا ان کی فطرت اور طبیعت کے خلاف تھا اور دوسرے یہ کہ ان کی طبیعت میں ضد اور ہٹ بھی تھی[۱]۔ جب وہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لیتے تھے تو اب کوئی لاکھ ان کی مخالفت کرے ان کو مطلق پروا نہیں ہوتی تھی اور وہ اپنے ڈگر پر قائم رہتے تھے۔ یہ دونوں وصف محمود بھی ہیں اور مذموم بھی۔ اگر ان کا تعلق کسی ایسی چیز سے ہو جو فی نفسہٖ اچھی ہو اور اس کے نتائج بھی اچھے نکلیں تو یہ محمود ہیں ورنہ مذموم! عجیب بات ہے، سرسید کی زندگی میں ان وصفوں کے محمود اور مذموم دونوں ہی رخ نظر آتے ہیں، اور غالباً یہ انھیں کی خصوصیت نہیں دنیا کے ہر بڑے انسان کا جوہرِ طبیعت ہی ایسا ہوتا ہے۔

---

[۱] اس کا اعتراف مولانا حالی نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: "بےشک کالج کے اندرونی انتظامات میں بہت سی باتیں قابلِ اعتراض موجود ہیں جن کو سرسید کی خودرائی اور ضد اور ہٹ کا نتیجہ کہا جاتا تھا اور کچھ شبہ نہیں کہ لوگوں کا یہ کہنا بالکل غلط نہ تھا (حیاتِ جاوید حصہ دوم ص ۸۳)

کالج میں انگریز اساتذہ | چنانچہ جب سرسید نے یہ طے کر لیا کہ (۱) کالج میں انگریزی علوم جدیدہ کی تعلیم کا اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام کرنا ہے اور (۲) مسلمان نوجوانوں کو حکومت کے دفاتر میں کھپانے کی غرض سے حکومت کا زیادہ سے زیادہ اعتماد حاصل کرنا ہے تو اب ایک طرف تو انھوں نے کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد ۸ر جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن کے ہاتھوں رکھوایا۔ جو اس زمانے میں وائسرائے تھے اور اس موقع پہ سرسید نے جو ایڈریس پیش کیا اس میں فرمایا۔ ہمارے راستہ میں جو دشواریاں حائل ہی ہیں اور اس میں ہم نے جو کامیابی حاصل کی ہے اس کے پیش نظر ہم کو یقین ہے کہ ہم انگریزی کی حکومت سے اور خود اپنے ہم وطنوں سے بھی وہ امداد اور تائید حاصل کرتے رہیں گے جن کے باعث یہ کالج ایک دن یونیورسٹی میں تبدیل ہو جائے گا اور اس یونیورسٹی کے فرزند آزاد تحقیقات، وسیع القلب رواداری اور بے میل اخلاق کا وعظ ملک کے طول و عرض میں کہتے پھریں گے۔

اور دوسری جانب انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ کالج میں ایک معقول تعداد یورپین اساتذہ کی بھی رہے گی جن کو بیش قرار تنخواہ کے علاوہ تمام سہولتیں میسر ہوں گی۔ جو یورپین طریق زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ چنانچہ کالج کے اسٹاف میں (ہیڈ ماسٹر کی جگہ کو بھی شامل کر کے) یورپین اساتذہ میں جو نام نمایاں نظر آتے ہیں وہ یہ ہیں۔ پرنسپل بیک، پروفیسر ماریسن۔ پروفیسر آرنلڈ۔ پروفیسر والس، مسٹر ہوسٹ، مسٹر ڈینٹن۔

سرسید کی دوراندیشی کی داد دینی چاہیے کہ یورپین اسٹاف سے صرف ایک اعلیٰ تعلیم کا فائدہ نہیں تھا۔ بلکہ اس کے ذریعہ گورنمنٹ کا اعتماد بھی حاصل ہوتا تھا ورنہ اس وقت جو حالات تھے اور مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کو جو شکوک وشبہات تھے ان کی وجہ سے بعید نہ تھا کہ انگریز اس کالج کو جس میں مسلمانوں کے مختلف طبقات کے افراد بیک وقت اس کثرت سے مجتمع ہو گئے تھے۔ شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے اور انھیں خیال

ہوتا کہ کالج کہیں انگریزوں کے خلاف کسی تحریک کا مرکز تو نہیں ہے چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے معاملہ میں ایسا ہی ہوا۔ یہ مدرسہ انگریزوں کی نگاہ میں ہمیشہ مشکوک و مشتبہ رہا اور شروع میں اس کے بعض مخالفوں نے انگریزوں کو یہ باور کرانا چاہا کہ مدرسہ میں جہاد کی تعلیم ہوتی ہے اور اس کے تہ خانوں میں برابر ہتھیار چلانا سکھایا جاتا ہے حکومت کی جانب سے متعدد بار اس کی تحقیق و تفتیش بھی ہوئی۔

یورپین اساتذہ کی خدمات حسنہ جیسا کہ آپ کو آئندہ چل کر معلوم ہوگا۔ اگرچہ سرسید کی زندگی کے آخری دنوں میں جب ان کی مخالفت بڑے شدومد کے ساتھ ہوئی تو مخالفت کے وجوہ میں ایک وجہ کالج کا یورپین اسٹاف اور سرسید کا ان پر غیر معمولی اعتماد اور بھروسہ بھی تھا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جہاں تک تعلیم، ڈسپلن اور حسنِ انتظام کا تعلق ہے سرسید کا یہ اقدام نہایت مستحسن، قابلِ ستائش اور بالغ نظری پر مبنی تھا۔ آج بھی جبکہ ہم سو برس آگے بڑھ آئے ہیں۔ ہمارے ملک میں اسی سے اوپر یونیورسٹیاں اور بیسیوں خاص خاص شعبوں میں مہارت اور تخصیص کے ادارے اور انسٹی ٹیوٹ قائم ہیں۔ ہمارے بچے اور بچیاں انگلش اسکولوں میں تعلیم پاتے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ امریکہ یا کناڈا وغیرہ بھیجے جاتے ہیں۔ آج ہمارے ملک میں تعلیم کی ابتری اور طلباء کی بے راہ روی کی جو شکایات عام ہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کے اساتذہ عموماً اپنے مضمون اور اپنے فرائض منصبی سے زیادہ یونیورسٹی کی سیاست اور اپنے ذاتی مفادات و اغراض سے دلچسپی رکھتے اور ان کے شب و روز اسی ادھیڑبن میں گزرتے ہیں۔ نہایت افسوس اور دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مغربی ممالک کا حال بالکل اس کے برعکس ہے وہاں جو کوئی شخص بھی تعلیم کی راہ اور معلمی کا پیشہ اختیار کرتا ہے کسی خارجی دباؤ یا روپیہ کا لالچ یا عہدۂ و منصب کی خواہش کے بغیر محض اپنے ذوق اور علم و تحقیق کے میدان میں تاخت کے شوق اور

دلولہ سے کرتا ہے لیکن بنا بریں وہ فنا فی العلم ہوتا ہے اس میں اخلاص عمل، کردار کی پختگی، اور دنیوی راحت و آسائش اور عہدہ و منصب سے بے نیازی کے اوصاف ہوتے ہیں اس کا شب و روز کا مشغلہ مطالعہ و تحقیق اور طلباء کی نہایت ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ تعلیم و تربیت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا[1] اس بنا پر سرسید نے اگر اس وقت اعلیٰ تعلیم کے

---

[1] مرحوم ہوا ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ سابق پروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی لاہور نے انگلینڈ میں تعلیم ختم کرنے کے بعد لاہور واپس آکر معارف اعظم گڑھ میں ولایت سے متعلق اپنے تاثرات پر ایک مضمون لکھا تھا اس میں انہوں نے ایک موقع پر یہ واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ شام کو میں اپنے استاد پروفیسر آرنلڈ (T.W. ARNOLD) کے یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ بے تکلف بات چیت ہو رہی تھی۔ اچانک پروفیسر آرنلڈ بولے "اچھا عنایت اللہ بتاؤ! اس وقت تمہارے دل میں سب سے بڑی تمنا کیا ہے اس کا جواب فوراً دو سوچنے کی اجازت اور مہلت نہیں ہے"۔ شاگرد نے کہا "میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ میرے پاس اتنی دولت ہو کہ تمام دنیا کی خوب سیاحت کروں"۔ پروفیسر آرنلڈ نے یہ جواب سنا تو ان کا چہرہ اتر گیا، دانتوں میں انگلی دبالی اور بولے "عنایت اللہ مجھ کو تمہارے جواب سے بڑا دکھ ہوا ہے تم کیسے طالب علم ہو جو دولت کی تمنا کرتے ہو، ایک حقیقی طالب علم کی سب سے بڑی تمنا اور آرزو تو علم میں ترقی ہی ہونی چاہیے۔ یہ پروفیسر آرنلڈ وہی بزرگ ہیں جو سرسید کے زمانہ میں محمڈن کالج میں فلسفہ کے پروفیسر تھے، ان کی متعدد نہایت دقیع تصنیفات کے علاوہ دی پریچنگ آف اسلام جس کا اردو ترجمہ سرسید کے حکم سے محمد عنایت اللہ صاحب دہلوی نے دعوتِ اسلام کے نام سے کیا تھا، ایک نہایت بلند پایہ اور تاریخ ساز کتاب ہے انہوں نے علی گڑھ میں مولانا شبلی سے عربی اور مولانا شبلی نے ان سے فرنچ پڑھی تھی، علی گڑھ سے منتقل ہو کر جب لاہور گورنمنٹ کالج میں چلے گئے تو وہاں ڈاکٹر اقبال ان کے شاگرد رہے، انھیں پروفیسر آرنلڈ کا ایک حد درجہ سبق آموز واقعہ مولانا شبلی نے اپنے سفرنامہ مصر و روم و شام میں لکھا ہے، اسے بھی سن لیجیے، شاید کوئی عبرت ہو۔ پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی دونوں ایک جہاز سے سفر کر رہے تھے، عدن کے قریب ایک مقام پر جہاز کو (جرمنی کے جہاز ایمڈن کے نظر آجانے کے باعث) شدید خطرہ لاحق ہو گیا، مسافروں کے اوسان خطا ہو گئے، اس حالت میں مولانا شبلی بھاگے ہوئے پروفیسر آرنلڈ کے کیبن میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں مصروف بڑے

(باقی ص۱ پر)

لیے یورپین اساتذہ کی خدمات کو حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تو کوئی شبہ نہیں ان کا یہ فیصلہ غایت درجہ کی حقیقت پسندی عالی ہمتی اور بلند نظری پر مبنی تھا اور اس سے کالج کے مقاصد کی تکمیل باحسن وجوہ ہوئی۔ اس زمانہ میں کالج کے حالات کا مبصر اور اس کے اچھے بُرے کا ناقد مولانا حالی سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ جو بیش قرار تنخواہیں یورپین عہدہ داروں کو دی جاتی ہیں وہ کالج کی مالی حیثیت سے زیادہ معلوم ہوتی ہیں لیکن حق یہ ہے کہ یورپین اسٹاف نے اس ضرورت کو بخوبی ثابت کر دیا ہے جس کی بنا پر سر سید نے ان کو کالج کا جزوِ اعظم قرار دیا ہے وہ باوجود قومی مذہبی اور ملکی مغایرت کے محمڈن کالج کو اپنا قومی انسٹیٹیوشن سمجھتے ہیں وہ اپنے طلباء کے ساتھ مشفقانہ اور برادرانہ برتاؤ رکھتے ہیں ان کی دعوتوں اور پارٹیوں میں ان کی مجلسوں اور مباحثوں میں خود بھی شریک ہوتے ہیں . . . . اور ان کا حوصلہ بڑھاتے ہیں . . . . وہ طرح طرح سے ان کو غیرت دلاتے ہیں اور ان کی عظمت کے نتائج سے ان کو خبردار کرتے ہیں۔ وہ اپنی عمدہ خصلتوں،

اطمینان سے کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہیں مولانا کو سخت حیرت ہوئی۔ پوچھا کیا آپ کو خبر نہیں ہے کہ ہمارا جہاز خطرہ میں ہے۔ پروفیسر آرنلڈ نے کہا۔ جی ہاں۔ مجھے اس خطرہ کا علم ہے۔ مولانا بولے تو پھر اس کے باوجود یہ اطمینان! پروفیسر آرنلڈ بولے مولوی شبلی! اس وقت ہم جس حالت میں ہیں اس کے انجام دو ہیں ایک ہی بات ہو سکتی ہے۔ یا تو یہ خطرہ ٹل جائے گا اور جہاز اس سے صحیح سلامت باہر نکل آئے گا اور یا جہاز تباہ و برباد ہو جائے گا اور ہم سب مر جائیں گے۔ اگر پہلی صورت مقدر ہے تو پھر خواہ مخواہ پریشان ہونے سے کیا فائدہ اور اگر بصورتِ دیگر تقدیر میں مرجانا ہی لکھا ہے تو عمر عزیز کے جو یہ چند لمحات باقی ہیں انہیں کیوں نہ کسی بہتر کام میں صرف کیا جائے۔ اور ظاہر ہے کتاب کے مطالعہ سے زیادہ بہتر کام اور کون ہو سکتا ہے!؟؟

شائستہ عادتوں، فرائض کی پابندی، صفائی، ضبط اوقات اور دیگر خوبیوں سے طالب علموں کے کیرکٹر پر نہایت قوی اور پائیدار اثر پیدا کر رہے ہیں جو کسی اور طریقہ سے پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ غریب طالبعلموں کی امداد اور تقویت طرح طرح سے کرتے ہیں، بیماروں کی خبر لیتے ہیں، کالج کے چندوں میں شریک ہوتے ہیں اس کی ترقی کی تدبیریں سوچتے ہیں۔ اس کی محبت طالب علموں کے دل میں پیدا کرتے ہیں۔ اور اس میں وہ تمام انتظامات اور طریقے جو انگلستان کے کالجوں میں جاری ہیں آہستہ آہستہ کرتے جاتے ہیں۔"

یہ سب کچھ تو کالج میں انتظام، ڈسپلن اور لڑکوں کی نگرانی اور حوصلہ افزائی سے متعلق تھا۔ اب یہ بھی سن لیجیے کہ لڑکوں کی مذہبی پابندی میں بھی ان یورپین اساتذہ کا کیا رول تھا۔ اسی سلسلہ میں مولانا لکھتے ہیں:-

" وہ باوجود مذہبی اختلاف کے مسلمان لڑکوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا خیال خود مسلمانوں سے زیادہ رکھتے ہیں۔ مسجد کی غیر حاضری پر ان کو سزائیں دیتے ہیں، مذہبی تعلیم اور قرآن خوانی کی ان کو تاکید کرتے ہیں، مولود کی مجلسوں اور ان کے دیگر مذہبی اجتماعوں میں شریک ہوتے ہیں۔"

(حیات جاوید حصہ دوم ص ۴۸)

مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری سرسید کے ناقدین میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن یورپین اسٹاف کی حسن کارگزاری کے ثنا خوان وہ بھی ہیں، لکھتے ہیں:-

" سرسید کے انتقال کے بعد مسٹر بیک نے سرسید میموریل فنڈ اور کالج کی ترقی کے لیے صد درجہ کوشش کی اس سے ان کی صحت خراب ہو گئی۔ ہر چند انہیں کام سے منع کیا گیا، مگر بیماری کی حالت میں جب کہ وہ تعطیلات کے زمانہ میں شملہ میں تھے کام کرتے رہے حتیٰ کہ ستمبر ۱۸۹۹ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ بیک کا انتقال کے بعد

سر تھیوڈور ماریسن نے نہ صرف تعلیمی کام بلکہ انتظامی کام حد درجہ کی تن دہی سے انجام دیے۔ طلباء کی ملازمت کی ایجنسی قائم کی۔ اپنے غیر معمولی رسوخ سے جو انھیں حکام کے حلقہ میں حاصل تھا، طلباء کو سرکاری ملازمتیں دلواتے تھے۔ کالج کے تمام طلباء کے لیے وہ بمنزلہ بزرگ خاندان کے تھے، جو نہ صرف طالب علمی کے زمانہ میں بلکہ ان کی کاروباری زندگی میں ہر دم یکساں مددگار رہتے تھے۔ دورانِ ملازمت میں اپنے شاگردوں کی ترقی و بہبود میں برابر ساعی رہتے تھے اور مصیبت میں ان کی مدد کرتے تھے۔ مسٹر ماریسن (جو بعد میں سر ہوئے) کے زمانہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ نہ صرف چلت پھرت اور کھیل کود اور نمائش میں بلکہ تعلیم میں بھی علی گڈھ کے طلباء بہت نمایاں ہوئے۔ اور نتائج کے اعتبار سے الہ آباد یونیورسٹی میں اونچے رہتے تھے اور وقتاً فوقتاً تمام یونیورسٹی میں اول آتے تھے اگر انصاف سے دیکھا جائے تو علی گڑھ کالج کے سابق طلباء کو اپنی مادر درس گاہ سے وابستہ کرنے کا تمام تر سہرا پرنسپل بیک، مسٹر ماریسن اور مسٹر آرنلڈ اور اسی زمانے کے انگریز استادوں کے سر تھا۔ یہ اساتذہ طلباء کی مختلف انجمنیں بنانے، انہیں منظم کرتے، ان سے پدرانہ برتاؤ کرتے، کالج چھوڑنے کے بعد ان سے مستقل تعلقات رکھتے۔ ان کے سالانہ جلسے اور ڈنر منعقد کرتے اور ان کے ذریعہ تمام ملک میں کالج کی خوبیوں کا پروپیگنڈا کراتے تھے۔ کالج کے لیے چندہ جمع کرانے کے تمام کام جو انگریز استادوں نے کیے وہ سب انھیں کے ایجاد تھے جو انہوں نے درجۂ کمال پر پہنچا دیے۔ انہیں کی بدولت یہاں کے پڑھے ہوئے طلباء کی ایک مستقل برادری قائم ہو گئی، جنہوں نے علی گڈھ کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد اور علی گڑھ کالج تمام ہندوستان کے مسلمانوں کا مرکز بنا دیا۔"

(مسلمانوں کا روشن مستقبل باب پنجم ص ۲۲۱ - ۳۲۳)

جب کوئی شخص قوم کا عظیم لیڈر اور قائد ہوتا ہے تو وہ صرف خود بڑا نہیں ہ

بلکہ اس کا ایک کمال یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے گردو پیش ایسے رفقائے کار کا بھی حلقہ مہیا کر لیتا ہے جو اس کے کاموں میں اس کے دست و بازو ہوتے اور اس کے مشن کی تکمیل میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے بھی سرسید کی شخصیت کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ قیادت کے دوسرے اوصاف و کمالات کے ساتھ قدرت نے اس وصفِ خاص میں بھی ان کے ساتھ بڑی فیاضی کا معاملہ کیا تھا۔ یہ ان کی بالغ نظری، روشن دماغی اور نگاہِ انتخاب کا غیر معمولی کمال ہے کہ انہوں نے کالج کے یورپین اسٹاف کے لیے انتخاب کیا بھی تو ایسے لوگوں کا کیا جو حسب و نسب کے اعتبار سے شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ کیمبرج یا آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ تھے اور اخلاق و عادات کے لحاظ سے یورپین سوسائٹی کے بہترین افراد کہے جا سکتے تھے چنانچہ انھوں نے سرسید کے مشن کی نہ صرف یہ کہ حمایت کی بلکہ کامل خلوص و ہم آہنگی اور تن دہی کے ساتھ اس مشن کو کامیاب بنانے کی جد و جہد میں لگے رہے۔ یہی وجہ ہے جیسا کہ مولانا حالی نے چند واقعات کی روشنی میں لکھا ہے۔ کالج کے سب لوگ اور خصوصاً طلباء اپنے ان شفیق اساتذہ پر جان چھڑکتے تھے اور جب کوئی وہاں سے رخصت ہوتا تھا تو طلبا دل کی گہرائیوں میں اس کی جدائی کا غم محسوس کرتے تھے۔

اس موضوع پر اس تفصیل سے لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ہمارے زمانہ کے بعض سیاسی لغت نویسوں کے نزدیک ہر وہ کام جس میں انگریز سے مدد لی گئی ہو اور اس سے استفادہ کیا گیا ہو انگریز پرستی ہے اور قومیت کی ضد۔ اس کے برخلاف ہر وہ چیز جو انگریز دشمنی میں کی گئی ہو وہ عین قوم پرستی اور نیشنلزم ہے، چناں چہ محمڈن کالج علی گڑھ کے یورپین اسٹاف کا بھی معاملہ ہے۔ جس کی بنیاد پر آج کل کے بعض مدعیانِ قوم پروری ارباب قلم (ہندو اور مسلمان دونوں) نے سرسید کو انگریز پرستی اور قومی دھارے سے علیحدگی کے طعنے دیئے ہیں اور ان کو بُرا بھلا کہا ہے، چناں چہ

حال ہی میں مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۶۲ء کے سلسلہ میں روزنامہ اسٹیٹسمین میں اس کے نامہ نگارِ خصوصی کا جو ایک دو کالمی مضمون شائع ہوا ہے اس میں مقالہ نگار نے دیوبند اور علی گڑھ کا موازنہ کرتے ہوئے سرسید کی نسبت اسی الزام کو دہرایا ہے ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان خواہ کسی ملک کا باشندہ ہو وہ پوری دنیا کو اپنی زمین اور دنیا کے تمام انسانوں کو اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ حکمت اس کی متاع گمشدہ ہے وہ اگر چین میں بھی ہو (جس سے آج کل ہندوستان کے تعلقات خراب ہیں) تو ایک مسلمان کو اس کو وہاں سے حاصل کرنے میں بھی تامل نہیں ہو سکتا۔ ہم کو یہ تسلیم ہے کہ سرسید کی انتہا پسندی کے باعث ان سے کچھ فروگزاشتیں اور بے اعتدالیاں ضرور ہوئیں۔ جنہیں ہم خود آگے چل کر بیان کریں گے۔ لیکن سرسید پر یہ الزام سرتاسر غلط اور بہتانِ عظیم ہے کہ وہ انگریز پرست یا حکومت پرست تھے، انگریزوں کے خوشامدی اور ان سے مرعوب تھے اور قوم پروری اور وطن دوستی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے تھے۔

سرسید کی تحریک کا نیا موڑ دنیا میں کسی بھی تحریک کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے اس کے حالات یکساں نہیں رہتے۔ گردشِ لیل ونہار اور انقلابِ روزگار کی وادیوں سے اسے بھی گزرنا پڑتا ہے، ہر بڑی تحریک کامیاب ہوتی اور سوسائٹی میں کوئی انقلاب پیدا کرتی ہے تو اس کے ابتدائی عہد میں تحریک کے تمام اعضاء و ارکان میں یک جہتی اور اتحاد ہوتا ہے اگر کوئی وجہ مخالفت کی ہوتی بھی ہے تو بانیٔ تحریک کی بھاری بھرکم شخصیت کے زیر اثر شکوہ زیر لب ہو کر رہتا ہے۔ لیکن تحریک کی کامیابی پر جب ایک مدت گزر جاتی اور اس کے اثرات وثمرات بین طور پر محسوس ومشاہد ہونے لگتے ہیں تو اختلاف وعدم توافق کی صدائیں جو کل تک زیر لب تھیں اب زبان پر بے محابا آجاتی ہیں اور ہر تحریک کے لیے یہ وقت سخت کرائسس (CRISIS) اور ابتلا کا ہوتا ہے،

تحریکوں میں یہ دور عام طور پر بانی تحریک کے انتقال کے بعد آتا ہے۔ لیکن سرسید کی بدقسمتی ان کی تحریک کا یہ صبر آزما اور حوصلہ شکن دوران کی زندگی میں آگیا۔

اسباب و وجوہ | اس کے وجوہ و اسباب اگرچہ متعدد ہیں لیکن سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا، سرسید کی طبیعت میں ہر بڑے انسان کی طرح جس سے پیغمبری معصوم سمجھتے ہیں بلا کی انتہا پسندی تھی اور اس کا لازمی نتیجہ بے اعتدالی اور بے احتیاطی کا صدور ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے کالج میں یورپین اسٹاف کی موجودگی کو بطور ایک اصل کل اور پالیسی کے اختیار کیا تو ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ کالج کا پرنسپل اور ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر دونوں انگریز ہی ہوں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کالج کا مکمل نظم و نسق اور دروبست ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ جو حضرات ایشیا اور افریقہ میں برطانوی مستعمرات کی تاریخ سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ ان مستعمرات میں حکومت کی پالیسی اور انگریز کا کیرکٹر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ یہ لوگ جس قوم اور فرقہ میں رہتے ہیں ان میں گھل مل کر اور ان کو اپنا بنا کر رہتے ہیں۔ تعلیم، انتظام، صحت، صفائی اور ڈسپلن اس میں سے ہر میدان میں خلوص اور محنت سے خدمات انجام دیتے ہیں۔ اس ملک اور قوم کی زبان اور ان کے علوم و فنون کو ترقی دیتے اور اس کے لیے جانفشانی سے کرتے ہیں۔ لیکن ان تمام خدمات کے باوجود یہ لوگ اپنا سیاسی مقصد کبھی نظر انداز نہیں کرتے۔ ان تمام خدمات کے پس منظر میں جو جذبہ کارفرما ہوتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ محکوم قوم کے دل میں حکومت کے ساتھ وفاداری کا ولولہ اور جوش پیدا کیا جائے اور محکوم کے دل میں حکمران طبقہ کی عظمت اس کی تہذیب و تمدن کی سربلندی اور اس کے احسان کے لیے شکر گزاری و منت پذیری کے جذبات و احساسات پیدا کیے جائیں۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے بعد انگریزوں کے دور حکومت میں عربی فارسی اور سنسکرت کے خصوصاً اور دوسرے مضامین کے عموماً انگریز محققین و فضلا کا ہم کو

عظیم گروہ نظر آتا ہے جنہوں نے بے شمار علوم و فنون کی بڑی قابل قدر اور لائق تحسین خدمات انجام دی ہیں اور ان سے ہندوستان کو بڑا فائدہ پہنچا اور اب تک پہنچ رہا ہے لیکن با ایں ہمہ یہ سب حضرات ڈپلومیٹ بھی تھے۔ اور انھوں نے اپنا سیاسی مقصد ایک لمحہ کے لیے فراموش نہیں کیا۔ پروفیسر براؤن اور پروفیسر نکلسن عربی فارسی کے نہایت بلند پایہ استاد اور محقق تھے، لیکن ساتھ ہی برطانوی حکومت کے محکمۂ خارجہ سے تعلق رکھتے تھے۔ سرڈینی سن راس جو ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۱ء تک مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے انھوں نے عربی، فارسی، علوم و فنون کی جو عظیم خدمت کی ہے اس کا اعتراف نہ کرنا ناسپاسی ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موصوف اوّل درجہ کے ڈپلومیٹ یا دوسرے لفظوں میں حکومت کے سیاسی ایجنٹ بھی تھے چنانچہ خاص ایران کے معاملہ میں انھوں نے حکومتِ ہند کے لیے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ ایران میں برطانوی سیاست کے طالب علم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

افسوس ہے سرسید اپنی انتہا پسندی اور عجلت میں کالج کے پرنسپل اور اس کے ہیڈ ماسٹر کا عہدہ انگریزوں کے لیے مخصوص کرتے وقت اس اہم نکتہ کو نظر انداز کر بیٹھے، جلد یا بدیر اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ یورپین اسٹاف اور کالج کے ... و زعما میں تصادم اور تزاحم پیدا ہوا اور کالج کا شیرازۂ جمعیت و اطمینان ... و پریشان ہو۔

<u>یورپین اساتذہ کے ناگوار اثرات</u> | چنانچہ اس صورتِ حال کے باعث جو حالات ... ہوئے انہیں مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:۔

الف:۔ مسلمان طلباء میں انگریز قوم کی عظمت ہی نہیں، جذباتی طور پر ان سے لگاؤ پیدا ہوا۔

وہ انگریزی تہذیب وتمدن کے زیادہ گرویدہ اور فریفتہ ہو گئے۔ ان کے لیے اپنی مادری زبان میں گفتگو کرنا مشکل تھا۔ انگریزی میں بے تکلف بولتے اور لکھتے تھے۔ اپنی قومی اور ملی تہذیب سے ان کو عار آتی۔ لباس، وضع قطع، کھانے پینے کے طور طریق اور معاشرت کے آداب و رسوم ان سب میں یورپ کی تقلید ان کے لیے باعثِ فخر اور سرمایۂ ناز تھی۔ یورپین اساتذہ کے ساتھ ہر وقت کے خلا ملا کے علاوہ اس رجحان میں دخل سر سید کا بھی تھا۔ وہ خود ہندوستانی مسلمانوں سے کرتی اور انگریزوں کے دل سے مسلمانوں کی ذلت و پسماندگی کا احساس دور کرنے کی غرض سے اپنی تحریروں اور تقریروں میں مغربی تہذیب و تمدن کی پیروی کرنے کی تاکید زور شور سے کرتے رہتے تھے اور خود بھی انھوں نے یہ تہذیب اختیار کر لی تھی۔[1] اسلامی نقطۂ نظر سے کسی بھی قوم کی تہذیب میں اگر کوئی چیز اچھی اور مفید ہو تو اس کا اختیار کر لینا نہ صرف یہ کہ معیوب نہیں ہے، بلکہ مستحسن ہے اس بنا پر اس میں شبہ نہیں۔ مغربی تہذیب میں بعض ایسی خوبیاں ضرور ہیں جو مسلمانوں کو اختیار کرنی چاہیے تھیں، لیکن سر سید کی انتہا پسندی یہاں بھی "اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی" کا مصداق ثابت ہوئی۔ انھوں نے مغربی تہذیب کی نقالی میں ضروری اور غیر ضروری اچھے برے اور درست و نادرست کا کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھا۔ مغربی تہذیب کی مدح و ثنا اور اس کے مقابلہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کی تنقیص و مذمت کے باب میں

---

[1] عہد گزشتہ میں علما میں مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ بھی جلا وطنی کے بعد جب ہندوستان واپس آئے تو عجیب بات ہے وہ بھی سر سید کی طرح مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے اختیار کر لینے کی دعوت دیتے تھے، چنانچہ مجھ سے اکثر فرماتے تھے۔ سعید! میں تجھ سے بہت خوش ہوں، لیکن اس بات سے سخت ناراض ہوں کہ تو مسلمانوں کے عہدِ جاگیرداری کا لباس پہنے پھرتا ہے اور کوٹ پتلون نہیں پہنتا۔

سرسید کا لب و لہجہ متوازن اور معتدل نہیں رہتا اور بسا اوقات اشتعال انگیز بن جاتا تھا۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ سرسید جو کہتے تھے وہ بے اصل و بے بنیاد باتیں نہیں تھیں اور ان میں سے کتنی چیزیں ہیں جن کو آج نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں نے بلکہ پورے عالم اسلام نے بے تکلف اختیار کر لیا ہے۔ لیکن یہ زمانہ وہ تھا جب کسی مسلمان کا ترکی ٹوپی اور زرکش کوٹ پہننا، علما کے نزدیک اس کے ملحد اور بے دین ہونے کے لیے کافی تھا۔ پس جب فضا اس درجہ تیرہ و تار ہو تو ظاہر ہے سرسید کا لعرۂ مستانہ کس طرح برداشت ہو سکتا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ کالج کے طلباء اور تعلیم یافتہ نوجوان مغربی تہذیب و تمدن کے علم و نشان کے ساتھ جب ملک میں پھیلنے شروع ہوئے اور ساتھ ہی اس سلسلہ میں سرسید کی تقریریں اور تحریریں عام ہوئیں تو ملک میں کالج کے یورپین اساتذہ اور ساتھ ہی سرسید کے خلاف عام بیزاری اور غیظ و غضب کے جذبات کا اظہار ہونے لگا۔ اونچے اور سنجیدہ طبقہ میں ان جذبات کے سب سے بڑے ترجمان مولانا شبلی اور اکبر الٰہ آبادی تھے۔

مولانا شبلی نے تو ان خیالات کا اظہار چند خطوط، دو تین نظموں اور چند مضامین میں ہی کیا ہے اور وہ بھی اپنے آپ کو لیے دیئے ہوئے۔ لیکن اکبر بہت مشہور و مقبول شاعر تھے۔ سرسید کی تنقید میں جو مصرعہ بھی ان کی زبان قلم سے نکلتا۔ گھر گھر پھیل جاتا تھا۔ اکبر یوں سرسید کے بڑے مداح اور قدر دان تھے لیکن سرسید کی حد سے زیادہ مغرب نوازی سے سخت بیزار اور بد دل تھے، چنانچہ سرسید پر ان کی تنقید کا رنگ یہ ہے فرماتے ہیں۔

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر	تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں	خود اپنی قوم مچاتی ہے شور و واویلا

جو اعتدال کی کہیے تو وہ اِدھر نہ اُدھر — زیادہ حد سے ... پاؤں ہیں پھیلا
اِدھر یہ ضد ہے کہ لمنڈ بھی چھو نہیں سکتے — اُدھر یہ دُھن ہے کہ ساقی صراحیِ مے لا
اِدھر ہے دفترِ تدبیر و مصلحت ناپاک — اُدھر ہے حدِ حماقات کی ...

غرض دوگونہ عذاب است جانِ مجنوں را
بلائے صحبتِ لیلا و فرقتِ لیلا

ظاہر ہے جب یہ خیالات گھر گھر عام ہو رہے تھے تو کالج کے خاندان اس انتظامیہ کمیٹی کے ممبر کب تک ان سے متاثر نہ ہوتے اور وہ بحیثیت ذمہ دار ممبر کے اپنا یہ فرض محسوس نہ کرتے کہ سرسید کی انتہا پسندی نے کالج میں جو حالات پیدا کر دیے ہیں ان کا تدارک کیا جائے۔

تعلیم خوش حال طبقہ تک محدود ہو کر رہ گئی

(ج) یہ سب تو خیر تھا ہی۔ سرسید کی پالیسی کا ایک عظیم نقصان یہ ہوا کہ چونکہ کالج کے یورپین اساتذہ یہاں بڑی بڑی تنخواہوں پر تھے اور کالج کے بجٹ پر ان کا غیر معمولی دباؤ پڑ رہا تھا اور ساتھ ہی کالج کے ساتھ اقامتی زندگی ضروری تھی جس کے فی نفسہٖ اہم اور مفید ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا لیکن مشکل یہ ہے کہ سرسید ہر معاملہ میں کیمبرج اور آکسفورڈ کی نقالی کرنا چاہتے تھے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے اور اس کے لیے انھوں نے اس زمانہ کے لفٹنٹ گورنر اور دوسرے بڑے بڑے انگریزوں سے دادِ تحسین حاصل بھی کیا۔ لیکن اس کا ایک افسوس ناک نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ کالج کی تعلیم مسلمانوں کے خوش حال طبقہ کے نوجوانوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی۔ جن کے والدین کالج کے گراں بار اخراجات کے متحمل ہو سکتے تھے۔ غریب طبقہ کے طالب علم کے لیے کالج سے فائدہ اٹھانا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس زمانے کے طلباء پر اگر آپ ایک نگاہ ڈالیں تو ان میں ایک عظیم اکثریت آپ کو

جاگیرداروں، نوابوں، رئیسوں، زمینداروں اور طبقۂ وسطیٰ کے ملازمت پیشہ یا تجارت پیشہ مسلمانوں کے لڑکوں کی ملے گی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں کا طبقۂ عوام کالج سے کشیدہ رہا اور اس کے دل میں کالج کی وقعت اور عظمت پیدا نہ ہو سکی۔

سرسید کی ایک اور کمزوری انتہا پسندی کے علاوہ ان میں ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ وہ جس شخص پر اعتماد کرتے تھے، بھرپور کرتے تھے اس سے متعلق جو کام ہوتا وہ من وعن اس کے سپرد کر کے بجنت ہو کر بیٹھ جاتے اور پھر اس کا احتساب یا نگرانی نہ کرتے تھے۔ اس کمزوری میں ان کی طبیعت کے علاوہ بڑا دخل ان کی غیر معمولی مصروفیت و مشغولیت کا بھی تھا۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں سخت المناک غبن کا جو واقعہ پیش آیا۔ وہ ان کی اسی کمزوری کا نتیجہ تھا۔ شام بہاری لال ایک شخص جو قوم کا کالستھ تھا ۱۸۸۳ء میں سرسید نے اس کا تقرر ہیڈ کلرک کے عہدہ پر اپنے دفتر میں کیا۔ اگرچہ اس کی تقرری کے برس ڈیڑھ برس بعد سرسید کو کسی ذریعہ سے یہ بات معلوم بھی ہو گئی تھی کہ یہ شخص پنجاب گورنمنٹ میں ملازم تھا اور غبن کے الزام میں نہ صرف یہ کہ ملازمت سے الگ کیا گیا، بلکہ سزا بھی بھگت چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود سرسید نے احتیاط اور اس کی نگرانی نہیں کی اور اس پر اس درجہ اعتماد کیا کہ چک پر (جس کی کتاب سرسید کے قبضہ میں رہتی تھی) اپنی طرف سے جو رقم چاہتا لکھ دیتا اور سرسید سے دستخط کرا لیتا تھا۔ غایت اعتماد کے باعث سرسید یہ دیکھتے بھی نہیں تھے کہ اس چک پر رقم کیا لکھی گئی ہے اور روپیہ کس کام کے لیے نکالا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے ایک نہایت جسارت کا کام یہ کیا کہ کالج کا جو محفوظ سرمایہ بنک کے قبضہ میں تھا اس شخص نے جعل و فریب کر کے اس پر ہاتھ مارا اور ٹرسٹیوں کی طرف سے ایک جعلی مختار نامہ بنا کر محفوظ سرمایہ کی ضمانت پر کالج کے نام سے وقتاً فوقتاً بنک سے سود پر روپیہ قرض لیتا رہا

اس طرح اس نے جو روپیہ غبن کیا اس کی مقدار ایک لاکھ ہزار سے زیادہ تھی سرسید کے لیے یہ صدمہ جانکاہ ثابت ہوا اور وہ اس سے جانبر نہ ہو سکے۔

اندرونی کشمکش | اسی طرح سرسید نے کالج کے پرنسپل اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے عہدے انگریزوں کے لیے مخصوص کیے تو وہ ان پر اعتماد بھی بھرپور کرتے تھے۔ انہوں نے ان لوگوں کو کالج کے سیاہ سپید کا مالک بنا دیا تھا اور ان کے انتظام میں اگر بات ناپسندیدہ بھی ہوتی تھی تو اس کا نوٹس نہیں لیتے تھے۔ مسٹر بیک بڑی آن بان کے پرنسپل تھے ان میں اور کالج کی انتظامیہ کمیٹی کے بعض ممبروں میں جن میں مولوی سمیع اللہ خاں پیش پیش تھے۔ ایک مستقل کش مکش رہنے لگی۔ لیکن سرسید ان معاملات میں پرنسپل بیک کی ہی حمایت کرتے تھے۔ چنانچہ جب کشمکش بڑھی تو سرسید نے پرنسپل بیک کے مشورہ پر اس پرانی انتظامیہ کمیٹی کو معطل کر دیا اور اس کے بجائے ایک نیا بورڈ آف مینجمنٹ بنایا جس کے ممبروں میں مولوی صاحب موصوف کا نام نہیں تھا۔ سرسید کے اس فعل نے کالج کے حلقہ میں ان کے مخالفین کا ایک مستقل گروہ پیدا کر دیا۔ باقی

حافظ زکی الدین المنذریؒ

از مولوی محمد عبد اللہ صاحب رفیق۔ ندوۃ المصنفین

حافظ زکی الدین منذری کی مشہور و معروف کتاب الترغیب والترہیب کا تشریحی ترجمہ ضروری حواشی کیا تھا ندوۃ المصنفین سے شائع ہونے والا ہے جیسا کہ قبل اس کے کام شروع بھی ہو گیا تھا لیکن بعض موانع پیش آگئے اور کام رک گیا اب یہ خدمت مولوی محمد عبد اللہ صاحب کے سپرد کی گئی ہے جو بڑی محنت سے یہ خدمت کر رہے ہیں زیر نظر مضمون اسی کتاب کا مقدمہ ہے جس میں حافظ منذری اور ان کی کتاب کا تعارف کرایا گیا ہے۔ "برہان"

نام ونسب و پیدائش | الحافظ الکبیر الامام شیخ الاسلام زکی الدین ابو محمد عبد العظیم بن عبد القوی بن عبد اللہ بن سلامۃ بن سعد بن سعید المنذری الشامی ثم المصری الشافعی آپ کا خاندان شام سے آکر مصر میں مقیم ہو گیا تھا۔ اس لیے ان کے نام کے ساتھ الشامی ثم المصری لکھا جاتا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ بعض مورخین نے آپ کی پیدائش مصر کی بیان کی ہے[1]

آپ یکم شعبان سن پانچ سو اکیاسی ہجری (۵۸۱ھ مطابق ۱۱۸۶ء) میں اکثر مورخین کے بیان کے مطابق مصر میں پیدا ہوئے۔

تحصیل علم | آپ نے حصول علم کے لیے مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، بیت المقدس، دمشق، حران، رہا اور اسکندریہ وغیرہ کے اسفار کیے اور ہر جگہ کے اکابر اہل علم اور ماہرین اہل فن سے استفادہ کیا۔

اساتذہ کرام | آپ کے اساتذہ میں سب سے پہلے استاد حدیث ابو عبد اللہ الارتاحی ہیں

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ صفحہ ۲۱۲۔

خود حافظ منذری نے کہا ہے "ھو اول شیخ سمعت منہ الحدیث" یعنی یہ میرے سب سے پہلے استاد ہیں۔ جن سے میں نے حدیث سنی۔ امام[2] ابو القاسم عبد الرحمان بن محمد القرشی عبد المجیب بن زہیر المتوفی ۶۲۰ھ محمد بن سعید المامونی، حافظ ابو الحسن علی المقدسی المطہر بن ابی بکر البیہقی، ربیعۃ بن الحسن بن علی الیمنی المتوفی ۶۰۹ھ، ابو عبد اللہ البناء المتوفی ۶۱۲ھ، الحسن بن ۔ بن الحسن زین الامناء المتوفی ۶۲۷ھ، الخضر کامل، ابراہیم النبیب، ابو الجود غیاث بن فارس، الحافظ جعفر بن اموسان، عمر بن طبرزد محمد بن الشریف، التاج الکندی[3]، امام دار قطنی[4]۔

علامہ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ نے محمد بن عمر بن یوسف القرطبی الالفہ المتوفی ۶۳۱ھ اور مہذب الدین محمد بن علی الحلی الادیب[6] الشاعر المتوفی ۶۴۲ھ کو بھی منذری کے اساتذہ میں شمار کیا ہے۔ مؤرخ ابن العماد نے ابو الحسن علی ابن احمد بن عبد الواحد الغز البخاری المتوفی ۶۹۰ھ کے حالات میں لکھا ہے کہ منذری نے ان سے روایت کی ہے[8]۔ علامہ سبکی نے متعدد علماء کے حالات میں منذری کا ان سے روایت کرنا نقل کیا ہے۔ ان میں چند یہ ہیں۔ محمد بن صبغۃ اللہ الشیرازی[9] المتوفی ۶۳۵ھ۔ ابراہیم بن نصر بن طاقۃ المصری الحموی[10] المتوفی ۶۳۰ھ عبد الرحمٰن بن محمد بن اسماعیل القرشی المصری ابن الوراق المتوفی ۶۱۶ھ۔ حافظ منذری کہتے ہیں کہ میں نے ان سے حدیث سنی ہے اور عرصۂ دراز تک

[illegible] تذکرہ دار قطنی

---

[1] شذرات الذہب ج ۵ ص۶ ترجمہ محمد بن حمد — بلا الف — بن حامد ابی عبد اللہ الارتا ان کی نسبت کسی نے اریاحی کسی نے ارتیاحی اور کسی نے کچھ نقل کی ہے۔ ہم نے خود ابو عبد اللہ الارتاحی کے حالات دیکھ کر اور متعدد مقامات سے مراجعت کرکے درست کیا ہے [2] تذکرۃ الحفاظ شذرات الذہب وغیرہ [3] بغیۃ الوعاۃ ص۸۵ ترجمۃ محمد بن عمر القرطبی [4] بغیۃ الوعاۃ ترجمہ محمد بن علی وطبقات الشافعیہ ج ۵ ص۳۲ [5] شذرات الذہب ج ۵ ص۴۱۶ [6] طبقات الشافعیہ [7] ایضاً ص۹ ج۵

فقہ حاصل کیا ہے[1]۔ المظفر بن ابی احمد الوارانی امین الدین التبریزی[2] المتوفی ۶۲۱ھ۔ لخم بن ابی الفرح بن سالم الکنانی المصری[3] المتوفی ۶۰۴ھ۔ الفقیہ ہمام بن راجی اللہ المصری المتوفی ۶۳۰ھ اور آپ کے اساتذہ میں موفق الدین ابو محمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامۃ الحنبلی المقدسی[4] المتوفی ۶۲۰ھ بھی ہیں۔

بعض محدثین سے روایت تو نہیں ہے لیکن محدثین کے طریقہ کے مطابق ان سے اجازت حاصل ہے مثلاً ابو الربیع سلیمان بن موسیٰ الحمیری الکلاعی المتوفی ۶۳۴ھ حافظ ذہبی نے ابو الربیع کے حالات لکھتے ہوئے منذری کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ کتب الینا بالاجازۃ سنۃ اربع عشرۃ[5]۔ یعنی ۶۱۴ھ میں انھوں نے ہمیں روایت حدیث کی تحریری اجازت بھیجی۔ برہان الدین ابراہیم بن المظفر التبرنی الموصلی المتوفی ۶۱۲ھ منذری نے ان کے متعلق لکھا ہے۔ لنا منہ اجازۃ[6] یعنی ہمیں ان سے حدیث کی اجازت حاصل ہے۔

آپ نے قرآن مجید پڑھنے کے بعد ادب اور فقہ پڑھا اور فقہ میں یگانہ و بے مثال ہو گئے۔ لیکن فن حدیث آپ کی دلچسپی کا مرکز تھا اور یہی رات دن کا مشغلہ بھی اس لیے آپ کی ادبیت اور فقاہت دب کر رہ گئی اور محدثانہ شان ہی کا غلبہ ہو گیا اور آپ بحیثیت محدث کے مشہور ہو گئے۔

تلامذہ و مستفیدین | آپ کے شاگردوں میں بڑے بڑے حفاظ حدیث اور اکابر علماء شامل ہیں مثلاً حافظ دمیاطی، ابن الظاہری، ابو الحسین الیونینی، ابو عبداللہ بن القزاز اسماعیل

---

[1] الطبقات الشافعیۃ ۲[2] الیضاح ۵ صفحہ ۱۵۶ [3] الیضاح ۵ صفحہ ۱۶۲ [4] شذرات الذہب ج ۵ صفحہ ۸۲ التاج المکلل صفحہ ۲۳۱ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ صفحہ ۲۰۱ ترجمہ سلیمان بن موسیٰ الکلاعی

[6] التاج المکلل صفحہ ۲۳۱

[illegible] تقی الدین ابن دقیق العید، العادل [illegible]
[illegible] بن الوزیری، شیخ الاسلام حافظ عزالدین بن عبدالسلام السلمی [illegible]
ابراہیم المیدومی[1]، احمد بن ابراہیم القرشی القاہری[2] اور جلال الدین [illegible]
الکندی[3] وغیرہم۔

حافظ منذری کا مقام اہل علم کی نظر میں

حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں ان سے اونچا حافظ حدیث کوئی اور نہ تھا[4]۔ ذہبی نے ان کے نام کے ساتھ الحافظ الکبیر الامام الثبت شیخ الاسلام کے الفاظ لکھے ہیں۔ علامہ جلال الدین السیوطی المتوفی ۹۱۱ھ نے لکھا ہے کہ فن قرأۃ میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ حافظ عزالدین بن عبدالسلام جن کے متعلق حافظ ذہبی نے کہا ہے کہ درجۂ اجتہاد پر فائز تھے اور سیوطی نے جنہیں شیخ الاسلام اور سلطان العلماء کے القاب سے یاد کیا ہے[5] وہ منذری کا شاگرد ہونے پر فخر کرتے تھے۔ حافظ عزالدین بن عبدالسلام فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ زکی الدین المنذری فن حدیث میں عدیم المثال تھے حدیث کے صحیح وسقیم ومعلول کو اچھی طرح جانتے تھے اس کے احکام ومعانی اور اس کی مشکلات کے حل کرنے میں پوری مہارت رکھتے تھے اور اس کے لغات اور ضبط الفاظ میں کامل تھے، احادیث کے لفظی فروق پر گہری نظر تھی۔ نہایت متقی پرہیزگار اور قانع انسان تھے۔ نیز فرماتے ہیں کہ میں نے آپ سے حدیث پڑھی ہے اور بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے۔ ذہبی نے نقل کیا ہے کہ منذری بڑے عبادت گزار اور زاہد[6]

---

[1] سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ ص۵ میں ان کے حالات میں لکھا ہے "قال الذہبی وکان خصیصا بالحافظ المنذری" [2] طبقات الشافعیہ للسبکی ج۵ ص۲ [3] الضیاء ج۵ ص۹
[4] طبقات الشافعیہ ج۵ ص۱۰۹ شذرات الذہب ج۵ ص۲۷۷ [5] حسن المحاضرۃ ج۱ ص۱۲۶

حافظ ابن عبدالسلام جب قاہرہ پہنچے تو حافظ منذری کی مجلسِ درس میں شاگردانہ شرکت کرتے تھے اور خود حدیث بیان کرنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ تو تھا حافظ عزالدین بن عبدالسلام کا اعترافِ فضل۔ اب دوسری طرف حافظ منذری کی قدردانی اور توقیر و تعظیم دیکھیے کہ حافظ منذری نے حافظ ابن عبدالسلام کے مصر تشریف لانے کے بعد فتویٰ دینا چھوڑ دیا تھا اور اعلان کرا دیا تھا کہ ہم فتویٰ اسی وقت تک دیتے تھے جب تک حافظ ابن عبدالسلام نہیں آئے تھے۔ اب ان کے تشریف لے آنے کے بعد منصب فتویٰ ان ہی کے لیے مخصوص و متعین ہے[1]۔ علامہ سیوطی نے حسن المحاضرۃ میں لکھا ہے کہ شیخ عزالدین بن عبدالسلام جب مصر پہنچے تو بالغ المنذری فی الادب معہ یعنی منذری نے بہت زیادہ ادب و تعظیم کا معاملہ کیا[2]۔ مشہور عالم و محدث حافظ ابن دقیق العیدؒ جن کے متعلق علامہ تاج الدین سبکی نے لکھا ہے۔ بالاتفاق وہ ساتویں صدی ہجری کے مجدد تھے[3]۔ یہ فرماتے ہیں کہ میں حافظ زکی الدین المنذری کو اپنے سے زیادہ متدین سمجھتا ہوں[4]۔ علامہ سیوطی نے حسن المحاضرۃ میں شیخ الاسلام حافظ عزالدین بن عبدالسلام کے حالات بیان کرتے ہوئے شیخ ابوالحسن شاذلی کا قول نقل کیا ہے:۔

قال الشیخ ابوالحسن الشاذلی	مجھ سے کہا گیا کہ روئے زمین پر علم فقہ کی کوئی[5]
قیل لی ما علی وجہ الارض مجلس	مجلس شیخ عزالدین بن عبدالسلام کی مجلس سے
فی الفقہ ابھیٰ من مجلس الشیخ	بہتر نہیں ہے اور روئے زمین پر علم حدیث میں

---

[1] حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۲۶ ترجمۃ الحافظ عزالدین بن عبدالسلام۔ طبقات الشافعیۃ للسبکی ج ۵ ص ۱۰۹ ترجمۃ المنذری [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۲۶ [3] طبقات الشافعیۃ للسبکی ج ۶ ص ۲ [4] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۲۵

[5] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۲۶

الدین بن عبد السلام وما علی — کوئی مجلس شیخ زکی الدین عبدالعظیم احمد
وجہ الارض مجلس فی الحدیث اجمل — کی مجلس سے بارونق اور عمدہ نہیں اور
من مجلس الشیخ زکی الدین عبد — تختۂ زمین پر علم حقائق و معارف کے
العظیم وما علی وجہ الارض مجلس — لحاظ سے تمہاری مجلس سے عمدہ و بہتر
فی علم الحقائق اجمل من مجلسک[۱] — کوئی مجلس نہیں ہے۔

حافظ ذہبی کے استاد حافظ عبدالمومن کہتے ہیں کہ حافظ منذری میرے استاد ہیں۔

اتیتہ مبتدئا وفارقتہ محدثا[۲] — میں ان کے پاس مبتدی کی حیثیت میں آیا تھا اور فاضل بن کر ان کے پاس سے نکلا۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:-

وبرع بهذا الشان حتی فاق اهل زمانه فیه[۳] — فن حدیث میں منہمک اور دائم الاشتغال رہے۔ یہاں تک کہ اپنے سب ہم عصروں سے سبقت لے گئے۔

علامہ عبدالحی الکتانی المغربی (المتوفی ۱۳۸۲ھ) نے الرحمۃ المرسلۃ فی شان حدیث البسملۃ میں حافظ زکی الدین المنذری کی کتابوں کے متعلق علامہ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ کا قول نقل کیا ہے کہ:-

اذا علمتم بالحدیث انه فی تصانیف المنذری صاحب الترغیب والترهیب فاروه مطمئنین[۴] — جب تمہیں کسی حدیث کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ یہ حافظ منذری مصنف الترغیب والترہیب کی کسی کتاب میں ہے تو اسے بے کھٹکے نقل کرو۔

علمی خدمات تدریس و تصنیف | آپ کے علوم کا سمندر ہر طرف سیراب کرتا رہا۔ اور

---

[۱] اس مقولہ کا انداز بیان بالخصوص شروع و آخر کے جملے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ کوئی
[۲] تذکرۃ الحفاظ ج۴ ص۲۲۱ [۳] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ ص ۲۱۲ [۴]
التعلیقات الحافلۃ للشیخ الفاضل عبدالفتاح ابوغدۃ علی الاجوبۃ الفاضلۃ للامام عبدالحی اللکنوی ص ۱۲۰ (طبعۃ السوریۃ)

بڑھلوں ہزاروں دریا اس میں سے نکل کر عالم کو سیراب کرنے لگے۔ پہلے آپ نے کچھ عرصہ جامع ظافری قاہرہ میں درس دیا اس کے بعد دار الحدیث الکاملیۃ کی مسند درس پر جلوہ افروز ہوگئے اور مسلسل بیس سال تک کاملیۃ میں درس دیتے رہے اور دور دراز کے تشنگان علوم نبوت سفر کرکے آپ کے پاس آتے رہے اور استفادہ کرتے رہے۔

درس تدریس اور علمی اشتغال دانہماک کا یہ عالم تھا کہ درس گاہ کاملیہ سے سوائے نماز جمعہ کے اور کسی کام کے لیے نہیں نکلتے تھے۔ حتیٰ کہ علامہ سبکی نے لکھا ہے کہ ان کے ایک صاحبزادے جو بڑے محدث اور فاضل تھے ان کا انتقال ہوا تو باپ (حافظ منذری) نے کاملیۃ کے اندر ہی نماز جنازہ پڑھائی اور صرف دروازے تک جنازے کے ساتھ آئے اور وہیں سے رخصت کرکے یہ کہہ کر واپس ہوگئے کہ "جاؤ بیٹا میں نے تمہیں خدا کے سپرد کیا۔"[۱]

تصانیف | آپ نے حدیث، فقہ، تاریخ، اور رجال وغیرہ پر متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔ (۱) فقہ شافعی کی مشہور کتاب التنبیہ للشیخ ابی اسحاق ابراہیم بن علی الفقیہ الشیرازی الشافعی المتوفی ۴۷۶ھ کی شرح۔[۲] (۲) مختصر صحیح مسلم نواب صدیق حسن خاں بھوپالیؒ نے اس کی شرح "السراج الوہاج" کے نام سے لکھی ہے اور اس مختصر صحیح مسلم پر عثمان بن عبد الملک الکردی المصری المتوفی ۷۳۸ھ اور محمد بن احمد الاسنوی المتوفی ۷۶۳ھ نے بھی شرح لکھی ہے۔[۳] کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں منذری کی اس کتاب کا مخطوطہ محفوظ ہے جو کہ ۹۴۳ھ کا لکھا ہوا ہے۔[۴] (۳) مختصر سنن ابی داؤد[۵]

---

[۱] طبقات الشافعیۃ ج ۵ ص ۱۰۹ [۲] کشف الظنون ج ۱ ص ۳۴۲ حرف التاء [۳] کشف الظنون ج ۱ ص ۵۴۵
[۴] فہرست کتب خانہ آصفیہ ج ۱ ص ۶۶۶ [۵] یہ کتاب مطبع انصاری دہلی سے غایۃ المقصود حل سنن ابی داؤد کے حاشیہ پر شائع ہو چکی ہے۔

حافظ ابن القیم الجوزیہ شرح سنن ابی داؤد میں فرماتے ہیں :-

ان الحافظ زکی الدین المنذری	حافظ زکی الدین المنذری نے اس سنن کا بڑا
قد احسن فی اختصارہ فہذبته	اچھا اختصار کیا ہے میں نے بھی اس کو بہتر
نحو ما ھذبہ بہ الاصل وزدت	انکو مرتب و مہذب کیا ہے اور جن علل وغیرہ پر
علیہ من الکلام علی علل سکت	المنذری نے سکوت کیا تھا ان پر بھی کلام کیا ہے اسلیے
عنها اذ لم یکملها[1]۔	کہ منذری اس کو مکمل نہیں کرسکے تھے۔

کشف الظنون میں منذری کی مختصر سنن ابی داؤد کا نام المجتبیٰ نقل کیا گیا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اس کے متعلق یہ لکھا ہے :۔ وھو احسن اختصارا من الاول[2] یعنی مختصر صحیح مسلم سے یہ مختصر سنن ابی داؤد زیادہ عمدہ ہے۔ صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ سیوطی نے منذری کی اس المجتبیٰ کی شرح بنام زھر الربی علی المجتبیٰ لکھی ہے راقم سطور کہتا ہے کہ ہندوستان میں جو زھر الربی سنن نسائی کے حاشیہ پر شائع ہوئی ہے اس کا بھی پورا نام زھر الربی علی المجتبیٰ ہے اور وہ بھی علامہ سیوطی ہی کی تصنیف ہے۔ لہذا اگر صاحب کشف الظنون کو اشتباہ نہیں ہوا ہے تو یہ دونوں الگ کتابیں سمجھنی چاہئیں واللہ اعلم۔ (۴) حواشی سنن ابی داؤد۔ (۵) المعجم۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے (۶) الترغیب والترہیب (۷) کتاب الخلافیات ومذاھب السلف۔ اس کتاب کا ذکر خود منذری نے الترغیب والترہیب کے مقدمہ میں کیا ہے حافظ ذہبی نے جو لکھا ہے کہ وصنف فی المذھب[3] یعنی مذہب کے متعلق بھی ایک کتاب لکھی ہے یہ غالباً اسی کتاب کی طرف اشارہ ہے (۸) التکملۃ لوفیات النقلۃ یہ حافظ ابو سلیمان محمد بن عبداللہ کی کتاب وفیات النقلۃ کا تکملہ یا ضمیمہ ہے۔

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۳۵ [2] البدایۃ والنہایۃ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۱۱

صاحب کشف الظنون کہتے ہیں کہ میں نے اس کا مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ دیکھا ہے جو تین جلدوں میں تھا[1] سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ کے مقدمہ میں جہاں اپنے مآخذ کی فہرست بیان کی ہے وہاں اس کا بھی ذکر کیا ہے لکھتے ہیں:۔ "و تاریخ من دخل مصر المسمی بالتکملۃ لوفیات النقلۃ للمنذری[2]" سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ میں مختلف مقامات پر اس کا کئی ناموں سے حوالہ دیا ہے مثلاً ص۱۳ پر محمد بن احمد بن عبداللہ اللخمی کے حالات میں لکھا ہے "کذا ذکرہ المنذری فی تاریخ من دخل مصر" اور ص۲۴ پر محمد بن برکات السعیدی کے حالات میں ہے "المنذری فی تاریخہ" اور صفحہ ۸۰ پر ابو عبداللہ محمد بن علی السلمی الدمشقی کے حالات کے تحت اس کا نام "تاریخ مصر" ذکر کیا ہے۔ ہم نے یہاں پر یہ تنبیہ اس لیے ضروری سمجھی کہ منذری کی تصانیف میں اگر کہیں "تاریخ مصر" یا "تاریخ من دخل مصر" نظر آئے تو اس سے ان کی کوئی اور کتاب نہ سمجھی جائے۔

(۹) ایک رسالہ (جزو) حدیث الطہور شطر الایمان الخ کے طرق، احکام اور فوائد وغیرہ پر لکھا ہے جس کا ذکر خود حافظ منذری نے الترغیب والترہیب میں حدیث مذکور کے تحت کیا ہے[3]

(۱۰) ایک رسالہ (جسے محدثین کی اصطلاح میں الجزء کہتے ہیں) حدیث ان من افضل ایامکم یوم الجمعۃ الخ کے طرق پر لکھا ہے جس کا الترغیب میں اس حدیث کے تحت تذکرہ ہے[4]

(۱۱) ایک رسالہ میں مصنف نے ان تمام روایات کو جمع کیا ہے جن میں مختلف اعمال پر غفرلہ ما تقدم من ذنبہ وما تاخر (اس کے کرنے والے کے اگلے

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص۶۲ [1] بسلسلۂ تعارف وفیات النقلۃ [2] بغیۃ الوعاۃ ص۲
[3] الترغیب والترہیب ج ۱ ص۱۵۷ [4] الترغیب ج ۱ ص۴۹۱۔

پچھلے تمام گناہ بخش دیے جائیں گے) کی بشارت سنائی گئی ہے۔ اس رسالہ کا ذکر کشف الظنون میں جزء المنذری کے نام سے ہے اور علامہ عزیزی نے بھی السراج المنیر شرح الجامع الصغیر میں علقمی کے حوالہ سے حدیث من قرأ اذا سلم الامام یوم الجمعۃ قبل ان یثنی رجلیہ فاتحۃ الکتاب الخ کے تحت منذری کے اس رسالہ کا ذکر کیا ہے[1]۔

(۱۲) ایک رسالہ میں حدیث من حفظ علی امتی اربعین حدیثا من امر دینھا الخ کے طرق اور اس کی صحت وسقم کے متعلق اہل علم کی رائیں وغیرہ جمع کی ہیں۔ اس کا تذکرہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے التلخیص الحبیر میں کیا ہے[2]۔

(۱۳) "عمل الیوم واللیلۃ" اس کتاب میں رات دن کے معمولات، عبادات، اذکار اور دعوات جمع کی ہیں۔ اس کتاب میں حافظ منذری نے کہا ہے کہ اس موضوع پر اہل علم نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے بہترین کتاب امام ابو عبد الرحمٰن النسائی (المتوفی ۳۰۳ھ) کی ہے اور اس سے بھی بہتر کتاب ان کے شاگرد حافظ احمد بن محمد المعروف با بن السنی (المتوفی ۳۶۴ھ) کی ہے۔ نیز حافظ منذری لکھتے ہیں

وھو اجمع الکتب فی ھذا الفن لکنھا مطولۃ قال فحذفت الاسانید لضعف ھمم الطالبین۔	اس موضوع پر یہ کتاب سب سے زیادہ جامع ہے لیکن طویل بہت ہے اور لوگوں کی ہمتیں پست ہو گئیں اس لیے میں نے اس کی سندیں حذف کر دیں۔

اس طرح گویا منذری کی یہ کتاب ان کی الترغیب والترہیب کی طرح صرف متونِ حدیث پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا تذکرہ اور مصنف کے بیان سے کتاب کا

---

[1] السراج المنیر ج ۳ ص ۳۵۵ (مطبع میمنیہ مصر ۱۳۱۲ھ) [2] مقدمۃ لامع الدراری علی جامع البخاری ص ۱۵۵ از استاذ محترم مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہٗ (طباعت ثالثہ لکھنؤ ۱۳۹۱ھ)

یہ تعارف صاحب کشف الظنون نے نقل کیا ہے۔[1]

(۱۴) ایک رسالہ میں وہ تمام روایات جمع کی ہیں جنمیں دعا کرتے وقت ہاتھوں کے اٹھانے کا ذکر ہے۔ اس رسالہ کا تذکرہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے شرح بخاری کتاب الدعوات کے باب رفع الایدی فی الدعاء کے تحت کیا ہے لکھتے ہیں:۔

فان فیه احادیث کثیرۃ افردها المنذری فی جزء۔[2]

اس سلسلہ میں بہت سی حدیثیں ہیں، حافظ منذری نے ان سب کو ایک مستقل رسالہ میں جمع کر دیا ہے۔

(۱۵) الفوائد المتفرقۃ مؤرخ ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں محی السنۃ حسین بن مسعود الفراء البغوی کے حالات میں اس کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے اس کا قلمی نسخہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا ہے۔ بغوی کا سنِ وفات ۵۱۰ھ لکھنے کے بعد ابن خلکان نے لکھا ہے کہ:۔

ورأیت فی کتاب الفوائد المتفرقۃ التی جمعها الشیخ الحافظ زکی الدین عبد العظیم المنذری انه توفی سنة ست عشرۃ وخمسمائة ومن خطه نقلت هذا۔ والله اعلم۔[3]

اور میں نے الفوائد المتفرقۃ جو حافظ زکی الدین عبد العظیم المنذری کی تالیف ہے اس میں دیکھا ہے کہ بغوی کی وفات سن پانچ سو سولہ ہجری میں ہوئی ہے۔ اور میں نے مصنف کے قلم سے لکھی ہوئی عبارت سے نقل کیا ہے۔

(۱۶) کفایۃ المتعبد وتحفۃ المتزهد یہ رسالہ اعمال صالحہ کے اجر و ثواب کے موضوع پر ہے۔ اس کے شروع میں مصنف نے لکھا ہے:۔

---

[1] کشف الظنون۔ حرف العین ج ۲ ص ۱۳۶ [2] فتح الباری ج ۱۱ ص ۱۲ [3] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۱۴۶، راقم سطور کہتا ہے کہ صحیح سن وفات ۵۱۶ھ ہی ہے جیسا کہ تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۵۲ شذرات الذہب ج ۴ ص ۴۸ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۴۴۲ وغیرہ میں ہے۔

وبعد فان اخی ابا احمد عبدالکریم	میرے بھائی ابو احمد عبدالکریم نے مجھ سے خواہش
سالنی ان اجمع لہ کتابا فی ثواب	ظاہر کی کہ میں اس کے لیے ایک رسالہ اعمال کے
الاعمال وفضائلھا محذوف	فضائل کے موضوع پر لکھ دوں جس میں احادیث کی
الاسانید لیسھل علیہ حفظہ۔	سندیں حذف کر دی گئی ہوں تاکہ آسانی سے یاد ہو سکیں۔

یہ رسالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول نماز کے بیان میں۔ باب دوم روزہ کے بیان میں۔ باب سوم صدقہ (وزکوۃ) کے بیان میں اور باب چہارم ذکر و دعاء اور درود شریف کے بیان میں۔ یہ رسالہ ۱۳۴۶ھ میں الرسائل المنیریہ کے مجموعہ کے ساتھ ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ مصر سے شائع ہو چکا ہے[1]۔

اب تک حافظ منذری کی یہ کل سولہ تصانیف معلوم ہو سکی ہیں۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً۔

شعر و ادب عام قاعدہ ہے کہ جب کسی شخص کی دل چسپی اور انہماک کسی ایک فن میں بڑھ جاتا ہے تو دیگر فنون خواہ وہ ان میں کتنی ہی مہارت رکھتا ہو، دب کر رہ جاتے ہیں۔ حافظ منذری کے فقہ اور قرأت کے متعلق پہلے آچکا ہے اور یہی حال ان کے ادب اور دیگر علوم و فنون کا بھی ہوا۔ ان کے اشتغال بالحدیث نے ادب، فقہ تاریخ اور قرأت وغیرہ سب پر پردہ ڈال دیا۔ حافظ ذہبی اور دوسرے سوانح نگاروں نے ان کے متعلق ادب اور علوم عربیہ میں مہارت کا بھی ذکر کیا ہے علامہ سیوطی نے حسن المحاضرہ میں لکھا ہے[2]:-

---

[1] الرسائل المنیریۃ ج ۳ ص۶۶ تا ص۸۳ [2] علامہ جلال الدین سیوطی نے حسن المحاضرہ میں جہاں مصر کے فقہاء شافعیہ کا ذکر کیا ہے۔ ان میں حافظ زکی الدین منذری کا بھی ذکر کیا ہے (حسن المحاضرۃ - ج ۱ ص۱۶۷)

و اماما حجة بارعا فی الفقہ والعربیة والقرآآت[1]	آپ فقہ عربیۃ اور قرأۃ کے فنون میں بھی امام کامل اور سند تھے۔

ابن تغری بردی نے لکھا ہے:-

جمع فی العربیۃ والفقہ[2]	یعنی آپکو فقہ اور عربیت میں بھی کمال حاصل تھا۔

علامہ سیوطی نے صوفیاء مصر کے بیان میں الامام الفقیہ الصوفی حسن بن عبدالرحیم القنائی کے حالات کے تحت لکھا ہے کہ حافظ منذری نے ان کے بہت سے اشعار بھی روایت کیے ہیں اور ان کی دعاؤں کے برکات بھی حاصل کیے ہیں[3]۔

علامہ تاج الدین سبکی نے حافظ منذری کے اشعار میں سے صرف یہ دو شعر بطور نمونہ نقل کیے ہیں ؎

اعمل لنفسك صالحا لا تحتفل بظهور قيل في الانام وقال

فالخلق لا يرجى اجتماع قلوبهم لا بد من مثن عليك وقالی

ترجمہ :- (۱) اپنی ذات کے لیے نیکیاں کرتے رہو اور لوگوں کی قیل وقال (کہنے سننے) کی کچھ پرواہ نہ کرو۔

(۲) اس لیے کہ لوگوں سے اس بات کی کوئی توقع نہیں ہے کہ ان کے دل کسی ایک بات پر مجتمع ہو جائیں گے (اور جب یہ نہیں ہو سکتا تو) ضروری ہے کہ کچھ تمہاری تعریف کریں اور کچھ نکتہ چینیاں کریں۔ یعنی بقول غالب: ؎

غالب برا نہ مانیے گر برا کوئی کہے ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہیں جسے

تقوی و پرہیزگاری: حافظ منذری رحمۃ اللہ علیہ کو خدائے تعالےٰ نے ظاہری

---

[1] حسن المحاضرۃ للسیوطی ج ۱ ص ۱۴۹ [2] شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۷۷۔
[3] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۲۲۲

علوم میں پوری مہارت کے ساتھ ساتھ باطن کی روشنی سے بھی بہرہ حصہ عطا فرمایا تھا۔ تمام تذکرہ نویسوں نے ان کے زہد و تقویٰ کا بہت اہتمام سے ذکر کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے لکھا ہے کان ذا نسك وتزهد[1] یعنی عبادت گزار اور زاہد آدمی تھے۔ تاج الدین سبکی نے ان الفاظ کے ساتھ ان کا ذکر شروع کیا ہے:۔ الحافظ الکبیر الورع الزاهد یعنی بڑے حافظ، پرہیزگار اور زاہد۔۔۔۔ آگے لکھتے ہیں ترتجی الرحمة بذکرہ ویستنزل رضی الرحمٰن بدعائه کان رحمه الله تعالیٰ قد اوتی بالمکیال الاوفی من الورع والتقویٰ[2]۔ یعنی ان کے تذکرے سے رحمت الٰہی کے نزول کی امید کی جاتی ہے۔ اور ان کی دعا کے ذریعہ خدا کی رضا حاصل کی جاتی ہے۔ آپ کو تقویٰ پرہیزگاری سے بھرپور حصہ ملا تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں واما ورعه فاشهر من ان یحکی[3]۔ یعنی ان کی پرہیزگاری کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ہم گزشتہ صفحات میں نقل کر چکے ہیں مجدد عصر حافظ ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ منذری کی دیانت و تقویٰ کے معترف تھے۔ حافظ دمیاطی نے زکی الدین منذری کی پرہیزگاری اور احتیاط کا ایک چشم دید واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک بار حافظ منذری حمام سے نکلے تو گرمی کی شدت سے چل نہ سکے اور بے بس ہو کر راستہ کے کنارے ایک دکان کے قریب لیٹ گئے۔ حافظ دمیاطی کہتے ہیں کہ دکان بند تھی۔ میں نے عرض کیا کہ محترم المقام آپ کو (بجائے نیچے زمین پر لیٹنے کے) اس دکان کے چبوترے پر بٹھا دیتا ہوں، تو حافظ منذری نے اس شدت کی کمزوری اور غشی کے عالم میں

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۲۱۔ [2] طبقات الشافعیہ للسبکی ج ۵ ص ۱۰۸
[3] طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۰۹۔

جواب دیا کہ بغیر اذن صاحبِ مکین مکو شٹی یعنی مالک کی اجازت کے بغیر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ دمیاطی کہتے ہیں کہ باوجود کوشش کے شیخ منذری دکان کے چبوترے پر بیٹھنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

جو شخص علوم شریعت میں شغف کے ساتھ ساتھ معرفتِ خداوندی اور عشقِ نبوی کا بھی محرمِ راز ہو تو دنیا میں پھر اس سے زیادہ خوش نصیب کون ہوگا! حافظ منذری کو خدا تعالیٰ نے دونوں دولتوں سے خوب نوازا تھا اور اس ظاہری اشتغال بالحدیث کے ساتھ باطنی تعلق سے منذری کو احادیث کے پرکھنے میں بھی مدد ملی۔ انھوں نے حدیثوں کے متعلق فیصلہ تو انھی اصول کے تحت کیا جو علماء حدیث کے یہاں طے شدہ ہیں لیکن اپنے نورِ بصیرت سے بھی کہیں کہیں اس راہ میں انھوں نے کام ضرور لیا ہے چنانچہ اپنی اس کتاب الترغیب والترھیب کی ایک جگہ مشہور حدیث ـ

ازھد فی الدنیا یحبک اللہ وازھد فیما ایدی الناس یحبک الناس۔[۲] — دنیا سے بے نیازی اختیار کرو خدا کے محبوب بن جاؤ گے اور لوگوں کے ہاتھوں میں جو کچھ ہے اس سے بے رغبت ہو جاؤ لوگوں کے محبوب بن جاؤ گے

---

[۲] یہ حدیث بہت سے محدثین نے روایت کی ہے۔ ابن ماجہ، طبرانی، حاکم، بیہقی فی شعب الایمان، عقیلی، ابن عدی، ابن ابی حاتم، خطیب، ابونعیم، ابن حبان فی الثقات و فی الضعفاء، ابوعبید القاسم بن سلام فی کتاب المواعظ، ابن ابی الدنیا فی کتاب ذم الدنیا عن سہل بن سعد۔ نووی اور عراقی نے اسے حسن کہا ہے۔ ابن حبان نے اسے ثقات میں ذکر کیا ہے مگر حافظ ابن رجب حنبلی نے دلائل کے ساتھ اس سے اختلاف کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسکی حمایت میں حسن لغیرہ کے الفاظ کہے جا سکتے ہیں جیسا کہ ملا علی قاری نے شرح اربعین میں اختیار کیا ہے (الترغیب ج ۴ ص ۱۵۰، المشکاۃ بشرحہ المرقاۃ ج ۵ ص ۳۳، جامع صغیر بشرحہ السراج المنیر ج ۱ ص ۱۸۵، شرح اربعین النوویہ للقاری الہروی ص ۱۷۹، جامع العلوم والحکم لابن رجب ص ۲۰۵، المقاصد الحسنۃ للسخاوی ص ۲۴۳۔

نوٹ: صاحب مشکوۃ نے اس حدیث میں ترمذی کا بھی حوالہ دیا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔

گفتگو کرتے ہوئے اس کے ایک راوی خالد بن عمرو القرشی الاموی السعیدی کے متعلق لکھا ہے کہ یہ متروک و متہم ہے اور میں نے کوئی ایسا کی توثیق کرنے والا نہیں پایا اور جن بعض مشائخ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے ان کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "فیہ بعد" یعنی یہ بات بعید ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کا نورِ بصیرت انھیں کچھ اور بھی کہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:—

لکن علی ھذا الحدیث لامعۃ من الانوار النبوۃ ولا یمنع کون راوٖہ ضعیفا ان یکون النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالہ[1]	لیکن اس حدیث پر انوارِ نبوت کی شعاعیں محسوس ہو رہی ہیں اور راوی کے کمزور ہونے سے یہ بات ضروری نہیں ہو جاتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات زبانی بیان نہ ہو۔

مطلب یہ ہے کہ راوی کے کمزور ہونے سے تو صرف اتنا معلوم ہو گیا کہ اس حدیث کے ہم تک پہنچنے کا واسطہ کمزور ہے لیکن یہ بات کہ زبانِ نبوت سے واقعہ یہ الفاظ نکلے تھے یا نہیں؟ بالکل الگ چیز ہے۔ اس کے بعد مصنف نے ایک دوسری سند سے اس کی متابعت و تائید کی ہے۔ لیکن ہمیں تو اس جگہ صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس حدیث کی تائید و توثیق کا اصل محرک درحقیقت وہی سخن شناس نورِ باطن ہے جس نے اس میں ان کو نبوت کی جھلک دکھائی ہے ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

حافظ منذری کے اسی زاہدانہ مزاج کا اثر ہے کہ انھوں نے الترغیب والترہیب کے اندر صرف ایک باب باب الترغیب فی الزھد فی الدنیا والاکتفاء منھا بالتقلیل کے تحت ایک سو سڑسٹھ روایتیں جمع کی ہیں جبکہ

---

[1] الترغیب والترہیب ج ۴ ص ۱۵۷۔

ہیں کہ طالب پوری کتاب میں کسی باب کے اندر بھی اتنی روایات نہیں ہیں۔ ان روایات میں آپ نے موضوع احادیث بھی لکھی ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے آثار و معمولات بھی نقل کیے ہیں اور اس کے بعد بھی سیری نہیں ہوئی۔ چنانچہ لکھا ہے:۔

ولو بسطنا الكلام على سيرة السلف وذهدهم لكان من ذلك مجلدات لكنه ليس من شرط كتابنا وانما املينا هذه النبذة استطرادا تبركا بذكرهم[1]

اور اگر ہم اسلاف کی سیرت تفصیل سے بیان کریں تو کئی جلدیں تیار ہو جائیں لیکن یہ بات ہماری کتاب کی شرائط کے موافق نہیں ہے۔ ہم نے تو یہ کچھ تھوڑا سا محض ضمنی طور پر بغرض تبرک لکھوا دیا ہے۔

وفات: علوم شریعت اور احادیث نبوت کا یہ آفتاب فتنۂ تاتار کے سال چار ذلقعدہ سن چھ سو چھپن ہجری (۶۵۶ھ مطابق ۱۲۵۹ء) کو غروب ہو گیا اور مصر میں کوہ مقطم کے دامن میں تدفین ہوئی۔[2] رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ۔

---

[1] الترغیب ج ۴ ص ۲۲۶ و ص ۲۲۷۔ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۲۱/۲۲۲ طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۱۰۸ ص ۱۰۹، مقدمۃ الترغیب للمصنف، حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۴۹، شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۷۷ ص ۲۷۸، البدایۃ والنہایۃ ج ۱۳ ص ۲۱۲

نوٹ:۔ ہم نے جہاں کہیں کوئی حوالہ نہیں دیا ہے وہاں انھیں کتابوں سے ماخوذ سمجھئے اور ان کے علاوہ ہم نے مصنف کے حالات معلوم کرنے کے لیے ان کی کتاب الترغیب والترہیب سے بھی مدد لی ہے۔

عہدِ تاناشاہ کا ایک گمنام شاعر

۱۰۹۶ھ مطابق ۱۶۸۵ء

از جناب ڈاکٹر نور السعید اختر بمبئی

عروس البلاد بمبئی اپنی گوناگوں صفات کی بنا پر رشکِ جناں بنی ہوئی ہے حسن کی رعنائیاں صبح کی قیامت خیزیاں اور شام کی رنگینیاں یہاں کی از حد مصروف زندگی کو قدرے سکون پہنچاتی ہیں. علاوہ ازیں اس عروسِ نو کے گہوارے میں علوم و فنون کی پرورش بھی ہوتی رہی ہے. اور آج بھی علم و فن کے پروانے اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں. اس ضمن میں جامعہ بمبئی کی خدمات قابلِ ستائش ہیں. محققین کے لیے جامعہ بمبئی کا کتب خانہ آبِ حیواں سے کم نہیں ہے. اس کی وسیع و عریض عمارت نہایت پرکشش ہے اس میں نادر و نایاب قلمی مخطوطات کی بہتات ہے. یہ اور بات ہے کہ یہاں قدیم اردو کے نوادرات اور مخطوطات زیادہ نہیں ہیں البتہ چند مخطوطے ایسے ہیں جو امتیازی حیثیت رکھتے ہیں. ان میں مُلّا وجہی کی تاج الحقائق. وجدی کی "پنچھی باچھا" اور محمد(ی) کی "لوراک اور مینا" قابلِ ذکر ہیں. ذیل کی سطور میں ایک بیاض نما مخطوطے کا تعارف پیش کیا جاتا ہے. جس میں عہد تاناشاہ کے ایک گمنام شاعر کا عملی نامہ بھی موجود ہے.

مجموعہ مثنویات :- اس مجموعہ میں چھ مخطوطے مجلد ہیں. عبدالقادر سرفراز صاحب کی مرتب کردہ فہرستِ مخطوطات میں اس کا سلسلہ نمبر ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶ اور ۴۷ ہے

مجموعہ کا کیٹلاگ نمبر ۱۳ اور فہرست میں ان مخطوطات پر سرسری معلومات صفحہ ۱۱۷ پر درج ہے۔ اس مضمون میں پہلے تین مخطوطات ہی کا تعارف ہے۔ بقیہ مخطوطات کا تفصیلی تعارف آئندہ مضمون میں کیا جائے گا۔

(۱) مخطوطہ نمبر ۲۲۴:۔ معراج نامہ :— قدیم اردو میں معراج نامے بہت ملتے ہیں۔ یہ مخطوطہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ معراج کا ذکر ہے۔ اس کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے

الٰہی توں قادر ہے سنسار کا	تو آدھار ہے سب نردھار کا
رحیاں توں حاکم ہے صاحب سچا	توں ایک امر کے بیچ سب جگ رچیا
کیا سات آسمان یک تل منے	سوا ذوق جس سات[۱] تجہ دل منے
سو چوڈا[۲] طبق توں کیا ذوق سوں	دیا رنگ ہور روپ توں شوق سوں
احد میانی اول جو توں ایک تھا	نہ تھا کس کوں معلوم کیا بھید تھا

اس کے بعد اسمائے محمدی کا تفصیلی بیان ہے اور خلفائے راشدین کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ معراج کے بیان میں شاعر کا زور بیان ملاحظہ ہو۔

سہیلے شہنشہ یو گانے لگے	کتک جنس باجے بجانے لگے
سو چوتھے فلک پر چڑے[۲] جوں نتاب	کر باندھا حاضر سوا آفتاب

. . . .

ترا نور اگر ملیا نور میں	ندی جیوں ملے جا کو[۳] سمندر میں
ندی کا کہاں[۵] ناؤں سمندر رہا	ترا ہور میرا ملکو[۵] یک نور ہوا

---

۱ ساعت ۲ چڑھے ۳ جاکر سمندر ۴ کہاں ۵ مل کر۔

کتک[1] بات ظاہر کرو کر کہا کتک بات مخفی رکھو کہا

معراج کے بعد جبریل علیہ السلام حضور سے مخاطب ہوا۔

نبی نے سو سر بھو یں دہرے ہو ر چلے کتک دور پر جبریل آ ملے

کہے تم دوگانہ کرو آج کا شکر تم بجالاؤ معراج کا

....

آئندہ اشعار میں شاعر کہتا ہے۔

اوسی ٹھار دیکھے اونٹا نکا قطار بجز حق ندستا کیسے واں شمار

یو آتے کدھر سوں سو جاتے کدھر نہ تھا کس کو معلوم کیا ہے اوپر

حکم یوں سو ا بیلا اونٹ کوں دیکھا کھول صندوق دیپا ہیں توں

کسی یہودی نے واقعہ معراج پر شبہ ظاہر کیا اس امر کی وضاحت میں

اشعار ملاحظہ ہوں۔

یو سنتے اڈٹیا بول یک نابکار کہا یک جہودسوں رلا ٹھا بئیں عار

بچھایا گرم تھا سو کیا کیوں تجھے سراسر جھوٹی بات لگتی مجھے

جہودی کہا نقل مشہور ہے مونس سوا تھا سو منشور ہے

نبی کی زباں کو جھوٹ کے کیا سو یک ساتھ میں سات ٹکڑے جیا

معراج نامے کا اختتام ان اشعار پر ہوتا ہے۔

نبیاں کا تجے شاہ حق نے دیا ولایت نبوت ازل سے دیا

ادسے سو پنج برحق رچا سہرا دیا مجھ عاجز کوں سلطان قلم کیا

رجب کی چھبیسویں یو نامہ تمام بحق محمد علیہ السلام

---

[1] کتنی [2] میٹھا [3] باہر [4] بستر [5] کہوں [6] کہا [7] مار [8] مڑ کے

عبدالقادر سرفراز صاحب مرتب فہرست مخطوطات نے اس معراج نامے کے مصنف اس کے نام یا تخلص کی صراحت نہیں کی۔ دکن میں عاجز تخلص کرنے والے چند شاعر ہیں لیکن یہ عاجز اُن سے بالکل مختلف ہیں۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ ان کا نام اعظم تھا اور وہ عاجز تخلص کرتے تھے۔ اختتامیہ اشعار ہمارے اس خیال کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

مخطوطہ کے کل صفحات گیارہ ہیں اور ہر صفحہ ۱۳ سطری ہے۔ کل اشعار کی تعداد ۲۷۰ ہے۔ کاتب کا نام غیاث خط نستعلیق ہے اور سنہ کتابت اس طرح درج ہے:-

"تمت الکتاب یازدہم در شوال المکرم ۱۱۸۶ھ روز پنج شنبہ
در بندر میلاپور در پاس اول باتمام رسید۔"

عیسوی سن کے اعتبار سے یہ مخطوطہ جمعرات ۱۱ر شوال ۱۱۸۶ھ یعنی ۵ار دسمبر ۱۷۷۲ عیسوی میں بندرگاہ میلاپور میں غیاث نامی کاتب نے نقل کیا۔

وجود نامہ مخطوطہ (نمبر۳۱۳) } ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اس نظم کا نام[1] "روح اور تن کا مکالمہ" بتایا ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سرفراز نے اس نظم کو "وجود نامہ" قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر زور کا خیال زیادہ درست ہے۔ البتہ یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ نظم شیخ محمود خوش دہاں ہی کی ہے۔ شیخ محمود خوش دہاں[2] کی ایک نظم اور رسالہ بنام "واجب الوجود" بھی ملتا ہے۔ دراصل اس نظم میں

[حاشیہ پر: کی ایک اور تصنیف معرفت السلوک کا بھی پتہ چلتا ہے اس کے علاوہ شیخ محمود]

---

[1] تذکرۂ مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو جلد سوم صفحہ ۲۸۳

[2] فن مجاہدہ - ۳۰۰ - اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد۔

ایسی کوئی اندرونی شہادت نہیں ہے. جس کی بنا پر ہم اس نظم کو شیخ محمود خوش دہاں کی تسلیم کریں. لیکن ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ نے شیخ محمود نامی شاعر کی کئی چھوٹی چھوٹی نظموں کا تعارف "سکھ انجن"[۱] میں پیش کیا ہے ان کا خیال ہے یہ نظمیں شیخ محمود خوش دہاں ہی کی ہو سکتی ہیں. کیوں کہ ان نظموں کے موضوعات میں یکسانیت پائی جاتی ہے. موصوفہ نے روح اور تن کے مکالمے کو بھی شیخ محمود خوش دہاں کی نظموں میں غیر یقینی طور پر شمار کیا ہے. ملاحظہ کے لیے مکمل نظم پیش کی جا رہی ہے.

سوال

الس حکم تے پاک پروردگار ۱ وجود سوں جیوں کوں ملا ایک ٹھار
کہ بھیجیا تھا دنیا میں تیری برات ۲ بولانے کا وعدہ کیا اس سنگات
لکھیا تھا جو قسمت میں اوسکے جیتے ۳ دیکھیا کھول باقی رہیا نیں رتے
اوسی سات انکوں جو بھیجیا طلب ۴ دو نو میانے بچھر اڑیا تھا قلب
یکسکوں ملاتا ہے یک مانگ میں ۵ یکسکوں ملاتا ہے بس خاک میں
وجود سوں جیو میں لگی گفتگو ۶ خوبی کان دہر کر سنو یار ہو
وجود نے کہا یو نکہ سن اے جیا ۷ یتے دین (دن) ملکر تو منج میں رہیا
کیا زندگانی تو یں منجہ سات رل ۸ منجے چھوڑ تنہا نجب ٹیک تل
ہمارے تمہارے میں اتنا سلوک ۹ دو نو مل کو پھرتے تھے ملکی ملوک
محبت مروت سیتا جور کر ۱۰ نکو جا رے تنہا منجے چھوڑ کر
ہمیں دو نو چلتے تھے ایکچہ طریق ۱۱ درد سوں دکھ میں ایتا یو رفیق
تیرے سنگ سوں سیلے تھے سکی (دکھی) ۱۲ بغرض تیری او منجے کیا لگی

---

[۱] سکھ انجن از شاہ ابوالحسن قادری. مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر ص ۴۱-۴۲

متاع تو دیتا کچھ ملا کر رکھے ۱۳ دونو میانے یک کوں لجانا سکے
چلیا جیو منجہ سوں تو یوں شادو کر ۱۴ اسے سات یونگی لوٹ کر
بہا تجھ بن جو مجکوں سو عزت نتھی ۱۵ گھری (گھڑی) یک (ایک) تجہ بات لذت نتھی
جو کوئی آ کو دیکھے سو کہتے ہیں یوں ۱۶ بتا وقت اس کوں رکھے ہیں سو کیوں؟
اتہا میں ہمیشہ تیری بات میں ۱۷ جتا حکم تھا سب تیرے ہات میں
ترے حکم سوں میں یو فارخ نتھا ۱۸ اتا توں تو جانا منجے کیا کت

(جواب)

دیا جواب جیونے کہ سن اے جیا ۱۹ تی ذن جو ملکر تو منجیں رہیا
اصل میں تو ہوں میں خدا کا امر ۲۰ رہوں گا تو جب لگ جو تیری عمر
کیا تھا الٰہی جو تیری دنبال ۲۱ کیا تھا جو مجکوں توں اسکوں سنبھال
ترے سات تھا میں سو اور رات دن ۲۲ میرے پر مشقت پڑ رہتی سنگن[1]
تیری قد و قامت کے رنگ ہور شکل ۲۳ کہ دنیا میں ظاہر اہے یو نقل
تجے میں چرایا (چڑھایا) تھا اونچی صدر ۲۴ نہیں کوئی سمجھیا توں میری قدر
ترے ہوں تو میں کچھ منا یا اتھا ۲۵ دیکھیا ہوں ترے سات میں یہی جفا
میں محنت مشقت سوں کاڑا کیا ۲۶ تری قوت کا سب یو چارا کیا
اتا بس ہے منج کوں تیرا سنگ یو ۲۷ تیرے سنگ سوں میں چلیا ذنگ ہو
ترے سات منجہ پر یو قصہ گھربا (گھڑیا) ۲۸ اخر جواب دینا سو مشکل پڑیا

کہے شیخ محمود سن اے اصیل
قیامت میں پوچھیگا دونوں کوں میل[2]
۲۹

---

[1] ہمیشہ - [2] بل -

اس نظم کو بھی غیاث نامی کاتب نے ۱۱۸۰ھ مطابق ۱۷۶۶ء میں بقدر ۴ سمہ میلا پور (مدراس) میں نقل کیا ہے۔

علی نامہ از آدم منصور گو لکنڈوی مخطوطہ نمبر ۱۴۱ | قدیم اردو میں کئی علی نامے موجود ہیں۔ نصرتی کے علی نامے کو خاص شہرت حاصل ہے۔ زیرِ نظر علی نامہ حالانکہ کسی فارسی قصے کا ماحصل ہے لیکن چند باتوں کی بنا پر ہماری خاص توجہ کا حامل ہے۔ قدیم اردو کی تاریخوں کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ابوالحسن قطب شاہ کے عہد میں (۱۰۸۳ھ / ۱۰۹۸ھ مطابق ۱۶۷۲ء / ۱۶۸۶ء) فائز، نوری، لطیف، شاہی، مرزا، غلام علی وغیرہ جیسے باکمال شاعر موجود تھے۔ افسوس ہے کہ تمام تذکرے اور تاریخیں آدم منصور کے ذکر سے خالی ہیں۔ راقم الحروف کی تحقیق کے بموجب آدم منصور کا نام اس فہرست میں شامل کرنا ضروری ہے یہ اور بات ہے کہ ہمیں آدم منصور کے حالاتِ زندگی کا پوری طرح علم نہیں ہے لیکن "علی نامہ" کے اختتامیہ اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہی سلطنت کا آخری تاجدار ابوالحسن تاناشاہ آدم منصور کا بڑا قدر دان تھا۔ اس نے آدم کو منصور کے لقب سے نوازا تھا۔ آدم اپنے متعلق انکساری سے کام لیتے ہوئے کہتا ہے کہ نہ وہ شاعر ہے اور نہ شاعری اس کا شعار ہے۔ البتہ یہ مثنوی اس کے اثنا عشری ہونے کی بین دلیل ہے۔

نہ شاعر ہوں میں ہور نا شاعری — نہ منجم ہوں میں ہور نا ساحری
اپن طبع کے جھاڑ کے خیال کوں — بہرحال لایا ہوں میں بار کوں

یہ علی نامہ ۳۵۰ ابیات پر مشتمل ہے اور اس کو دیکھ کر آدم منصور کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ واضح امر ہے کہ آدم نے ایک فارسی قصے کو دکھنی جامہ پہنایا ہے لیکن اس نے اپنی فنکاری سے قدیم اردو کی اس نظم کو کافی موثر بنا دیا ہے۔ آج سے تین سو سال قبل آدم منصور کی یہ کوشش لائقِ تحسین و آفرین ہے

اس مثنوی کی زبان صاف شستہ اور سلیس ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری رسائی اصل قصے تک نہ ہو پائی۔ ورنہ دونوں کا مقابلہ پیش کیا جا سکتا تھا۔ تب بھی ادبی نقطۂ نظر سے یہ مثنوی اہم مقام رکھتی ہے۔ اس علی نامہ کو جنگ نامہ علی یا جنّی رعد بھی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ بقول پروفیسر عبدالقادر سرفراز سہ

THE MASANAVI DEALS WITH ALIS COMBATS WITH THE JINNE DWELLING AT THE BOTTOM OF THE WELL CALLED بیرالعلم IN ARABIA
("DESCRIPTION CATALOUGE OF ARABIC PERSION AND URDU BY S.A. KADIR SARFARAZ B.U.P (17)

علی نامہ کی ابتدا روایتی انداز میں حمد باری تعالیٰ سے ہوتی ہے:۔

اول میں کروں بسم اللہ کا بیاں ۱ کیا ہے الٰہی یاں سب عیاں
کہ رحمان روزے دہندہ ہے آپ ۲ جہانگ ہے ہندو مسلمان سب
رحیم او جو بخشندہ آخر کا سب ۳ جہانگ ہے مومن مسلمان سب
جو کھولوں زباں میں بنام خدا ۴ محمد علیؑ سور امیر الہدا
وہی دستگیر سور وہی رہنما ۵ وہی بادشاہ ہے زمین و زماں
گرائے گر منگتا ہے پائے نجات ۶ بغیر از علی کا صفت کر نہ بات

اس کے بعد نعتیہ اشعار ہیں اور پھر مثنوی کے اصل ماخذ کی طرف ان اشعار میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اتھا اصل میں نظم یو فارسی ۷ سو کھولے اس کے معنی کیا آرسی
سو یو اصل جھگڑا ہے بیرالعلم ۸ جو روشن کیا جگ جنیں شہ کا علم
کتا ہوں او جھگڑا اتا کھول کر ۹ سو خوب سمجھو تمیں کان دھر

حضرت علی کی شجاعت کی یہ داستان یوں شروع ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلعم لشکر باصفا کے ہمراہ ایسے جنگل میں جا پہنچے جہاں پانی نہیں تھا۔ رسول اکرم نے ساقی کوثر حضرت علی مرتضیٰ کو حکم دیا کہ دلدل پر سوار ہو کر پانی کی تلاش میں جائیں۔ حضرت علی رض نے حکم کی فوراً تعمیل کی۔ کچھ دور جانے پر انھیں ایک محل (میدان) نظر آیا، جہاں پر ایک کافر بت پرستی میں مشغول تھا۔ حضرت علی رض نے جب یہ ماجرا دیکھا تو انھیں غصہ آگیا۔ انھوں نے اس ڈیڑھ سو سالہ بوڑھے کو دعوتِ حق دی۔ بوڑھے نے فوراً ایک شرط رکھی کہ اگر اس کی ہمسایہ بڑھیا دعوتِ حق قبول کرتی ہے تو وہ فوراً اسلام قبول کرلے گا۔ حضرت اس بڑھیا کو نبی کریم کے پاس لے گئے۔ حضور پر نور بڑھیا سے مخاطب ہوئے۔ بڑھیا نے بھی قبول اسلام کے لیے یہ شرط لگادی کہ اس کی رہائش گاہ کے قریب ایک خوفناک جنگل ہے جس میں ایک بڑا سا کنواں ہے۔ یہ جنگل شیروں اور اژدہوں سے پٹا پڑا ہے۔ جو کوئی اس جنگل میں جاتا ہے وہ لوٹ کر نہیں آتا۔ لہٰذا جو بھی اس جنگل سے فتحیاب ہو کر آئیگا وہ فوراً اسلام قبول کرلے گی۔ اب آدم کی زبانی داستان سنیے:-

لے سنگات لشکر کے تئیں مصطفا ۱۰ چلے ایک جنگل منے باصفا
نہ تھا نیر کس اس جنگل میں تمام ۱۱ قضا را نبی آرہے اُس مقام
دیکھے اس جنگل میں تو پانی نہیں ۱۲ رہے دھند[۱] دھند کر پشیماں ہی
محمد کہے یوں علی کوں ولی ۱۳ تو ساقی کوثر ہے روزِ جلی
چڑھو[۲] دلدل اُپر دہند جاں تہاں ۱۴ جو پیدا کرو نیر کوں تم یہاں

. . . .

کتک کہ (؟) نظر تل پڑی[۳] ناگہاں سو خوش حال علی بیر کو آئے وہاں

لہ ڈھونڈ ڈھونڈ ۲ے چڑھو۔ ۳ے گھوم کر

جو آ دیکھتے ہیں تو اس ہٹا پر — تھے خالی گھراں ہور نہتے کوئی بشر
تفکر میں تھے پھر[1] کو سب دیکھیے — سو یک پیر مرد وہاں پائیے
ملے او اتھا کافر بت پرست ۱۵ لے بت کو پرستا اتھا بت پرست

. . . .

سنیا سو بڈھا[2] ادتھا بول کر ۱۶ سو اپنا قصہ سب کہا کھول کر
کیا کہوں قصہ اپن حال کا ۱۷ بڈھا ہوں میں تھیو[3] پچاس سال کا
منجے ٹک عورت ہے ہمسایہ گی ۱۸ ادسے سب خبر ہے تمن دین کی
گرا د آئیں گی دیں میں مصطفا ۱۹ ادسی وقت ہے میں مسلماں ہوا

. . . .

اس عورت کے تیں مصطفا یو کہے ۲۰ لیوے دیں سو اد جنت میں رہے
کہی پیچ مسلماں ہونے سکی ۲۱ ولے ٹک حاجت سوں میں ہوں دوکھی
اس جنگل منے بائیں یک کھار ہے ۲۲ سو واں شیر اور اژدہا مار ہے
اس جنگل منے کوئی جاتا نہیں ۲۳ گیا تو ادسی بر کو آتا نہیں
اگر جا کر اس باں میں سوں جکوئی ۲۴ لگائے تیر تو میں مسلماں ہوئی

عورت کا تفصیلی بیاں سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روئے مبارک اصحاب کی طرف پھیرا اور گویا ہوئے، اس وقت تم سے کون جواں ہمتی کی داد طلب کرنا پسند کرے گا؟ مالک اشتر رضی نے شجاعت کے اس پیغام کو لبیک کہا۔ اور اجازت چاہی۔ وہ اس جنگل کی طرف بڑھے جس میں ہر طرف شور و غوغا رہتا تھا۔ در اصل یہ جنگل رعد جنی کی مملکت تھا۔ وہ قوم جنات کا سردار تھا

---

۱ گھوم کر ۲ بوڑھا ۳ کنواں ۴ جنگل ۔

اور لات و عزیٰ کی یہ پرستش کرتا تھا۔ اس وقت تک قوم جنات مشرف بہ اسلام نہیں ہوئی تھی۔ لہذا جنوں کے باعث انسانوں کو بے پناہ تکلیف تھی رعد جنی کے پاس بڑے نامی گرامی پہلوان شیر افگن سپاہی اور نامور ساحر موجود تھے۔ رعد جنی خود بھی آزمودہ کار صف شکن اور مشہور جادوگر تھا۔ صحابہ کرام اور دیگر افراد جب قوم جنات پر قابو نہ پا سکے تو حضور پر نور نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو رعد جنی کے مقابلے میں بھیجا۔ ایک طرف ٹولا کھ جنات کی فوج تھی اور دوسری طرف تن تنہا حضرت علی اور ان کی ذوالفقار۔ حضرت علی نے اسم اعظم کے ذریعے رعد جنی کے سحر کو باطل کر دیا اور ذوالفقار کے ذریعہ آدھی قوم جنات تہِ تیغ کر دی۔ حتیٰ کہ رعد جنی کا اکلوتا پہلوان بیٹا "راحیل" حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا۔ بالآخر خود رعد جنی میدانِ جنگ میں اتر آیا لیکن علی مرتضیٰ کے سامنے اُس کی ایک نہ چل سکی۔ وہ مارا گیا اور بقیہ قوم جنات نے اسلام قبول کر لیا۔

سو یہ بات سن کر نبی مصطفا ۲۵ پہر روخ اصحاب کے ادھر صفا
کہے کون ایسا جواں بجنت ہے ۲۶ شجاعت دیکھانا سو یے وقت ہے

. . . .

ترنگ پر تے مالک جو اترے نلار ۲۷ اٹھا غلغلہ بابیں میں یک بار
جو آواز آیا یوں اس غار سوں ۲۸ یکے نہاٹ جاؤتم استھار سوں
کہے مالک اشتر سو یار ا ہکے تئیں ۲۹ کہ کوئی جو اس میں اتـ ـائے دمیں
جو لائے گا جز کوئی اس بابیں کا ۳۰ سچا پوت اچھے گا دئی مایں کا

ملہ ہٹ

جو ہے حکم رب کا علی کے اُپر ۳۱ کرو جا کو جا کو سارے کفر

. . . .

علی کا قدم بائیں میں جیوں پڑیا ۳۲ سو اس بائیں میں لدھا بالا پڑیا

. . . .

اتھا فرزند رعد کو سنہجو اں ۳۳ سو تھا صورت خوب ہو مہرباں
کہ تھا او پری زادہ ہور حیل نام ۳۴ اتھا اُس منے سیرت تمام
بُلا رعد وی اپنے فرزند کوں ۳۵ مری جان ہور ماں[1] دلبند توں
اگر سچ تو فرزند میرا اہے ۳۶ کمر بند توں شہر تیرا اہے

. . . .

راحیل جب بغرضِ جنگ حیدرکرار کے سامنے پہنچا تو انھیں اس کی خوبصورتی پر ترس آیا اور انھوں نے سوال کیا۔

کیوں آیا تو اس تج منے بے زیاں ۳۷ نکئیں بات ہے نکئیں زوہاں

راحیل نے جواب دیا سے

رعد باپ میرا پری مائی[2] ہے ۳۸ سو پریاں کے راجا کی او جائی[3] ہے
میرا نام سو حیل جنگی اہے ۳۹ مرے ہات شمشیر ننگی اہے

راحیل حیدرکرار کے حملے کی تاب نہیں لاسکا اور حضرت کی دعوت اسلام صدقِ دل سے قبول کرلیتا ہے سے

کیا یوں کہ اے شاہ بخشیو منجے ۴۰ کہے کہ جو کلیمہ جو بخشوں تجے
بگی ہو مسلماں جو ہر دو جہاں ۴۱ ہوئے سرخ اچھے شادماں

---

[1] عزت [2] جگہ [3] ماں

راحیل مسلمان ہو گیا۔ رعد جنی کھانگیب اور کاری ضرب لگی وہ غصہ سے آگ بگولہ ہو گیا اور واویلا کرنے لگا ؎

دیکھا رعد جو اپنے بیٹے کو یوں ۲۱م لگیا بوبنے مار سینے کو یوں
سورلیش آپنا نوچنے لینے لگیا ۲۲م جو لہو انجو پونچھ بہنے لگیا
کہا ہائے ہائے دیکھو کیوں ہوا ۲۳م کہ بیٹا مرا جا مسلماں ہوا

رعد جنی کے نو لاکھ سپاہیوں نے شیر خدا اور راحیل کو گھیر لیا اور تیروں وغیرہ کی بوچھاڑ کر دی۔ یہاں تک کہ زمین و آسمان پناہ مانگنے لگے ؎

لگے مارنے گرز تیر و تفنگ ۲۵م جو باناں فرنگ کا ربوی لا؟) ہو جنگ
جو یوں دیکھ ہو گھابرا آسماں ۲۶م زمیں تھر تھرا کر اٹھی کر فغاں

علی مرتضیٰ نے اسم اعظم اور ذوالفقار کی مدد سے رعد جنی کی نو لاکھ فوج کو مسل کر رکھ دیا ؎

جو لشکر کوں جا کر گئے زن کہنڈل ۲۷م گئے نہاٹ سارے پلید انکے دل

بالآخر رعد جنی بھی مقابلے پر اُتر آیا اور انجام کار رعد جنی کی عبرتناک موت ہوئی۔ حضرت علی نے راحیل کو رعد کی حکومت سونپ دی اور کلمۂ طیبہ کے عوض سارے جنات کو بھی بخش دیا۔ حضرت علیؑ اس غار اور جنگل سے بخیر و خوبی لوٹ آئے۔ اس ضعیف شخص اور ضعیفہ نے سارا ماجرا بچشم خود دیکھا اور مسلمان ہو گئے ؎

دیکھے یوں بڑا ہو رہڈی نیں بھر ۲۸م اپن دوستاں سو سکھے کھول کر

لہ ذبح ۔ سہ آنسو

سو دھر صدق شہ پر ایماں لائے ۴۹ توں کفر کی راہ او دین پائے

مثنوی کے آخری اشعار میں بھی اس کے فارسی ماخذ اور سنہ تصنیف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان اشعار سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نظم ابوالحسن تاناشاہ کے آخری ایام سلطنت میں لکھی گئی۔ کیوں کہ اسی سنہ میں اورنگ زیب عالمگیر نے گولکنڈہ پر فتح پائی اور قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ شاعر نے اپنے نام اور لقب کی صراحت بھی انھیں اشعار میں کی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

یو قصہ اتھا فارسی سوں اول ۵۰ جو معنی بکٹ ہور اد کل کبل
خدا ہور محمد علی کا لے نام ۵۱ کیا فارسی کوں سو دکھنی تمام
ہوئے خام ہتوں سارے عالم کے تئیں ۵۲ بہر حال سیتے گیا اسکوں میں
نہ شاعر سوں میں ہور نہ شاعری ۵۳ نہ منعم سوں میں ہور نہ سامری
اپن طبع کے جھاڑ کے خیال کوں ۵۴ بہرحال لایا سوں میں بار کوں
کہ خوب ہے سو رکیں خام ہے ۵۵ تمن عاد خاں کا نج انعام ہے
کہ ہجرت کے بعد از سنہ سال پر ۵۶ ہزار و نود ہور شش سال پر

(۱۰۹۶ھ مطابق جولائی اگست ۱۶۸۵ء)

کہ ماہِ مبارک ہور رمضان تھا ۵۷ امت کوں محمد کی مہماں تھا
جو اس مہینے یو مرتب کیا ۵۸ گزاو اپنے مہینے سے آگہ کیا
اتھا اس وقت بوالحسن بادشاہ ۵۹ خلق اسکوں بولے حسن قطب شاہ
کہ اوس کے زمانے منے یو کیا ۶۰ تمن عاشقاں سیں دعا منگ لیا
لقب دے کتے مج کوں منصور کر ۶۱ و لے نام میرا ہے آدم کگر

سنہ کتابت :- فی التاریخ تحریر ۲۲ شہر شوال ۱۱۸۰ھ (۲۶ دسمبر ۱۷۶۶ء) روزے در شنبہ دراول پاس در بندر میلاپور (مدراس) کاتب عباث - ٥٥٥٥

مولانا ابوالکلام آزادؒ
ایک جائزہ

از جناب محمد شعیب صاحب عمری بنگلور

(۲)

(۷) مولانا آزاد کی تحریر کی ایک خصوصیت طنز نگاری ہے۔ اس صنف میں انھیں غیر معمولی ملکہ حاصل تھا۔ انھوں نے اپنے کمالِ نگارش سے اس طرز میں ایک عجیب دلربایانہ شان پیدا کی اور اس کے دامن کو گلہائے رنگا رنگ سے بھر دیا۔ ان کی طنز نگاری ایک طرف حسین و دلکش الفاظ نادر و بدیع تراکیب، رقصاں و درخشاں تشبیہات لطیفہ اور خنداں استعارات اور دل ربا و رعنا اشارات و کنایات کی جلوہ گاہ ہوتی ہے تو دوسری طرف اس میں اس غضب کا اثر و نفوذ ہوتا ہے کہ وہ آبِ رواں میں مانع کی طرح ہو کو چھو کر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ نیز مولاناؒ کے اس رنگین، باوقار، سنجیدہ، شستہ و شگفتہ نگارش کے ایک ایک لفظ میں تیر و نشتر مخفی ہوتے ہیں، وہ خنجر کی نوک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہوتے ہیں جن خوش قسمت افراد کو مولاناؒ کے اس تیغِ طنزیات کے قتیل ہونے کا شرف حاصل ہے، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس طرزِ نگارش کی "لذت" سے انھیں کس قدر "حظ" حاصل ہوا اور اپنے زخم خوردہ دل کے "کرب" سے کس قدر "الم" نصیب ہوا۔

یوں تو طنز نگاری کی مثالیں الہلال کے متعدد مضامین میں بکثرت ملتی ہیں لیکن مسلم یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی کے ایک جلسہ کے سلسلہ میں مولانا آزادؒ اور مولانا محمد علی مرحوم کے درمیان کچھ ناگواری پیدا ہوگئی تھی۔ مولاناؒ نے ۵ فروری، ۲۶ فروری، ۱۳ مارچ اور ۲ اپریل کے الہلال میں صحیفہ الخاشیہ کے زیرِ عنوان اس تعلق سے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ اس نوع کی نہایت تابناک مثال ہے نیز عصرِ حاضر

کے صاحب اسلامیات مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ۱۹۱۳ء میں ایک نئی اصطلاح علمی ”حظ بمعنی“ لذت اور کرب بمعنی ”الم“ وضع کرکے مولانا آزادؒ سے نوعمری کے جوش میں اُلجھ پڑے تھے۔ مولانا آزادؒ نے اس بحث و جدال کے جواب میں الہلال مورخہ ۱۷ ستمبر اور یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء میں جو کچھ رقم فرمایا ہے وہ ادبیاتِ نثر میں نہایت عالی شان باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس قدیم نزاع پر مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی رقم طراز ہیں :-

”مولانا شبلی نے میرا ایک آدھ مضمون (انگریزی سے ترجمہ) الندوہ کے لئے لکھا گیا تھا، الہلال کی طرف منتقل کردیا۔ اس کی تاب میں نہ لاسکا، اور طبیعت جو اس نوعمری کے جوش میں بحث و جدال کے لئے بہانہ ڈھونڈ رہی تھی، کچھ یہی رو زاید بعض اصطلاحات علمی کی آڑ میں صاحبِ الہلال سے اُلجھ ہی پڑی، دو چار مضمون خوب گرما گرم نکلے، وہ تو خدا بھلا کرے ایک فاضل ندوی دوست کا جنھوں نے درمیان میں پڑ کر یہ سلسلہ رکوادیا، ورنہ نوبت خدا جانے کہاں تک جا پہنچتی۔“

(صدق جدید ”چند یادیں“ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۵۹ء)

چونکہ طنز نگاری مولانا آزادؒ کی سیرت کی بلندی اور کردار کی پاکیزگی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی تھی، لہٰذا انہوں نے اس طرزِ نگارش کو اپنے گہر بار قلم کی جولانیوں سے محروم کردیا۔ مولاناؒ نے ۱۹۱۶ء میں جو عہد کیا تھا اس پر تاحین حیات قائم رہے، یعنی انھوں نے کوہِ صبر و وقار اور پیکرِ تسلیم رضا بن کر مخالفین، معاندین اور حاسدین سے سب و شتم، طنز و مزاح اور طعن و تشنیع سب کچھ سننے کے باوجود اپنی زبان صدق بیان سے کبھی کوئی ناگوار لفظ نہ نکالا۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء کے بعد ان کی کتاب زندگی کے اوراق شاہد ہیں کہ ان میں طنز ہے نہ تضحیک، ہمز ہے نہ لمز، حقارت کے کلمات ہیں نہ تمسخر کے الفاظ۔ ایک مشہور عالم دین مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی مرحوم نے مولانا کی تفسیر سورۂ فاتحہ کے چند حصوں پر مناظرانہ انداز میں اعتراضات کئے تھے، اس سلسلہ میں مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے مولاناؒ سے وضاحت چاہی، اور لکھا کہ آپ نے کتاب دیکھی ہو تو

بھجوا دوں؟ اس کے جواب میں مولانا نے تحریر فرمایا:-

"چونکہ آپ لکھتے ہیں کہ کسی وجہ سے انہوں نے مناظرانہ اسلوب اختیار کیا ہے اس لیے براہِ عنایت مجھے کتاب نہ بھیجیے، میرا نہ دیکھنا ہی بہتر ہے۔ [illegible] میں نے جن باتوں کا عہد کیا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی شخص کو [illegible] طریق پر میرے خلاف کچھ لکھے گا، نہ تو جواب دوں گا، نہ اس کی شکایت سے اپنے نفس کو آلودہ ہونے دوں گا"

(نقشِ آزاد صفحہ ۱۵ مکتوب نمبر ۲۴ مورخہ ۱ جنوری [illegible])

پنجاب کے ایک سیاست دان نے اپنے ایک بیان میں چند ایسی باتیں کہیں جو بے اصل تھیں، مولانا آزادؒ نے مولانا غلام رسول مہر مرحوم کو اس تعلق سے جو کچھ تحریر فرمایا ہے ملاحظہ کیجیے اور غور فرمائیے کہ موجودہ دور میں طہارتِ نفس کی اس سے بہتر مثال کہیں مل سکتی ہے؟

"اگر میری طبیعت کا وہ انداز ہوتا جو اس وقت تھا جب الہلال نکلتا تھا تو یہ صریح کذب ہے کہ نہیں معلوم کس عالم بیان میں میرے قلم سے کس درجہ سخت الفاظ اس شخص کی نسبت نکل جاتے، لیکن اب میرا حال دوسرا ہے، کوئی شخص کتنے ہی قبیح فعل کا مرتکب ہو، میں یقین کے ساتھ اُسے پبلک میں بُرا کہنا پسند نہیں کرتا، ہمیشہ ایسے موقعوں پر خود اپنا نفس اپنے سامنے آجاتا ہے، میں چونک اُٹھتا ہوں کہ اگر بُرا ہی کہنا ہے تو خود اپنے نفس کو بُرا کیوں نہ کہوں؟ اس سے زیادہ بُرائی کس میں ہوگی؟ بہادر شاہ کا ایک سیدھا سادا شعر ہے، جس میں شعریت کی کوئی بات نہیں، لیکن میرے دل پہ نقش ہوگیا۔

نہ تھی اپنی بُرائی پہ جب کہ نظر — تو نظر میں بُرا تھا، ہر ایک بشر
پڑی اپنی بُرائی پہ جب نظر — تو نظر میں کوئی بھی بُرا نہ رہا

(نقشِ آزاد صفحہ ۱۳۲ مکتوب نمبر ۶۰ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۳۶ء)

بلاشبہ مولانا آزادؒ کا یہ مثالی کردار ان کی حیاتِ زرّیں کا ایسا روشن اور تابناک پہلو ہے جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ آج بعض تعلیم یافتہ حضرات کا جن کو اپنے زہد و ورع پر ناز ہے اور بزعم خویش خود کو وارثِ مسندِ رسولؐ سمجھتے ہیں، حال یہ ہے

"طنز کرتے ہیں مرنے والوں پر"

۱) مولانا آزادؒ کے طرزِ تحریر کی ایک اثر آفریں خوبی یہ ہے کہ وہ ایک رنگ کے مضمون کو سو ڈھنگ سے باندھتے ہیں، اس قسم کی تحریریں زیادہ تر دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تنظیم بین المسلمین سے متعلق ہوتی ہیں۔ ان تحریروں میں بحیثیت افکار و خیالات جدّت و ندرت نہیں ہوتی، صرف تکرار و اعادہ ہوتا ہے، لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ اس نوع کی تمام تحریریں مختلف لب و لہجہ اسلوب و انداز کے لحاظ سے کچھ اس طرح جدّت و ندرت کی حامل ہوتی ہیں کہ قارئین باوجود تکرار و اعادہ یعنی ایک ہی قسم کے مطالب و مفاہیم کے جھوم اٹھتے ہیں، اور ہر مرتبہ نئی لذّت و حلاوت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

مولانا آزادؒ، اس طرز کی تحریروں میں نہایت دل نشین اور مؤثر پیرایۂ بیان اختیار کرکے، مسلمانوں کو ولولۂ مذہبی اور جوشِ ملّی سے سرشار کرتے تھے، اور ان کے شعلۂ حیات کو فروزاں کرکے ان کے جذبات میں ہیجان اور تلاطم اس انداز سے برپا کرتے تھے کہ ان کے متحرک خون کا ہر قطرہ حرارت سے معمور ہو جائے۔

زبان و بیان اور ادب و انشاء کے لحاظ سے مولانا کی ایسی تحریریں صحیفۂ حسن و جمال ہوتی ہیں، ایک طرف تراکیب و الفاظ "روضۂ تاج" کا جمالِ آتشیں بن کر نمایاں ہوتے ہیں، تو دوسری طرف تشبیہات و تمثیلات اور استعارات اپنی پوری رعنائیوں اور دل فریبیوں کے ساتھ آئینہ کی چمک سے زیادہ درخشندہ ہو کر نظر افروز ہوتے ہیں۔

مولاناؒ نے اس طرزِ تحریر کو جس میں خیالات کی تکرار ہوتی ہے اور مطالب کا اعادہ ہوتا ہے قرآن حکیم کے اندازِ بیان سے اخذ کیا ہے، قرآن حکیم میں ایک ہی بات مختلف اسلوب اور

انداز سے بار بار بیان کی گئی ہے، مولانا نے قرآن کے اس حکیمانہ اسلوب کو اس کے اعلیٰ حسن و تاثیر اور اعجاز کو نہایت خوبی و کمال سے جذب کر کے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ مختلف پیرایۂ بیان کے ساتھ مسلمانوں کو بار بار مخاطب کیا ہے۔ چنانچہ الہلال مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۱۳ء میں "ہزار بار گفتہ ام و بار دگر می گویم" کے تحت تحریر فرماتے ہیں:۔

"آپ "تکرار بیان" سے ملول نہ ہوں کہ اعلانِ صداقت میں کبھی بھی ندرت نہیں ہوتی بلکہ صرف تکرار و اعادہ ہی ہوتا ہے، جو چیز نئی ہے اس کی جدت سے ملتفت ہوں گے لیکن صداقت جو ایک ہی ہے اور ہمیشہ سے ہے اس کے اعلان و دعوت میں جدت و ندرت کہاں سے آئے گی، سوائے اس کے کہ بار بار دہرائی جائے اور ایک ہی بیج کی مختلف موسموں میں بار بار تخم ریزی ہو، شاید کسی وقت زمین اسے قبول کرلے اور برگ و بار شجر و اثمار سے مالا مال ہو جائے۔

قرآن کریم میں ایک ہی بات کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے۔ اس کی علت پر تدبر کیجئے کہ کیا تھی؟ فرمایا کہ:۔

اُنظُرْ کَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ	دیکھو ہم اپنی آیتوں کو کس کس طرح پھیر پھیر کر
لَعَلَّهُمْ یَفْقَهُوْنَ	مختلف صورتوں اور مختلف طریقوں سے

کے ساتھ بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ سمجھیں اور عقل و بصیرت حاصل کریں"

(۱۹) جو بات حقیقت و صداقت پر مبنی ہوتی ہے اس کی روح میں جذب و انجذاب اور اثر و نفوذ کا قانون الٰہی مضمر ہوتا ہے، اس قانون کا قدرتی خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو اپنی طرف کھینچے، متاثر کرے اور ان کے دلوں کو موہ لے، چنانچہ مولانا کی تحریریں اور ان کی تصانیف اس قانون الٰہی کا مکمل مصداق ہو کر اس قدر مؤثر اور دلپذیر ہوتی ہیں کہ پڑھنے والے یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ بلاشبہ مولانا کے دل کا عشق اور باطن کا سوز و گداز، ان کی زبان و قلم کے ذریعہ تحریر کے ایک ایک جملہ، ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ میں سرایت کر گیا ہے۔ مولانا کی تحریروں کے مطالعہ کے بعد جس حد تک

طریق سے دل افروز ہوتا ہے اور اعمال و کردار پر جس دلکش طریقے سے قرآن و سنت کا رنگ نکھر آتا ہے اس کا اظہار سے اگرچہ زبان و قلم عاجز ہے، تاہم اس قدر عرض کئے بغیر چارہ نہیں کہ مولانا کی تحریروں نے اُن افراد کے ذہن و فکر اور قلب و نظر میں جو مذہب سے بیگانہ اور دین سے متنفر ہو چکے تھے، ایسا ایمان افروز انقلاب برپا کیا اور ایسے حیرت انگیز طریقے سے ان کے جمود کو حرکت سے اور ان کے تعطل کو عمل سے بدل دیا جیسے ان کے مُردہ دل میں زندگی کی لہر دوڑ گئی ہو اور وہ زبانِ حال سے نغمہ سنج ہوں :-

زنسیم جاں فزایت دلِ مُردہ زندہ گردد
زکدام باغے اے گُل کہ چنیں خوش ست بُویت

خود علماء اور رہبرانِ ملک و قوم نے بھی اپنے سیاسی معتقدات و آراء اور مذہبی و علمی افکار و اعمال میں مولانا کی تحریرات کا اثر اس انداز سے قبول کیا جیسے مولانا نے ان کے نہاں خانۂ قلب پر دستک دے دی ہو اور انھوں نے اپنے دل کا دروازہ کھول دیا ہو، چنانچہ انھوں نے بذاتِ خود محسوس کیا کہ ان کی مذہبی، علمی اور سیاسی زندگی میں انقلاب و تغیر کی لہر دوڑ گئی ہے اور ان کے اوراقِ دل کا ایک ایک صفحہ ایمان و ایقان کی روشنی سے چمک اُٹھا ہے۔

مولانا کی تحریریں اور ان کی تصانیف اس درجہ معنی آفریں اور دل آویز ہیں کہ آپ متعدد مرتبہ ان کا مطالعہ کیجئے، بجائے اس کے کہ آپ کا ذہن گرانی محسوس کرے ہر مرتبہ ان کو قبول کرے گا اور ہر بار آپ کا ذوق نیا کیف و سرور محسوس کرے گا، نیز عبارت بھی اپنی ظاہری اور باطنی جمال آرائیوں اور حسن افروزیوں کے ساتھ ایک نئے رنگ اور نئے پیکر میں نمایاں ہوگی۔

ہر بار نیا روپ ہے، ہر بار نیا رنگ
جب دیکھئے کچھ اور ہی عالم ہے تمھارا

ضرورت اس امر کی تھی کہ مذکورہ بالا اوصاف و خصائص تحریر کو امثال و شواہد کی روشنی میں واضح کیا جائے، لیکن چونکہ یہ مضمون مقررہ حدود سے آگے بڑھ گیا، اس لئے مجھے ان تمام اقتباسات

کو حذف کر دینا پڑا، جو میں نے بطورِ استشہاد اخذ کئے تھے، انشاء اللہ ایک ذیرِ ترتیب کتاب جس کا ایک حصہ یہ مضمون بھی ہوگا، جب زیورِ طبع سے آراستہ ہوگی اس گوشہ کو آپ مثالوں سے نہایت واضح پائیں گے۔

حاصلِ سخن | حاصلِ سخن یہ کہ مولانا آزاد کی ذاتِ گرامی کمالاتِ علمی کے رنگارنگ حقائق کا ایک عجیب و غریب دل کش مجموعہ تھی، لیکن اُن کے شعبہائے حیات کے جس قدر اوصاف و کمالات منصۂ شہود پر جلوہ آرا ہوئے ہیں، وہ ان سے بہت کم ہیں جو ان کی ذات میں محجوب و مستور رہ گئے، خود مولانا کو اس کا شدید احساس تھا، چنانچہ انھوں نے اپنی زندگی کے آخری حصہ میں جب کہ ان پر ضعف و اضمحلال طاری ہوگیا تھا انتہائی دردانگیز انداز میں اپنے ایک مخلص کو اس طرح تحریر فرمایا :-

"اپنی حالت دیکھتا ہوں تو روز بروز صحت جواب دے رہی ہے، ضعف و اضمحلال بڑھتا جاتا ہے، نہیں معلوم مشیتِ الٰہی کیا ہے اور کون سا وقت آنے والا ہے، اگر پیامِ اجل سر پر آپہونچا (فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ لَآتٍ) تو آہ! کس سے کہئے اور کون جانتا ہے کہ اس مشتِ خاک کے ساتھ کیا کیا چیزیں ہیں جو سپردِ خاک ہوں گی، فیضانِ الٰہی نے اپنے فضلِ مخصوص سے علوم و معارف کے کیسے دروازے اس عاجز پر کھولے تھے جو بند کے بند رہ جائیں گے۔

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدرِ تو نشناخت دریغ

(الجمعیۃ مولانا آزاد نمبر)

مولانا کے جس قدر ادبی، علمی اور سیاسی کمالات ظہور پذیر ہو چکے ہیں اور مختلف علوم و فنون کے ہر شعبہ میں انھوں نے جو اپنی خداداد صلاحیتوں سے بیشمار مستقل قدریں قائم کی ہیں، ان کے تعلق سے ابتک جس قدر لکھا گیا ہے، شاید ہی کسی اور شخصیت کے متعلق اس قدر لکھا گیا ہو، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ تحریر و تحقیق کا حق اب تک شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکا اور فیضانِ ابوالکلام سے مستفیض ہونے والوں کا جوشِ طلب بھی اس تحقیق پر قانع نہ ہو سکا، اور ان کی لب تشنگی اس سے زیادہ سیرابی کا سامان تلاش کرنے لگی ہے۔

بلاشبہ مولاناؒ کے جملہ افادات بالخصوص تفسیری مباحث جو اپنی جامعیت وہمہ گیری اور
یجاز و اعجاز کے لحاظ سے بے نظیر ہیں، اس امر کے مقتضی ہیں کہ ان پر غور و فکر کیا جائے۔ اور یہ حقیقت ہے
یں قدر دقیقہ سنجی اور ژرف نگاہی سے ان پر غور و فکر ہوگا اسی قدر حقائق و معارف نہایت طلعت و
انی کے ساتھ بے نقاب ہوتے جائیں گے، چنانچہ مولاناؒ نے تفسیری نوٹ کے تعلق سے تحریر فرمایا:۔

"پس ضرور ہے کہ نوٹوں کا مطالعہ ایک ہی مرتبہ نہیں، بلکہ بار بار کیا جائے، جوں جوں
فکر آشنا ہوتا جائے گا۔ مطالب و دقائق کے نئے نئے پہلو آشکارا ہوتے جائیں گے۔"

(ترجمان القرآن جلد دوم)

میں نے اس مضمون میں اس فقید المثال شخصیت کے اوصاف و کمالات کا جو مختصر اور اجمالی تعارف
یا ہے وہ آفتاب نصف النہار کی طرح ایک موجود و مشہود حقیقت ہے جو لوگ مولاناؒ کے مخالف ہیں
سد و بغض اور تعصب و عناد کی وجہ سے چشم و دل سے محروم ہیں، وہ یقیناً اس کو جوشِ عقیدت کی قواتی
ر غلو و مبالغہ قرار دیں گے، مگر کیا کیجئے یہ لوگ مجبور ہیں کہ انھیں جو نظر آتا ہے اس کا اقرار کریں، اور
الحقیقت ان کو وہی نظر آتا ہے جو بند آنکھوں کو نظر آتا ہے۔

البتہ وہ افراد جن کی چشم بصیرت روشن ہے اور وہ مولاناؒ کے بلند مقامات اور عظیم المراتب سے واقف ہیں،
ہ الزام دیں گے کہ میں نے بمطابق

مَا شِئْتَ قُلْ فِيهِ فَأَنْتَ مُصَدَّقٌ
وَالْفَضْلُ يَقْضِي وَالْمَحَاسِنُ تَشْهَدُ

جس قدر مدحت طرازی و توصیف کرنی تھی نہ کی لیکن کیا کیجئے فضائل و محاسن کے عین اقتضاء کے
ابق جتنا کچھ اور جیسا کچھ تعارف کرانا چاہیئے تھا اس سے میں نے خود کو اس طرح بے بس پایا کہ ایک
ف الفاظ اظہار تاثرات سے عاجز تھے تو دوسری طرف زبان قلم گویا ہوئی:

تو مرد حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

لیکن اکثر مقامات ایسے ضرور رہے جہاں دلائل و براہین کی روشنی میں نہایت بسط و شرح
ساتھ توصیف و تمجید کمالات علمی ادبی اور مذہبی کی گنجائش تھی، چنانچہ اس تعلق سے میں نے طائرانہ نظر

غزل

جناب شمیم عثمانی

کہاں ہے آج بلا خیزیٔ جنوں باقی — روایتوں سے ہے اک ربطِ پُر فسوں باقی
ہم اپنے ماضی کا سایہ بھی اب نہیں شاید — مگر زمانہ کو شکوہ کہ ہم ہیں کیوں باقی
ابھی نگاہِ ستم کو عزیز ہیں ہم لوگ — ابھی ہے پیرہنِ جاں میں بوئے خوں باقی
یہ فکر و فن کے نگہباں متاعِ غم کے امیں — ہیں اک شکستہ عمارت کے کچھ ستوں باقی
کہاں کی بادہ کشی لطفِ جامِ ساقی کیا — بنامِ ظرف ہے اک جامِ واژگوں باقی
حیات آج انھیں آئینہ دکھاتی ہے — نہ جن کے چہرے سلامت نہ اندروں باقی
عذابِ ہجر بھی دیکھا نشاطِ قرب کے بعد — ہماری شوخ مزاجی ہے جوں کی توں باقی
شراب ہے کہ لہو بھید کچھ نہیں کھلتا — ہر ایک شیشے میں ہے آبِ لالہ گوں باقی
اسی کا نام فنا ہے تو پھر بقا کیا ہے — کہ آج تک ہے یہ دنیائے کاف و نوں باقی

شمیمؔ تیرے جنوں کی بھی حد نہیں کوئی
خرد کے دور میں اور دولتِ سکوں باقی

تبصرے

مغربی تہذیب آغاز وانجام۔ از جناب محمد ذکی صاحب۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی
لنگ لکچرار شعبۂ تاریخ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی۔ ضخامت تین سو صفحات۔ کتابت و
باعت متوسط درجہ کی۔ قیمت مجلد سات روپیہ۔ پتہ:۔ درج نہیں۔ غالباً
مصنف سے ملے گی۔

لائق مصنف نے کتاب کا آغاز ہی ان جملوں سے کیا ہے:۔
بنیادی اعتبار سے دنیا میں زندگی کے صرف دو نظام ہیں، اسلامی اور غیر اسلامی
ل الذکر کی بنیاد عقیدۂ توحید و رسالت پر ہے اور دوسرے کی اس حقیقت کے
کار پر، اور اسی کا نام مغربی تہذیب ہے یعنی جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام
ئی نیا مذہب نہیں، بلکہ اسی مذہب کی تکمیل کا نام اسلام ہے جو حضرت آدم
ے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک ہر زمانہ اور ہر قرن میں پایا جاتا
ہے، اسی طرح فاضل مصنف کا دعوی ہے کہ آج کل ہم جس کو مغربی تہذیب
ہیں وہ کوئی نئی چیز نہیں، بلکہ اس تہذیب کی تکمیل ہے، جس کے دو بڑے مرکز
راق اور مصر تھے اور جو یونان اور روما سے گزرتی ہوئی عہد جدید تک پہنچی
ے اور جس کی تعمیر و تشکیل میں، ایشیا، افریقہ، اور یورپ کی سب قوموں نے
صہ لیا ہے، اس نظریے کے ماتحت مصنف نے تہذیب کے ادوار قدیمہ کے
ناصر ترکیبی کا تجزیہ کیا ہے اور اس طرح ثابت کیا ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب

نہ پہلی ہی تہذیبوں کا تکملہ اور تتمہ ہے۔ لیکن پوری کتاب کو پڑھ جانے کے بعد بھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آخر مصنف چاہتے کیا ہیں! اور ان کا بنیادی نقطہ نظر کیا ہے! ایک تعلیم یافتہ شخص کے دماغی عدم توازن کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ اسے مغربی تہذیب (قدیم اور جدید) میں سوائے برائیوں کے کچھ بھی ہی نظر نہیں آتی۔ موصوف کی انتہا پسندی کا یہ عالم ہے کہ مولانا علی میاں جیسے داعی اسلام پر تنقید کر ڈالی ہے۔ چنانچہ صفحہ ۲۷۵ پر لکھتے ہیں:۔

مولانا کا علم وسیع ہے۔ ملت کا درد رکھتے ہیں۔ اسلام سے عقیدت ہے اور ــــ چاہتے ہیں کسی طرح مشرق و مغرب اسلام اور مغربیت ہم آہنگ ہو جائیں۔ ابھی تک اس کوشش میں کامیاب کوئی نہیں ہو سکا۔ اگر تمثیل صحیح ہے تو مولانا "دیسی پردیسی آم" کی قلم لگانا چاہتے ہیں۔ جس میں دونوں کا مزہ آجائے۔ لیکن اس کو کیا کیجیے کہ کریلا مفید ہے اور آم لذیذ لیکن دونوں کی قلم ابھی تک نہیں لگ سکی"۔ نوجوان مصنف اپنے خیالات میں منفرد نہیں ہیں۔ بلکہ ہندوؤں، عیسائیوں اور مشرق و مغرب میں ہر جگہ کچھ نہ کچھ لوگ اس قسم کے خیالات کے حامل ہیں۔ بہر حال یہ بھی ایک نقطہ نظر ہے اور مطالعہ اس کا بھی کرنا چاہیے۔

اللہ کے گھر میں۔ از جناب احمد سعید صاحب ملیح آبادی۔ ضخامت تین سو صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت پانچ روپیہ۔ پتہ:۔ دفتر آزاد ہند نمبر ۴۲-اے۔ ساگر دت لین، کلکتہ ۔ ۱۲۔

لائق مصنف نے ۱۹۷۰ء میں اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ سفر حج کیا تھا یہ کتاب اسی سفر کی روئداد ہے۔ یوں تو سفرنامہ اور وہ بھی سرزمین حرم کا عام طور پر دلچسپ ہوتا ہی ہے۔ لیکن چونکہ موصوف اردو زبان کے ادیب اور

سہ روزہ دعوت کے ایڈیٹر اور بلند پایہ جرنلسٹ ہیں۔ اس لیے انھوں نے یہ سفر دماغ و دل دونوں کو دا رکھ کر کیا۔ ہر چیز کو غور و فکر کی نگاہ سے دیکھا اس کی حقیقت تک پہنچنے کی سعی کی۔ پھر مقامات عشق و محبت میں جب تک دل رہنما نہ ہو اصل منزل تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں اس کی کیا قلت ہو سکتی تھی۔ علاوہ ازیں جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اس کی عکاسی کے لیے جس شگفتہ رقم اور دقیقہ رس قلم کی ضرورت ہے وہ بھی موجود تھا ہی، پھر کمی کس چیز کی تھی۔ چنانچہ یہ سفرنامہ اس مقدس سفر کی تاریخی، جغرافیائی اور دینی معلومات کی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ جس میں واقعات و حقائق کے ساتھ جذبات کی آمیزش نے حسن بیان کو نکھار دیا ہے۔ اس بنا پر اس کتاب کا مطالعہ بے شبہ ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہوگا۔

مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا مسئلہ۔ از پروفیسر طاہر محمود۔ ضخامت ۱۰۴ صفحات تقطیع متوسط، کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت چار روپیہ۔ پتہ: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

لائق مصنف انڈین لا انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی میں اسلامی قانون کے پروفیسر ہیں اور اب تک اس موضوع پر انگریزی اور اردو میں مفید اور قابل قدر کتابیں اور مضامین لکھ چکے ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں موصوف نے بتایا ہے کہ جس کو عام طور پر مسلم پرسنل لا کہا جاتا ہے وہ کیا ہے؟ اس کا ماخذ کیا ہیں؟ پھر ہندوستان میں اس کی قانونی حیثیت کیا ہے یہ قانون کب بنا اور کن کن چیزوں پر مشتمل ہے اور ان کی کیا نوعیت ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے فرقوں کے جو پرسنل لا ہیں وہ کیا ہیں یکساں سول کوڈ کے معاملہ کی کیا حقیقت ہے، اس پر مخالف اور موافق

اراد جو ظاہر کی گئی ہیں وہ کیا ہیں۔ مسلم پرسنل لا میں اصلاح کی تجویز کیا ہے؟ اور اس بارے میں مختلف حضرات کے خیالات کیا ہیں؟ بیرونی ممالک میں اور خاص طور پر مسلم ممالک میں اب تک مسلم پرسنل لا میں وقتاً فوقتاً جو اصلاحات ہوئی ہیں وہ کیا کیا ہیں۔ اور ان کے دلائل کیا ہیں۔ ان تمام مباحث کے بعد لائق مصنف نے ان مسائل کے بارے میں اپنی ذاتی رائے بیان کی ہے۔ مسلم پرسنل لا کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے آج وقت کا بہت اہم مسئلہ ہے اب تک اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور کہا گیا ہے۔ جو حضرات اس مسئلہ کا مطالعہ عملی طور پر کرنا چاہتے ہیں انہیں اس کتاب کو ضرور پڑھنا چاہیے۔

مسلم پرسنل لا۔ از مولانا منت اللہ صاحب رحمانی۔ تقطیع خورد ضخامت ستر صفحات کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے۔ خانقاہ رحمانیہ۔ مونگیر۔ بہار کے پتہ سے ملے گی۔

مولانا بہار کے امیر شریعت اور ممتاز عالم ہیں۔ اس بنا پر آپنے اس رسالہ میں خالص شرعی اور فقہی نقطۂ نظر سے وقت کے اس اہم سوال پر اظہار خیال کیا ہے اور بتایا ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اس کے پرسنل لا کی کیا اہمیت ہے اس کے ماخذ کیا ہیں؟ جب کبھی کوئی نیا معاملہ پیش آیا تو صحابۂ کرام نے اس کو کس طرح حل کیا ہے۔ آج بھی جو مسائل حل طلب ہیں ان کا حل ضرور ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں اجتہاد کی تعریف، اس کے حدود اور اس کے لیے قیود و شرائط وغیرہا پر بھی عالمانہ اور فاضلانہ کلام کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس رسالہ سے کسی مسئلہ کا حل نہیں ہوتا۔ لیکن اصول و کلیات کے نقطۂ نظر سے اس رسالہ کا مطالعہ بھی مفید اور بصیرت افروز ہوگا۔

❖

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

ندوۃ المصنفین دہلی

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر رسالہ [illegible]

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

برہان

جلد ۶۹ | ماہ رجب و شعبان ۱۳۹۲ھ مطابق ستمبر ۱۹۷۲ء | شمارہ ۳

۱۔ نظرات	سعید احمد اکبرآبادی	۱۴۶
مقالات		
۲۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (۳)	" " "	۱۵۰
۳۔ رسول شاہد و مشہود	قاری بشیر الدین صاحب پنڈت ایم۔ اے خلیل ایوارڈی شاہجہانپور	۱۷۲
۴۔ تفسیری رجحانات اور نئی تفسیر کی ضرورت	جناب ڈاکٹر معین الدین الاعظمی	۱۸۸
۵۔ شائق اوران کا دیوانِ فارسی	جناب ڈاکٹر شریف حسین صاحب قاسمی۔ دہلی یونیورسٹی۔	۱۹۸
۶۔ تبصرے	س۔ ع	۲۱۲

نظرات

سائنس اور امن کیلئے نوبل پرائز (جو غالباً سب سے بڑا بین الاقوامی انعام ہے) کے نام سے ایک عالمی انعام متعین تھا۔ لیکن بڑی مسرت کی بات ہے کہ اب مذہب کیلئے بھی اسی قسم کے ایک گرانقدر عالمی انعام کا اعلان ہوا ہے۔ اس انعام کا پورا نام ہے ٹمپلٹن فاؤنڈیشن انعام مذہب کی ترقی کے لئے۔ یہ انعام چونتیس ہزار (۳۴۰۰۰) پاؤنڈ (اسٹرلنگ) کا ہے۔ ۳۰ مئی ۱۹۷۲ء کو اسے بلفاسٹ (شمالی آئرلینڈ) میں قائم کیا گیا ہے۔ اسے قائم کرتے وقت انعام کے بانی نے جو الفاظ کہے ہیں وہ یہ ہیں: "یہ انعام ایک ایسا شخص قائم کر رہا ہے جو اگرچہ ایک معمولی انسان ہے لیکن اس کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ مذہب انسان کے وجود اور اس کے بقا کے لیے ایک نہایت اہم ضرورت ہے۔ مجھ کو امید قوی ہے کہ سائنس اور کلچر کی ترقی میں اس نوع کے انعامات نے جو رول ادا کیا ہے وہی رول یہ انعام مذہب کی ترقی میں ادا کریگا۔ اس انعام کا مقصد یہ ہے کہ وہ ان خیالات، کوششوں اور ان اعمال و افعال کا اعتراف کرے اور لوگوں کی توجہ ان کی طرف مبذول کرائے جنہوں نے انسان کی روحانی صلاحیتوں اور خدا کے ساتھ عشق و محبت کے جذبہ کو ابھارنے میں زیادہ سے زیادہ اہم رول ادا کیا ہو۔ مختلف مذاہب و ملت کے ججوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنادی گئی ہے۔ جو اس انعام کے مستحق شخص کی ہر سال تعیین کرے گا۔ ججوں کے پینل میں سات حضرات شامل ہیں ان میں ہندوستان سے پروفیسر سونتی کمار چیٹرجی نیشنل پروفیسر کو اور پاکستان کی طرف سے چودھری سر محمد ظفر اللہ خاں صدر بین الاقوامی عدالت ہیگ کو شامل کیا گیا ہے باقی پانچ میں امریکہ، یورپ، جاپان کی بلند پایہ مشہور مذہبی شخصیتیں شامل ہیں۔ اس سلسلہ میں پہلے انعام کے لیے انتخاب اور اس کا اعلان ۷۳ء کے شروع میں ہوگا۔

قارئین برہان کو یہ معلوم کر کے مسرت ہوگی کہ ٹمپلٹن فاؤنڈیشن کے دانش پر مزید

مسٹر ڈبلیو۔ جی۔ فوڈکر نے اس سلسلہ میں شخصی طور پر ایک خط اڈیٹر برہان کو بھی لکھا ہے جس میں متعلقہ انعام کے بارہ میں ایک مشورہ طلب کیا ہے جس کا خاطر خواہ جواب انشاء اللہ جلد بھیج دیا جائے گا۔ بہر حال ہم اس اعلان کا خیر مقدم کرتے ہیں یہ اعلان اس بات کی کھلی دلیل ہے۔ جیسا کہ ہم نے متعدد جگہوں پر بار بار کہا اور لکھا ہے کہ یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ یورپ میں مذہب ختم ہو گیا ہے۔ بلکہ مذہب زندہ ہے اور وہ سائنس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ سائنس جس تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے اسی قدر یہ حقیقت روز بروز منکشف ہوتی جا رہی ہے کہ اگر سائنس کا رشتہ مذہب سے بالکل منقطع ہو گیا تو اس کا انجام عالم انسانیت کی مکمل تباہی اور بربادی کے سوا کچھ اور نہ ہو گا۔ اس بنا پر امریکہ کناڈا اور یورپ میں جہاں سائنس پر تحقیقات اور اس کی اشاعت کے بڑے بڑے ادارے ہیں اور ان پر اربوں کھربوں روپیہ خرچ ہو رہا ہے اس کے ساتھ ہی۔ مذہب کی تعلیم۔ اس پر تحقیق اور اس کی اشاعت کے مستقل ادارے اور مرکز ہیں جو اس مقصد کے لیے کروڑوں روپیہ صرف کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں ہر ماہ مذہبی لٹریچر میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے۔ ٹمپلٹن فاؤنڈیشن کا یہ انعام بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ فاؤنڈیشن اس اہم اقدام کے لیے سب مذاہب عالم کی طرف سے مبارکباد کا مستحق ہے۔

افسوس ہے پچھلے ماہ ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کا الہ آباد میں انتقال ہو گیا مرحوم ہندوستان کے ان مغربی تعلیم یافتہ اکابر اساتذۂ عربی و فارسی میں سے تھے، جن کی نسل اب چراغ سحری ہے۔ مرحوم علی گڑھ کے اس زمانے کے پڑھے ہوئے تھے جب کہ ابھی وہ صرف کالج تھا۔ انہوں نے یہاں پروفیسر یوسف ہوروونس (JOSEF HOREVITZE) جو صدر شعبۂ عربی تھے ان کی شاگردی میں عربی میں ایم۔ اے کیا اور جب ان کو حکومت ہند کی جانب سے

اعلیٰ تعلیم کے لیے وظیفہ ملا تو موصوف کے ہی مشورے سے ۱۹۱۲ء میں جرمنی چلے گئے۔ اس زمانے میں جہاں تک عربی اور فارسی میں ریسرچ کا تعلق ہے فرانس کے ساتھ جرمنی کے نام کا بھی دنیا میں غلغلہ بلند تھا۔ جرمنی میں جو مستشرقین علم و تحقیق کی جوئے شیر کے کوہکن مشہور تھے ان میں پروفیسر تھیوڈور نولڈیکی اور پروفیسر انولتمان (ENNO LITTMAN) (۱۸۷۵ - ۱۹۵۸) سرخیل گروہ تھے۔ ان دونوں کا اور خصوصاً موخر الذکر کا خاص فن سامی لسانیات تھا۔ خوش قسمتی سے مرحوم کو جرمنی میں ان اساتذہ سے استفادہ کا پورا موقع ملا۔ پروفیسر انولتمان ان کے استادِ خصوصی تھے جن کی خدمت میں وہ مسلسل سات برس یعنی ۱۹۱۹ء تک رہے۔ استاد نہایت شفیق اور علم و تحقیق کے بحر ناپیدا کنار کا کامیاب شناور اور شاگرد نہایت ذہین اور ہمہ طلب و جستجو! پھر کمی کس چیز کی تھی۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے فنِ لسانیات میں وہ کمال پیدا کیا کہ یورپ تک میں مشہور ہو گئے۔ جرمنی سے آنے کے بعد وہ علی گڑھ، حیدر آباد اور ڈھاکہ رہے، لیکن آخر کار الٰہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے ایسے جمے کہ یہیں سے ۱۹۴۶ء میں ریٹائرڈ ہوئے اور یہیں مستقل طور پہ رہ پڑے۔ اپنے علم و فضل اور لسانیات میں خصوصی وسعت و دقتِ نظر کے باعث جامعات اور اربابِ علم کے حلقوں میں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے جرمنی زبان میں ان کے مقالۂ فضیلت کے علاوہ غالباً کوئی مستقل تصنیف ان کی یادگار نہیں ہے، تاہم جو مضامین (عربی کے علاوہ اردو و فارسی ادبیات پر بھی) ان کے قلم سے نکلے ہیں علم و تحقیق کا شاہکار ہیں۔ چار پانچ برس پہلے مرحوم سے آخری ملاقات جو علی گڑھ میں ہوئی تھی اس میں انھوں نے بتایا

تھا کہ انہوں نے اپنے تمام مطبوعہ مضامین فراہم کر لیے ہیں اور آج کل وہ ان پر نظر ثانی اور ان کی ترتیب و تدوین میں مصروف ہیں۔ مرحوم علم و فضل کے ساتھ ہی اخلاق و عادات کے اعتبار سے نہایت شریف الطبع، باوضع اور خوش اخلاق و ملنسار بزرگ تھے۔ ان کی گفتگو معلومات سے پُر ہوتی تھی۔ اصول و ضوابط کے سخت پابند تھے۔ ان میں کسی قسم کی مداہنت یا رواداری کو گوارا نہیں کرتے تھے۔ جس سے جو وضع ہو گئی اسے آخر تک نباہتے تھے۔ راقم الحروف کے ایم۔اے (عربی) کے امتحان میں فلالوجی کے پرچہ کے وہی ممتحن تھے اور اس میں انہوں نے فرسٹ ڈویژن کے نمبر دئے تھے، جو وہ کسی خوش نصیب کو ہی شاذ و نادر دیتے ہوں گے۔ اس کے چند برسوں کے بعد جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی اور میں نے ان کو یاد دلایا کہ میں نے ان سے اتنے نمبر حاصل کیے ہیں تو انہوں نے فوراً پہچان لیا اور اس دن کے بعد سے ہمیشہ جب کبھی اور جہاں کہیں ملے بڑی محبت اور شفقت بزرگانہ سے ملے۔ اب ایسے باوضع بزرگ کہاں ملیں گے۔ ! چند برس سے چند در چند عوارض و اسقام کے باعث چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے اور قوتِ حافظہ جس کے لیے وہ اپنے ہم عصروں میں ہمیشہ ممتاز رہے بالکل جواب دے چکی تھی۔ انتقال کے وقت عمر ۹۰ سے کچھ زیادہ تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت و بخشش کی نعمتوں سے نوازے۔

بچپن کے زمانہ کی یاد پر بھروسہ کرنے کے باعث گزشتہ ماہ اگست کے برہان میں صفحہ ۱۴۱ پر آخری سطر سے پہلی سطر میں بریکٹ کے اندر غلطی سے یہ عبارت لکھی گئی تھی (جرمنی کے جہاز ایمڈن کے نظر آجانے کے باعث) مخدوم و محترم جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے حسبِ معمول اپنی شفقتِ بزرگانہ سے ایک والا نامہ میں یاد دلایا کہ ایمڈن کا واقعہ تو مولانا شبلی اور پروفیسر آرنلڈ کے اس سفر سے کئی برس بعد جنگ جرمنی کے زمانہ کا ہے اسی لیے اس فقرہ کو واپس لیا جاتا ہے۔ ناظرین ازراہِ کرم تصحیح فرمالیں۔

علیگڈھ مسلم یونیورسٹی

(۲)

سعید احمد اکبر آبادی

سرسید کی زندگی کا سب سے بڑا کرائسس مولوی سمیع اللہ خاں جو ایک با اقتدار اور با اثر بزرگ ہونے کے علاوہ کالج وغیرہ کے معاملات میں اب تک سرسید کے مددگار اور ان کے دست راست رہے تھے اب ان کا اس درجہ مخالف ہو جانا سرسید کے لیے ایک شدید حادثہ سے کم نہیں تھا کہ اس کے بعد ۱۸۸۹ء میں ٹرسٹی بل کا واقعہ پیش آیا اور اس نے سرسید کے لیے مصائب کی تکمیل کر دی۔ ہوا یہ کہ سرسید کی صحت خراب رہنے لگی تھی اور یوں بھی مخالفتیں بڑھ رہی تھیں۔ سرسید نے خیال کیا کہ معلوم نہیں ان کے انتقال کے بعد کالج کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ اس بنا پر بہتر ہے کہ ایک بل کے ذریعہ کالج کا مستقبل محفوظ کر دیا جائے۔ تاکہ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل علیٰ حالہ کرتا رہے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر سرسید نے "حسب ضابطہ ٹرسٹیوں کے تقرر اور دیگر انتظامات کے لیے ایک کوڈ بنایا اور بل کی صورت میں چھپوا کر اس کی کاپیاں تمام ممبروں کے پاس بھیجدیں۔ مولوی سمیع اللہ خاں بہادر اور ان کے ساتھیوں نے اس بل کی بعض دفعات سے اور علی الخصوص اس دفعہ سے سخت اختلاف کیا جس کی رو سے سرسید نے اپنے فرزند ارجمند جسٹس سید محمود کو جوائنٹ سکریٹری بنانے کی تجویز کی تھی۔ بہر حال یہ بل جو اب تک ٹرسٹی بل کے نام سے سرسید کے حامی

ممبروں کی کثرت سے پاس تو ہو گیا۔ لیکن سر سید کے لیے ایک مستقل عذاب وبلائے جان بن گیا۔ مخالفت کی اصل وجہ وہی یورپین اسٹاف کا معاملہ تھا۔ سر سید کو اس کا یقین تھا کہ کالج میں تعلیم، ڈسپلن اور نظم ونسق کا جو معیار قائم ہو گیا ہے وہ یورپین اسٹاف کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور پھر ملازمت وغیرہ کے سلسلہ میں حکومت سے جو توقعات ہیں اس اسٹاف کے بغیر ان کا پورا ہونا بھی مشکل ہے۔ مولوی سمیع اللہ خاں کا گروپ ان اساتذہ کا مخالف تھا۔ اور ان کے وجود کو اپنی تہذیب، معاشرت اور آزادی کے لیے خطرناک سمجھتا تھا عام طور پر خیال تھا کہ سر سید کے بعد کالج کے سکریٹری مولوی صاحب موصوف ہوں گے۔ سر سید نے خیال کیا کہ اگر واقعی ایسا ہوا تو کالج سے یورپین اساتذہ کا پتہ کٹ جائے گا اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت کالج اور اس کے ذمہ داروں کی طرف سے بدظن نہیں تو مشتبہ ضرور ہو جائے گی اور ان دونوں چیزوں کا انجام یہ ہوگا کہ کالج میں تعلیم، ڈسپلن اور نظم ونسق کا معیار ہی پست نہ ہوگا بلکہ علی گڑھ کالج کے پڑھے ہوئے طلبہ کے لیے سرکاری ملازمت کے حصول میں چند در چند دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔ آئندہ کے لیے اس خطرہ کے سدباب کا طریقہ اس وقت یہی ہو سکتا تھا کہ جسٹس محمود کو جوائنٹ سکریٹری بنایا جائے۔ خود محمود اپنی صحت کی خرابی کے باعث اس بارِ گراں کی ذمہ داری لینے پر رضا مند نہ تھے۔ لیکن ان کو کسی نہ کسی طرح رضا مند کر لیا گیا اور ٹرسٹی بل کی ایک دفعہ کی رو سے جسٹس محمود جوائنٹ سکریٹری ہو گئے۔

ٹرسٹی بل کی مخالفت کی بڑی وجہ یورپین اساتذہ اور تعلیم کی گرانی وغیرہ تو سر سید کی مخالفت کے وجوہ تھے ہی، لیکن ٹرسٹی بل کی مخالفت کی بڑی وجہ جوائنٹ سکریٹری کے عہدہ کے لیے اپنے ہی فرزند کی

بیان ہوئی

نامردگی تھی اور اس میں [illegible] پر دیکھیے تو سرسید کے لیے یہ بات سخت قابلِ اعتراض اور ان کے مرتبہ [illegible] مقام سے حد درجہ فروتر تھی بھی! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔ اتقوا مواضع التُّھَمْ یعنی تہمت کی جگہوں سے بچو۔ یوں تو یہ ارشاد ہر انسان کے لیے واجب العمل ہے لیکن بالخصوص وہ لوگ جو کسی تحریک کے بانی ہوں اور اس حیثیت سے ہزاروں انسانوں کو ان پر اعتماد ہو ان کے لیے تو اس پر عمل کرنا بہت ہی ضروری ہے۔ چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی اسی کے مطابق تھا۔ ایک مقام پر آپ نے فرمایا۔ اگر میری قوم نئی نئی مسلمان نہ ہوئی ہوتی تو میں حطیم کو گرا دیتا۔ اسی طرح جب ایک مرتبہ آپ سے عرض کیا گیا کہ منافقین جو اسلام کے لیے مارِ آستین ہیں آپ ان کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیتے تو آپ نے فرمایا" میں تو ان کو جانتا ہوں مگر مسلمان تو انھیں نہیں پہچانتے۔ اس حالت میں میں نے ان کو قتل کیا تو لوگ کہیں گے لو دیکھو! محمد خود اپنے ساتھیوں کو قتل کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ارشادِ نبوی قوم کے ہر قائد اور تحریک کے ہر بانی اور اسی طرح حکومت کے ہر سربراہ کے پیشِ نظر رہنا چاہیے ورنہ کتنی بڑی بڑی تحریکیں ہیں جو بانی تحریک کی طرف سے کسی معاملہ میں ذرا بے اعتمادی پیدا ہوئی نہیں کہ وہ ختم ہو گئیں۔

سرسید کے موقف کا نفسیاتی تجزیہ

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرسید نے اس ارشادِ نبوی کو نظر انداز کر کے بہت بڑی غلطی کی اور اس کی پاداش بھی اس قدر سخت بھگتنی پڑی کہ ان کا کام ہی تمام ہو گیا ان کی مخالفت کی جو چنگاریاں اب تک مروّت اور لحاظ کے خاکستر میں دبی دبی سی تھیں اب وہ بھڑک کر شعلہ فشانِ آتش تھیں۔ نواب وقار الملک مولانا حالی اور دوسرے

معزز حضرات نے اخبارات میں اشاعت کے لیے ایک بیان تیار کیا تھا جس میں سرسید کی پالیسی کی مذمت کالج اور قوم کے حق میں اس کے نقصانات اور اپنی اس سے برأت کا اعلان کیا گیا تھا لیکن ابھی یہ بیان اخبارات میں بھیجا نہ گیا تھا کہ اچانک سرسید کے انتقال کی خبر ملی اور وہ بیان روک لیا گیا۔ لیکن بات جتنی ہو ہمیشہ اتنی کہنی چاہیے۔ بعض لوگوں نے اس واقعہ کی آڑ لے کر سرسید کی نسبت وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو ہرگز نہ کہنا چاہیے تھا[1]۔ حقیقت

[1] ۱۹۳۳ء میں علی گڑھ میں ایم۔اے میں داخلہ کی غرض سے میں پہلی مرتبہ علی گڑھ آیا تو ولایت منزل میں جہاں اب فیکلٹی آف تھیالوجی ہے۔ قیام کیا تھا۔ یہاں ڈپٹی حبیب اللہ خاں صاحب کے ساتھ مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری رہتے تھے۔ مولوی صاحب میرے والد صاحب قبلہ کے بہت گہرے دوست تھے اور اس تعلق سے مجھ سے بھی بہت زیادہ محبت اور شفقت کا معاملہ کرتے تھے۔ اسی تقریب سے میں نے یہاں قیام کیا تھا۔ مجھے یاد ہے تین چار دن جب تک میں یہاں رہا۔ روزانہ رات کو سوتے وقت ڈپٹی حبیب اللہ خاں اور مولوی طفیل احمد صاحب دونوں بزرگ جو سرسید کے صحبت یافتہ اور علی گڑھ کے نام پر فدا تھے۔ سرسید کے حالات مزہ لے لے کر بیان کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے سرسید کی نجی اور خانگی زندگی کے چند ایسے نہایت دردانگیز اور سبق آموز واقعات بھی سنائے جو آپ کو کسی کتاب میں نہیں ملیں گی اور ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید درحقیقت کردار اور اخلاق کے اعتبار سے کتنے بلند انسان تھے ورنہ یہ تو سب جانتے ہی ہیں کہ سرسید کا انتقال کس بے کسی کے عالم میں ہوا اور انتقال کے بعد جب سرسید کے اثاثہ کا جائزہ لیا گیا تو اس میں کفن اور دفن کا خرچ بھی پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ٹرسٹی بل پر جب ان کی مخالفت بڑھی لوگوں نے علانیہ کہنا شروع کر دیا کہ سرسید کو کون مخلص خادم قوم و ملت کہتا ہے

یہ ہے کہ سرسید کے لیے صرف دو صورتیں تھیں۔

(۱) ایک یہ کہ ان کے بعد مولوی سمیع اللہ خاں صاحب سکریٹری ہوں اور کالج سے یورپین اساتذہ کا خاتمہ ہو جائے۔ اس صورت میں سرسید بدنام نہ ہوتے لیکن ان کے ذہن میں کالج میں اعلیٰ تعلیم، ڈسپلن اور حکومت سے قرب کے جو فوائد تھے وہ سب ختم ہو جاتے اور کالج اس معیار پر قائم نہیں رہتا۔

(۲) اس کی متبادل صورت یہ تھی کہ سرسید جسٹس محمود کو جوائنٹ سکریٹری بنواتے اس صورت میں سرسید کی بدنامی اور رسوائی یقینی تھی، لیکن کالج سرسید کے مقاصد کے مطابق کام کرتا رہتا۔ گویا کالج یا اپنی نیک نامی اور مقبولیت

بقیہ صفحہ ۱۵۲:۔ انہوں نے یہ سارا ڈھونگ سید محمود کو انگلینڈ میں تعلیم دلانے اور پھر انہیں چیف جسٹس بنانے کی غرض سے رچایا تھا۔ " تفو بر تو اے چرخ گردان تفو"

اس حاشیہ کی پہلی سطر سے کسی کو یہ دھوکا نہ ہو کہ میں نے ایم۔اے، علیگڈھ سے کیا ہے یہاں اس وقت مولانا عبدالعزیز میمن کے ساتھ علمی وادبی عقیدت وارادت کے باعث ان سے استفادہ کی غرض سے میں آیا تو اسی غرض سے تھا اور وہاں میرا داخلہ منظور بھی ہو گیا تھا لیکن جب میں نے وہاں بکثرت لوگوں سے یہ سنا کہ میمن صاحب روپیہ پیسہ کے ساتھ علم کے معاملہ میں بھی بخیل ہیں تو میں بددل ہو گیا اور ادھر دہلی آیا تو شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے جو مجھ پر بے حد شفیق تھے فرمایا۔" میں دو برس کے بعد اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو رہا ہوں۔ اگر تم دہلی سے ایم۔اے کر لو تو میں تم کو اپنی جگہ بٹھا کر جاؤں گا۔ یہ بات میرے لیے بڑی خوش کن تھی، میں نے دہلی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور مولانا نے جو فرمایا تھا وہی ہوا۔ میرا ایم۔اے کا نتیجہ آیا ہی تھا کہ مولانا ریٹائرڈ ہو گئے اور میں سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں لکچرر مقرر ہو گیا۔

دہر دلعزیری ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا تھا! سرسید نے دوسری راہ کو اختیار کیا! یہ درحقیقت ان کی غیر معمولی اخلاقی جراءت اور عزم وہمت کی دلیل ہے اور اس لیے لائقِ ستائش!

سرسید کی وفات لیکن یہ جراُتمندانہ اقدام کرتے وقت سرسید اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ اسلام عقلِ سلیم اور قانونِ فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ کوئی کام خواہ کتنے ہی اچھے جذبہ سے کیا جائے بہرحال اس کا طریقِ کار بھی اچھا ہونا چاہیے، ورنہ نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ اوپر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشادِ گرامی گزرا ہے اس کا منشا بھی یہی ہے۔ چنانچہ سرسید یہ کرنے کو تو کر گئے۔ ٹرسٹی بل اکثریت سے منظور ہوگیا۔ لیکن سرسید کے اس طریقِ کار کا جو طبعی ردعمل ہونا چاہیے تھا وہ ہو کر رہا سرسید کا سفینۂ حیات مخالفتوں کے طوفان میں گھر گیا۔ یہ ساری عمر ہر قسم کے طوفانوں کا بڑی جراُت وہمت سے مقابلہ کرتے رہے تھے۔ لیکن پیہم حوادثِ روزگار نے دل شکستگی اور آزردگیٔ خاطر کی اس منزل میں لاکھڑا کر دیا تھا جہاں ایک رستم دوراں کو بھی کہنا پڑتا ہے۔

بہت روز طوفاں کی موجوں سے کھیلے
بس اب ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے

اور غالباً اسی قسم کا کوئی عالم تھا جس میں مرزا غالب ایسے کھلنڈرے ہنوڑ اور خوش باش شخص نے کہا ؎

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیے — کوئی ہمسایہ نہو اور پاسباں کوئی نہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار — اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہو

تھوڑی بہت جو کسر باقی تھی وہ غبن کے مذکورہ بالا واقعہ نے پوری کردی۔

علاوہ ازیں خانگی زندگی میں بھی بیٹے کی سخت علالت، سوء مزاج اور بہو کی بدمزاجی / بد دماغی کے باعث سرسید کو جو صدمات پہنچے انھوں نے سمندِ ناز پہ تازیانہ کا کام کیا بااینہمہ صبر و ضبط کا یہ عالم کہ بقول مولانا حالی کے "کبھی کسی نے اس کو وقار شخص کی زبان سے کوئی شکایت یا افسوس کا کلمہ نہ سنا ہوگا" اس قسم کے غیر معمولی صبر و ضبط کا انجام یہ ہوتا ہے کہ انسان پر حیرت و گم شدگی کی کیفیت کا غلبہ ہو جاتا اور اس کی قوتِ گفتار سلب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سرسید کو بھی یہی معاملہ پیش آیا، مولانا حالی لکھتے ہیں :۔

"مرنے سے دو ڈیڑھ مہینے پہلے ان کو چپ لگ گئی تھی۔ بولتے بہت کم تھے اور ہاں اور نہیں کے سوا بات کا بہت کم جواب دیتے تھے۔ ایک دن سید زین العابدین خاں نے پوچھا: "آپ ہر وقت خاموش کیوں رہتے ہیں؟" سرسید نے کہا: "اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چپ رہنا ہوگا۔ اس لیے خاموش رہنے کی عادت ڈالتا ہوں"

آخر ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو شب میں دس بجے کے قریب ایک مختصر مگر سخت علالت کے بعد ملتِ اسلامیہ ہند کا یہ عظیم مجاہد اور قائد اپنے رب سے جا ملا اور اس نے جس ہمیشہ کے لیے چپ رہنے کی عادت ڈالنی شروع کردی تھی آخر اس کا وقتِ موعود بھی آ گیا۔

کفن سرکا ؤ سرسے بے زبانی دیکھتے جاؤ

اللھم اغفر لہ وارحمہ

سرسید کی سیاسی پالیسی | چونکہ سرسید کی سیاسی پالیسی کا بہت گہرا تعلق ان کی تعلیمی پالیسی کے ساتھ ہے اس بنا پر ضروری ہے کہ اس پر بھی

گفتگو کی جائے۔

آج کل کے مدعیان قوم پرستی و وطن دوستی نے سرسید کی سیاسی پالیسی پر بڑی نکتہ چینی کی اور بہت لحاظ کیا تو بجائے لبرل کہنے کے ان کو قدامت پرست (CONSERVATIVE) کہا ہے۔ سرسید پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس کے مخالف تھے اور مسلمانوں کو اس میں شرکت سے روکتے تھے۔ اسی سلسلہ میں چند اور باتیں کہی جاتی ہیں مثلاً

(۱) جب وہ ۱۸۸۶ء میں سول سروس کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے تو انھوں نے انگلینڈ کے سول سروس کمیشن کے بغیر اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر کی مخالفت کی۔

(۲) انہوں نے جمال الدین افغانی کی اس تحریک کی مخالفت کی جس کے ذریعہ وہ عالم اسلام کے جسدِ مردہ میں حریت و استقلال کی روح پھونک رہے تھے اور جس کو عام طور پر پان اسلامزم تحریک کہتے ہیں۔

(۳) انھوں نے والسرائے کی کونسل میں ہندوستانیوں کی نمائندگی کی مخالفت کی حالانکہ سب سے پہلے اس کا مطالبہ انھوں نے ہی کیا تھا۔

(۴) سرسید نے انڈین نیشنل کانگریس کے بالمقابل دی یونائیٹڈ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی جس کا مقصد انگریزی میں رسالے اور پمفلٹ شائع کرنا اور برطانوی پارلیمنٹ کو ان ہندوؤں اور مسلمانوں کے افکار و نظریات سے باخبر رکھنا تھا جو کانگریس کے مخالف تھے۔

(۵) انہوں نے ہندوستان کے وفادار مسلمان کے نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا جس میں ان مسلمانوں کے حالات درج ہوتے تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی حمایت کی تھی۔

لیکن یہ اعتراضات ضمنی ہیں سب سے بڑا اور اصل اعتراض یہ ہے کہ سرسید انڈین نیشنل کانگریس کے مخالف تھے اور مسلمانوں کی اس میں شرکت گوارا نہیں کرتے تھے اس لیے اب ہم اس پر کلام کریں گے۔

سرسید کا نظریۂ قومیت | اصل موضوع پر گفتگو سے پہلے ضروری ہے کہ سرسید کے نزدیک قومیت کا کیا تصور تھا؟ جس شخص نے سرسید کے لکچروں، تقریروں اور ان کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سرسید جب کبھی لفظ قوم بولتے تھے تو اس سے مراد بلا اختلاف مذہب وملت ہندوستان کے سب باشندے ہوتے تھے۔ ایک تقریر میں جو انھوں نے ایک سپاسنامہ کے جواب میں ۱۸۸۴ء میں کی تھی۔ انھوں نے صاف لفظوں میں کہا:۔

"لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے یہی وہ معنی ہیں جس میں میں لفظ نیشن (NATION) کی تعبیر کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے قابل نہیں ہے۔ کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے۔ کیونکہ جو بات ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہیں۔ ہم سب کے فائدہ کے مخرج ایک ہیں۔ ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برابر برداشت کرتے ہیں۔ یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں کو جو کہ ہندوستان میں آباد ہیں ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں۔ جس زمانہ میں میں قانونی کونسل کا ممبر تھا مجھ کو اسی قوم کی بہبودی کا دل سے خیال تھا۔"

۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء کو پٹنہ میں ایک لکچر میں فرمایا۔

"درحقیقت ہندوستان میں ہم دونوں (ہندو اور مسلمان) باعتبار اہلِ وطن ہونے کے ایک قوم ہیں اور ہم دونوں کے باہمی اتفاق اور ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و بہبود ممکن ہے۔ میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دلہن ہے اور اس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر یہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلھن بھینگی ہو جائے گی۔"

اسی بات کو اس سے زیادہ واضح اور مدلل طریقہ پر انھوں نے ۱۸۸۴ء میں گورداسپور میں ایک تقریر کرتے ہوئے پھر دہرایا اور کہا۔

"پرانی تاریخوں اور پرانی کتابوں میں دیکھا اور سنا ہوگا اور اب بھی دیکھتے ہیں کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں۔ ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں۔ یورپین مختلف خیال اور مختلف مذاہب کے لوگ ہیں، مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں۔ غرض کہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے تو پھر اے ہندوؤ اور مسلمانو، کیا تم ہندوستان کے سوا کسی اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی سرزمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے، ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی جو بھی اس ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں، جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں

تو ملکی فائدے میں جو ان سب کا ملک ہے ایک ہونا چاہیے“

آزادیٔ وطن کا جذبہ | آپ نے دیکھا! قومیت سے متعلق سرسید کا نظریہ بعینہٖ وہی ہے جو ایک بڑے سے بڑے قوم پرور نیشنلسٹ کا ہو سکتا ہے اور جو ہونا چاہیے۔ یعنی ملکی اور وطنی معاملات و مسائل میں وہ مذہب کی بنیاد پر کسی قسم کے فرقہ اور امتیاز کے قائل نہیں ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ اپنے وطن کے لیے آزادی کا جذبہ بھی ان میں کسی سے کم نہیں تھا۔ ایک مرتبہ وائسرائے کی لیجس لیٹو کونسل کے ممبر کی حیثیت سے جبری قانون ٹیکۂ چیچک جس کا مسودہ خود انھوں نے تیار کیا تھا۔ اس کو پیش کرتے ہوئے سرسید نے جو تقریر کی اس میں انھوں نے کہا:۔

”میں منجملہ ان لوگوں کے ہوں جو کسی جبری قانون کو اشد ضروری حالت میں ہی قابلِ جواز خیال کرتے ہیں، ورنہ رعایا کی آزادی ایک حق منجملہ ان عزیز ترین حقوق کے ہے جو اپنے کروڑوں ہم وطنوں کی طرح میں بھی جن کی خواہش کرتا ہوں“

ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے بڑے زور سے کہا:۔

”اے صاحبو! میں کنزرویٹو نہیں ہوں، بہت بڑا لبرل ہوں۔ لیکن ان خیالات سے قوم کی بھلائی کو بھول جانا کسی عقلمند کا کام نہیں ہے جو شخص اس طرح کے الیکشن کے برخلاف تھا وہ میں تھا اگر میں نہیں

ل؎ یہ سب اقتباسات پروفیسر خلیق احمد نظامی کی فاضلانہ کتاب سید احمد خاں سے ماخوذ ہیں۔ آئندہ بھی سرسید کی سیاسی پالیسی کے عنوان کے تحت جو اقتباسات بغیر حوالہ کے آئیں وہ سب اسی کتاب سے ماخوذ سمجھنا چاہئیں۔ موصوف نے خود کوئی بات بغیر حوالہ کے نقل نہیں کی ہے۔

شیخی نہ کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ لارڈ رپن کی رائے میری ہی
اسپیچ کے زور سے بدلی کہ (لوکل بورڈ اور میونسپل بورڈ میں)
ایک ثلث کا تقرر گورنمنٹ کے ہاتھ میں رہا اور دو ثلث
انتخاب الیکشن سے۔"

۱۸۶۹ء میں جب گورنر جنرل آف انڈیا کے اختیارات کی توسیع کے لیے برطانوی پارلیمنٹ میں بل پیش کیا گیا تو سرسید اس زمانہ میں انگلستان میں مقیم تھے۔ وہاں سے انھوں نے نواب محسن الملک کو ایک خط میں لکھا "حقیقت میں ہندوستان غلام ہو گیا اور یہ بل نہایت مضر ہندوستان کے لیے ہے۔ اگر انگلستان میں یہ قانون جاری ہوتا تو کل رعیت اس کی منسوخی کی درخواست کرتی۔"

حقیقت یہ ہے کہ بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی کے اس زمانہ کے حالات کو مدِنظر رکھا جائے تو سرسید کے یہ خیالات ترقی پسندانہ ہی نہیں۔ بلکہ انقلابی ہیں۔

کانگریس کی مخالفت کے اسباب و وجوہ

اب آئیے اس پر غور کریں کہ اس درجہ ترقی پسند اور انقلابی ہونے کے باوصف وہ کانگریس کے اتنے مخالف کیوں تھے؟ اس سلسلہ میں مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری نے "مسلمانوں کے روشن مستقبل" میں مفصل بحث کی ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ کالج کے قائم ہونے کے دس برس بعد تک تو سرسید کے خیالات و افکار بہت اعلیٰ اور حریت پسندانہ رہے لیکن اس کے بعد وہ رفتہ رفتہ مسٹر بیک پرنسپل کے زیرِ اثر آتے رہے یہاں تک کہ وہ سرسید کے سیاسی فکر و ذہن پر ایسا چھا گئے کہ سرسید کا قلبِ ماہیت ہو گیا۔ موصوف کے اس

معروضہ کے جواب میں تو ہم صرف اسی قدر کہنا چاہتے ہیں کہ وہ خواہ کتنے ہی بڑے کانگریسی، حریت پرست اور محب وطن ہوں۔ بہر حال اس وصف خاص میں وہ پنڈت جواہر لال پر سبقت نہیں لے جاسکے۔ پنڈت جی سرسید کی سیاسی پالیسی کے بارہ میں لکھتے ہیں:۔

پنڈت جواہر لال نہرو کا بیان | بورژوا ہندوؤں کی کوشش سے وطن پرستی کی ایک نئی تحریک شروع ہو رہی تھی۔ سرسید کے نزدیک اس تحریک میں شرکت سے مسلمانوں کی توجہ اور دھیان اصل تعلیم سے ہٹ جاتے اس لیے انھوں نے اس تحریک کی مخالفت کی ہندو جو مغربی تعلیم میں مسلمانوں سے نصف صدی آگے تھے۔ حکومتِ وقت پر نکتہ چینی کرنے کا مشغلہ اختیار کرسکتے ہیں، لیکن سرسید اپنے تعلیمی کاموں کے لیے حکومت کا بھرپور تعاون چاہتے تھے اور اسی لیے جلد بازی میں وہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتے تھے جس سے ان کے کاموں کو نقصان پہنچے۔ سرسید کا یہ فیصلہ کہ مسلمانوں کو تمام کوششیں جدید تعلیم سے آراستہ ہونے پر صرف کر دینی چاہئیں یقیناً درست اور صحیح تھا، اس تعلیم کے بغیر میرا خیال ہے۔ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی موثر حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہندوؤں کے مقابلہ میں کم حیثیت ہو جائیں گے۔ جو مسلمانوں سے تعلیم میں بھی آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط تھے۔ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں ابھی تک کوئی بورژوا طبقہ نہیں پیدا ہوا تھا۔ اس لیے نہ تو تاریخی حالات اس کی اجازت دیتے تھے اور نہ مسلمانوں کے خیالات میں کوئی ایسا انقلاب پیدا ہوا تھا کہ وہ بورژوا تحریک وطنیت میں شریک ہو جاتے۔ سرسید کی یہ تمام کارروائیاں جو ہمیں واضح طور پر معتدل نظر آتی ہیں، درحقیقت ایک قسم کا

انقلاب پیدا کرنا چاہتی تھیں (سید احمد خاں از پروفیسر نظامی ص ۱۵۶)
سچ یہ ہے کہ سرسید کے سیاسی فکر اور کانگرس سے ان کی علیحدگی کے اصل سبب کا تجزیہ پنڈت جی نے مندرجۂ بالا بیان میں جس بالغ نظری، روشن دماغی اور حقیقت پسندی سے کیا ہے وہ اس بحث میں حرفِ آخر کا حکم رکھتا ہے۔

مولانا حالی کا بیان | اس سلسلہ میں مولانا حالی نے جو خیال ظاہر کیا ہے وہ بھی پنڈت جی کے بیان سے ملتا جلتا ہے۔ لکھتے ہیں:-

"اگرچہ مسلمانوں کی علیحدگی سے ہندوؤں میں ناراضی پھیل جانے کا نہایت افسوس ہے۔ لیکن کانگرس کی شرکت میں جو مضر نتائج مسلمانوں کے حق میں پیدا ہوئے وہ ان کے لیے اس سے بہت زیادہ افسوسناک ہوتے۔ اس لیے مسلمانوں کو سرسید کا دل سے شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس شخص کی چیخ پکار سے وہ ایک ایسے ایجی ٹیشن میں شریک ہونے سے باز رہے جو دولتوں کے لیے ہوکی آواز اور ہشیاروں کے لیے خالی بادل کی گرج تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ جب ہم کانگرس کے بلند ارادوں پر نظر کرتے ہیں اور پھر اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتے ہیں تو ہم کو لا محالہ کہنا پڑتا ہے کہ "حلوہ خوردن را روئے باید"۔"

اس کے بعد مولانا نے وہ تمام ذہنی تعلیمی، اخلاقی، معاشی، اور سماجی عیوب اور نقائص گنائے ہیں جن میں اس وقت مسلمان مبتلا تھے اور اسی اعتبار سے ہندوؤں سے بہت پیچھے تھے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:-

"ہماری حالت پر فی الواقع یہ مثل صادق آتی ہے کہ "اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی۔ جب ہماری قوم (مسلمانوں) کا یہ حال ہے

توکس برتے پر ہم نیشنل کانگریس میں شریک ہوسکتے ہیں اور کیا منہ لیکر ہم گورنمنٹ سے ان حقوق کا مطالبہ کرسکتے ہیں جن کے ہم مستحق نہیں ہوئے۔ ہم کو پہلے اس سے کہ گورنمنٹ سے کچھ مانگیں مانگنے کا استحقاق پیدا کرنا چاہیے اور پہلے اس سے کہ گورنمنٹ سے ان اصلاحوں کے خواستگار ہوں جو اس کے اختیار میں ہیں ہم کو وہ اصلاحیں کرنی چاہئیں جو خود ہمارے اختیار میں ہیں۔ اسی لیے سرسید نے اپنی لکھنؤ والی اسپیچ کے آخر میں مسلمانوں کو یہ نصیحت کی تھی کہ گورنمنٹ سے حقوق طلب کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اپنے تئیں ان حقوق کا مستحق بناؤ۔

(حیاتِ جاوید حصہ دوم ص ۱۱۵ - ۱۱۶)

محمڈن نیشنل کانفرنس میں شرکت سے انکار

کانگریس تو کانگریس، محمڈن نیشنل کانفرنس جس کو ۱۸۸۰ء میں سید امیر علی نے قائم کیا ـــــ تھا اور جس کی اس وقت وہی حیثیت تھی جو بعد میں مسلم لیگ کی ہوئی۔ جب سید امیر علی نے سرسید سے اس میں شرکت کی درخواست کی تو سرسید نے انکار کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہندو اور مسلمانوں کا مشترک پلیٹ فارم ہو یا کوئی انجمن صرف مسلمانوں کی ہو، بہر حال سرسید کو یقین تھا کہ مسلمانوں کے لیے کسی سیاسی تحریک میں شریک ہونا مضر ہوگا۔

مولانا عبید اللہ سندھی کی مثال

باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے زیر فیض و تربیت پنجاب کی غدر پارٹی اور بنگال کی انقلابی پارٹی کی طرح ان مجاہدینِ حریت میں سے تھے جنہوں نے ملک کو آزاد کرانے کی تحریک اس وقت

شروع کی تھی جب کہ کانگریس کے چہرہ پر سبزۂ خط کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا اس جرم کی پاداش میں وہ جلا وطن کر دیئے گئے۔ یہ زمانہ انھوں نے افغانستان، روس، ہنگری، زیکوسلاویہ، ترکی، بعض عرب ممالک اور حجاز مقدس میں بسر کیا اور عسرت و افلاس اور پریشانی کا وہ عالم گزرا ہے جو کانگرس کے نامی گرامی لیڈروں کو کم ہی پیش آیا ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود جب مولانا ۱۹۳۹ء میں تیس برس کی جلا وطنی کے بعد ہندوستان تشریف لائے تو اب ان کے سیاسی مسلک میں نمایاں تبدیلی آ گئی تھی۔ اب وہ بجائے مکمل آزادی کے مستعمراتی آزادی (DOMINION STATUS) کے قائل تھے۔ لوگوں نے ان کو بدنام کرنا شروع کیا۔ کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ! لیکن مولانا کی رائے میں کوئی تزلزل نہیں ہوا۔ وہ فرماتے تھے، میں آزادی کے سب سے پہلے علمبرداروں میں سے ہوں۔ لیکن جلا وطنی کے زمانے میں میں نے دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کو دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ آزادی اپنے ساتھ بڑی ذمہ داریاں بھی لاتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان کے لوگ اب تک ان ذمہ داریوں کو اٹھانے کے قابل نہیں بن سکے ہیں۔ اس لیے اب میری رائے ہے کہ مکمل آزادی کے بجائے ہم کو آزادی زیر سایۂ برطانیہ کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ وہ زمانہ تحریک آزادی کے شباب کا تھا اس لیے مولانا کی رائے کی حیثیت ایک مجذوب کی بڑ سے کیا زیادہ ہو سکتی تھی، لیکن ہندوستان اور پاکستان کے گزشتہ پچیس برسوں کی تاریخ کو سامنے رکھیے تو کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی کی رائے درحقیقت ایک دیوانہ کی بکواس ہی تھی۔ مرزا غالب نے اس نکتہ کو کس بلاغت سے بیان کیا ہے :-

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

یہی وہ پابستگی رسم و رہِ عام ہے جو قوم پروری اور حکومت پرستی کی پسندی اور رجعت پسندی کے چھوٹے پیمانے ناپتی اور [illegible] کرتا ہے یہی وہ چھوٹے معیار اور پیمانے ہیں جنہوں نے محمد علی جناح اور حسرت موہانی کو فرقہ پرست بنایا اور انھوں نے ہی مولانا عبید اللہ سندھی کی طرح سرسید کو اپنوں اور بے گانوں کی زبان سے کیا کچھ نہیں کہلوایا۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

سرسید کی ہندوؤں کی طرف سے مایوسی اور اس کا ردِ عمل

علاوہ ازیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ سرسید جو کچھ کر رہے تھے اس یقین سے کر رہے تھے کہ ان کے کاموں کا فائدہ کسی خاص ایک گروہ یا ایک فرقہ تک محدود نہیں۔ بلکہ گورنمنٹ ہندو اور مسلمان سب کے لیے عام ہے[1] چنانچہ آغازِ کار میں اور اس کے بعد بھی برسوں تک ہندوؤں نے سرسید کے ان کاموں کی بڑی قدر کی اور مسلمانوں کے ساتھ خود انھوں نے بھی چندے دیکر عملاً اور سرسید کو سپاسنامے پیش کرکے اس قدر دانی اور دل سے منت پذیری کا قولاً ثبوت بہم پہنچایا۔ لیکن حکومت کی پالیسی ہمیشہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی رہی تھی۔ آنریبل اے۔ سی۔ مزمدار

---

[1] چنانچہ انہوں نے ۲۸ دسمبر ۱۸۸۶ء کو لکھنؤ میں جو ایک نہایت اہم لکچر دیا تھا۔ اس میں کہا تھا "میری توجہ ہمیشہ اپنے بھائی مسلمانوں کی تعلیم کی طرف مائل رہی ہے اور اسی کو میں ہندوستان کے لیے قوم کے لیے اور گورنمنٹ کے لیے بہت مفید سمجھتا ہوں

لکھتے ہیں:-

"اوّل اوّل اپنی عملداری کے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کو بڑھایا گیا، اور اس کے بعد ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اٹھایا گیا جو باہمی رنجش اور عداوت کا سبب ہوا" (ہندوستان کا قومی ارتقاء (انگریزی) ص ۴۷)

اس بنا پر جب سرسید کی تحریک نے برگ و بار پیدا کرنے شروع کیے اور پورے ملک میں ان کی عظمت اور قائدانہ صلاحیت کا اعتراف کیا جانے لگا تو ہندوؤں کی طرف سے سرسید کے کاز (CAUSE) کی مخالفت میں آوازیں اٹھنے لگیں۔ اس مخالفت کی داستان بہت طویل اور المناک ہے۔ یہ مخالفت اردو اور ہندی کشمکش کی شکل میں شروع ہوئی جس نے ہندو قومیت کے جذبہ کو فروغ دے کر ملک کے دو اہم فرقوں میں مستقل سیاسی اور قومی نزاع پیدا کر دیا۔ ۱۸۶۷ء میں بہار گورنمنٹ نے اردو کو دفاتر سے خارج کر دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی اتر پردیش میں ناگری حروف کو جاری کرنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ یہاں تحریک کا مرکز بنارس تھا چنانچہ اسی برس یہاں کے ہندوؤں نے سرکاری عدالتوں سے اردو کو موقوف کرانے اور اس کی جگہ ہندی زبان اور دیوناگری حروف کو رائج کرنے کی تحریک شروع کر دی لیکن اس وقت مسلمانوں اور بعض ہندوؤں کی مخالفت کے باعث یہ تحریک آگے نہ بڑھ سکی ۱۸۸۲ء میں تعلیمی کمیشن مقرر ہوا تو اب ہندوؤں نے پھر کمیشن کے سامنے ہندی کے مسئلہ کو پیش کیا ۱۸۶۷ء میں علی گڈھ کی برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے گورنر جنرل کے نام ایک درخواست بھیجی گئی جس کا مسودہ خود سرسید نے تیار کیا تھا۔ اس درخواست میں گورنمنٹ سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ دیسی زبان میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایک سررشتہ قائم کیا جائے اور کامیاب طلبار کو سندیں دی جائیں لیکن اس کی مخالفت میں ہندوؤں

کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ مسلمانوں کے لیے اردو اور ہندوؤں کے لیے ہندی کا انتظام کیا جائے۔ غرض کہ ہندوؤں کی طرف سے بار بار اردو کی مخالفت اور ہندی کے مطالبہ کی آوازیں اٹھتی رہیں اور سرسید اس کے جواب میں برابر مضامین لکھتے اور گورنمنٹ کو اس خطرہ کی طرف متوجہ کرتے رہے۔ لیکن سرسید کی کچھ پیش نہ چلی اور یہ نزاع برابر شدید سے شدید تر ہی ہوتا چلا گیا، بہرحال جیسا کہ سرسید کے خطوں، ان کے مضامین اور تقریروں سے پتہ چلتا ہے ان حالات نے سرسید کو ہندوؤں کی طرف سے بالکل مایوس کر دیا اور ان کا قومی یک جہتی کا خواب ایک خواب پریشان ہو کر رہ گیا۔ اب انہیں محسوس ہوا کہ جب ہندوؤں کا رویہ ابھی یہ ہے تو پھر آیندہ ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے۔ مسلمان تعلیمی اور معاشی اعتبار سے ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت پسماندہ ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے زیادہ نہیں۔ ہندو ان کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کرنے کے لیے تیار نہیں چنانچہ زبان کے معاملہ میں ہندو مسلما ن کا کیا سوال ہو سکتا ہے وہ تو ہوا اور پانی کی طرح مذہب کی بنیاد پر نا قابل انقسام ہوتی ہے۔ لیکن ہندوؤں نے اس معاملہ میں بھی چھوت چھات کی بحث اٹھا دی، ہندی کی تحریک کے زمانہ میں فرانس کے مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے ایک لکچر میں سچ کہا تھا۔ ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے۔ سرسید نے سوچا کہ اگر ان حالات میں اصلاحات کا (جن کو حقوق کہا جا رہا ہے) نفاذ ہوا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندو ان سے فائدہ اٹھا کر اپنی من مانی کریں گے اور مسلمان منہ تکتے رہ جائیں گے۔ سرسید کا ذہن کسی مسئلہ پر فرقہ پرستی کا محدود دائرہ میں بند ہو کر سوچنے کا عادی نہیں تھا اس بنا پر انھوں نے خیال کیا کہ اگر ایسا ہوا تو اس میں صرف مسلمانوں کا نقصان

نہیں ہوگا. ملکہ ہندوؤں میں بھی جو کم تعلیم یافتہ اور کم خوش قسمت طبقات ہیں وہ بھی اصلاحات سے فائدہ اٹھانے کی دوڑ میں پچھڑی رہ جائیں گے اس سے ملک میں انتشار کی اور طبقاتیت پیدا ہوگی اور یہ ہندوستانی سوسائٹی تباہ ہو جائیگی. چنانچہ ایک مقام پر انھوں نے کہا ۔

"اس (جمہوری حقوق کے) مطالبہ سے مختلف قوموں میں کش مکش اور تناؤ پیدا ہوگا چونکہ یہاں بنگالی ہی تعلیمی میدان میں آگے ہیں اس لیے تمام سیاسی امتیازات کے وہ بلا شرکت غیرے مالک ہوں گے اور تمام ہندو، بہادر راجپوت، جوشیلے مرہٹے اور دوسری جنگ جو قومیں گورنمنٹ سے ناراض ہو جائیں گی، لشٹدراہ پا جائے گا۔ اور ملک کا امن غارت ہو جائے گا۔"

اس بنا پر ان حالات میں ملک اور قوم کے مفاد کا تقاضا یہی تھا کہ سیاست اور حقوق طلبی ان سب سے صرف نظر کر کے مسلمان خصوصاً (کیونکہ وہ ہندوؤں سے پیچھے تھے) اور سب باشندگان ہند عموماً اپنی تمام تر توجہ علوم جدیدہ کی تحصیل اور تعلیم پر مرکوز رکھیں اور گورنمنٹ سے لین دین کے جھگڑے میں نہ پڑیں. چنانچہ سرسید نے صاف صاف کہا

"جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پولٹیکل امور پر بحث کرنے سے ہماری قومی ترقی ہوگی میں اس سے اتفاق نہیں کرتا. بلکہ میں تعلیم کی ترقی کو اور صرف تعلیم کو ذریعہ قومی ترقی کا سمجھتا ہوں۔" (مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۲۸۲)

ایک مرتبہ انسٹیٹیوٹ گزٹ ۱۸۸۶ء ص ۱۹۹ پر لکھا :-

"ہماری نصیحت ہمیشہ اپنے دوستوں کو یہی رہی ہے کہ رعایتوں کی درخواستوں کے پیچھے مت پڑو اور قوم کو ناشدنی امر کا متوقع مت کرو۔ بلکہ عملی طور پر قوم کی ترقی تعلیم پر کوشش کرو۔" (بحوالہ روشن مستقبل ص ۳۰۸)

لکھنؤ کی تقریر میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"جو چیز تم کو اعلیٰ درجہ پر پہنچانے والی ہے وہ صرف ہائی ایجوکیشن ہے۔ جب تک ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا نہ ہوں گے ہم ذلیل رہیں گے اوروں سے پست رہیں گے اور اس عزت کو نہ پہنچیں گے جس پر پہنچنے کو ہمارا دل چاہتا ہے۔ یہ دلسوزی کی چند نصیحتیں ہیں جو میں نے تم کو کی ہیں۔ مجھے اس کی کچھ پروا نہیں ہے کہ کوئی مجھے دیوانہ کہے یا اور کچھ میرا فرض تھا کہ میرے نزدیک جو باتیں قوم کی بھلائی کی ہیں وہ ان سے کہہ دوں اور اپنا فرض ادا کر دوں اور خدا کے سامنے جو قادرِ مطلق اور رحیم اور گناہوں کا بخشنے والا ہے اپنے ہاتھوں کو دھو دوں۔" (حیات جاوید حصہ دوم ص ۱۱۶)

نکتہ چین کہتے ہیں کہ سرسید زندگی کے آخری برسوں میں بہت بدل گئے تھے۔ گزارش یہ ہے کہ جی ہاں! بہت بدل گئے تھے۔ لیکن دنیا میں بڑا سے بڑا لیڈر ایسا کون ہے جو حالات کی نبض پر اپنی انگلی نہیں رکھتا اور وقت کی ہواؤں کے رخ کو پہچان کر ان میں تغیر و تبدل کے مطابق اپنے فکر و عمل کے سانچوں کو نہیں بدل لیتا، یہ تبدیلی روشن ضمیری اور بیدار مغزی کی دلیل ہے۔ نہ کہ تلونِ طبع اور کمزوری کی۔ حالات کا صحیح رخ پہچاننا اور اس کے مطابق خود اپنے موقف میں تبدیلی پیدا کرنا جس طرح افراد و اشخاص کو توانائی بخشتا ہے۔ اسی طرح قوموں کی زندگی اور ان کی بقا کا ضامن ہے۔ دور کیوں جائیے۔ خود کانگریس کی گزشتہ اور حال کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے۔ تبدیلیوں اور قول و عمل کے تضاد کا ایک عجیب و غریب مرقع نظر آئے گا۔ جو کانگریس ہمیشہ لوگوں کو یقین دلاتی رہی کہ تقسیم اس کے نزدیک ملک کو تباہ کر دے گی اور وہ کبھی اس پر رضامند نہ ہوگی اچانک

تقسیم پر رضامند ہو گئی اور عوام منہ دیکھتے رہ گئے۔ اس بنا پر ہم صاف لفظوں میں اعتراف کرتے ہیں کہ جزئی طور پر اور طریق کار کے اعتبار سے سرسید میں تبدیلی ضرور پیدا ہوئی اور اس سلسلہ میں ان کی افتادِ طبع کے مطابق ان سے بعض معاملات میں بے اعتدالیاں یقیناً صادر ہوئیں لیکن ان سب کا اصل ذمہ دار کون ہے؟ وہی جارحانہ ہندو قومیت جس کی طرف پنڈت جواہر لال نہرو نے اشارہ کیا ہے اور وہی اکثریت کا گھمنڈ جس نے اقلیت کے جذبۂ اخلاص کی کبھی قدر نہ کی۔ اور جس نے سرسید ایسے عالی ظرف انسان کو مجبور کر دیا۔ کہ مسلمانوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے حکومت سے قرب کا سہارا لے اور اس کے ساتھ اپنے تعلقات زیادہ سے زیادہ استوار کرے۔ آج بھی اگر گوشِ حقیقت نیوش ہو تو سرسید کی قبر سے آواز آرہی ہے:۔

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

رسول شاہد و مشہود

(از جناب قاری بشیر الدین صاحب پنڈت۔ ایم۔ اے)

کتب سماویہ اور صحف انبیاء علیہم السلام کے اندر سرکار دوعالم تاجدار مدینہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارات اس کثرت اور تفصیل کیساتھ درج ہیں کہ انکے ذریعہ سے ذات پاک کے تعین و تشخص میں از روئے عقل و انصاف کسی قسم کا ادنیٰ شک و شبہ بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ لیکن علمائے امت ادھر کما حقہ توجہ نہیں دے سکے۔ امام فخر الدین رازیؒ جنھوں نے علم کلام کی بنیاد ڈالی تھی اور ان کے بعد ان کے متبعین نے اسکو ایک مستقل فن بنا دیا انھوں نے عقلی دلائل سے تمام عقائدِ اسلامیہ کا ثبوت دیا اور یونانیوں کے مسلمات کو جن کا عقائدِ اسلامیہ پر برا اثر پڑتا تھا۔ وہم باطل اور دھوکے کی ٹٹی ثابت کیا۔ اسی ضمن میں سب سے اہم اور معرکۃ الآرا مسئلہ ہمارے رسول مقبول روحی فداہ کی رسالت کا ثبوت یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں ایک ایسا مسئلہ تھا جس کا ثبوت دلائلِ عقلیہ سے اتنا مفید نہیں ہو سکتا تھا جتنا کہ ان کے مسلمات سے کارآمد ہو سکتا ہے۔ یہ مسلمات دو قسم کے ہیں ایک تو وہ مسائل ہیں جن کا ماخذ فلسفۂ یونان تھا ان کا استیصال تو علم کلام سے کیا گیا اور اس میں مسلمان کامیاب رہے لیکن دوسرا پہلو جو ان سب سے موثر تھا اور جسکی بنیاد ان کی کتب و صحائف سماویہ پر تھی اسکیر مسلمانوں نے صرف اتنی کوشش کی کہ ان کے صحائف کو محرف ثابت کیا اور اسی جواب کو کافی سمجھا حالانکہ یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں اگر کوئی استدلال ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ موجودہ توریت و انجیل میں عام اس سے کہ وہ محرف ہوں یا نہ ہوں آنحضورؐ کی بعثت کی پیشگوئیاں موجود ہیں

تک سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ان کو ثابت کیا جائے۔ بہرحال وہ کتابیں جو غیر مذاہب کی کئی ہزار سال سے چلی آتی ہیں ان کا اسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کر کے حقائق کو سامنے لایا جائے۔

آجکل ہم سائنٹفک دور سے گذر رہے ہیں جو بوجوہ چند اس ناچیز کے نزدیک اسلام کیلئے لیظہرہ علی الدین کلہ کا زمانہ ہے۔ اسلام کی صداقت کے لیے بے شمار دلائل اس زمانے میں پیدا ہو رہے ہیں اور غالباً محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقِ دعویٰ پر مختلف مذاہب کے واجب التعلیم انبیاء اکرام کی شہادۃ کا اظہار بھی اسی زمانے سے مخصوص ہے ورنہ کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اس سے پیشتر مذاہب عالم اپنی اپنی مقدس کتابوں کو کس قدر اہتمام اور کوشش سے عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھتے تھے جکی داستان نہایت طویل ہے لیکن اب وہ منظرِ شہود پر لائی جا رہی ہیں۔ مغرب کی یونیورسٹیوں میں "تقابلی مطالعۂ ادیان" کے شعبے کھلتے جا رہے ہیں اور مختلف زبانوں میں مہارت حاصل کر کے ان زبانوں کے مذہبی صحائف پر تحقیق نظر ڈالی جا رہی ہے۔ مثال کے طور پر وید منتر جو کل تک اچھوتوں کیلئے ممنوع تھے آج تقابلی مطالعۂ ادیان کی بدولت ویدوں کے نایاب پوشیدہ نسخے یورپ سے چھپ کر مشرق میں شائع ہو رہے ہیں اور زبانِ سنسکرت اقصائے مغرب میں جلوہ فگن ہے یہی حال دوسری زبانوں اور ان کے صحائف کا ہے۔ مجھ تو اسمیں بھی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی پیش خبری نظر آتی ہے اسلئے کہ انتھک کوشش کرنے والے وہ حضرات ہیں جو جناب مسیح علیہ السلام کے نام لیوا ہیں۔ جناب مسیح علیہ السلام صبح کا وہ ستارہ تھے جو افقِ عالم پر آفتابِ رسالت کی آمد کی انجیل (بشارت) لائے تھے اور قربِ قیامت میں لانیوالے ہیں۔ اسلئے آپ کے نام لیواؤں کی علمی خدمات خواہ وہ دینی ہوں یا دنیوی آنحضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر دلیلِ راہ ہیں۔ مسلمانوں کی موجودہ علمی کم مائیگی۔ تمدن کا زوال

اور تبلیغ دین کی بجائے تکفیر و تفسیق کی تخریبی کوششیں ایسے اسباب و قرائن ہیں جو ہم کو مٹانے کیلئے کافی ہیں لیکن یاد رکھیئے اللہ کے پیارے محبوب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود صرف مسلمان ہی نہیں پڑھتے بلکہ خود اللہ تعالیٰ اور اسکے ملائکہ بھی درود بھیجتے ہیں۔ اگر کسی آلہ جہاں نما سے اس درود کے اثرات کا مطالعہ کیا جائے تو مسلمانوں کا درود تو (الامان اللہ) اب آفتاب رسالت پر ظلمت و تاریکی کے کسوف سے چھپ رہا ہے لیکن خدا تعالیٰ اور اسکے ملائکہ کا درود ان ظلماتی بادلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کا سینہ منور کرتا ہے۔ مذاہب قدیم پر جو لٹریچر یورپ سے شائع ہو رہا ہے اسمیں صداقت اسلام کے بے شمار دلائل ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر عیسائی راہب اور علمائے یہود آپ کی آمد کا انتظار کر رہے تھے تو آج اپنی علمی موشگافیوں سے اس محسن مسیحا (جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی صداقت کو ثابت کر رہے ہیں۔ جناب مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریمؑ کے شجرۂ نسب پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کچھ کم احسان نہیں تھا اور یہ اسی احسان عظیم کا حقیر سا بدلہ ہے کہ یہ لوگ ہزاروں لاکھوں روپیہ خرچ کر کے اور محنت شاقہ برداشت کر کے اسلام کی خدمت انجام دے رہے ہیں کیا عجب ہے کہ ان کی ان جانکاہ کوششوں کی جزا میں انھیں اسلام جیسی نعمت نصیب ہو جائے۔

سرکار دو عالم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدس کو غیر مذاہب کے پیروؤں کے سامنے انھیں کی زبان میں اور انھیں کی مقدس کتابوں سے پیش کرنیکا کام مسلمانوں کا تھا لیکن ہمارے علماء اصلاحی کام کو تبلیغی کام سمجھتے رہے اور اس کام کو انجام نہ دے سکے تو اسمیں بھی کچھ حکمت خداوندی پوشیدہ تھی۔ اگر مسلمان ان مذاہبِ قدیم کی کتابوں کو قعرِ گمنامی سے نکال کر منصۂ شہود پر لاتے تو ان کتابوں میں تحریف کا شبہ مسلمانوں پر کیا جا سکتا تھا لیکن ان کتابوں کے ظاہر کرنے والے ایک غیر قوم کے علماء تھے کہ جنہیں مسلمانوں سے ایک گونہ مخالفت تھی اسلئے وہ پیشینگوئیاں جو ان کتابوں میں محفوظ ہیں ہر قسم کی تحریف کے

شک وشبہ سے پاک رہیں اور شاید یہی حکمت تھی کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ساتیر اور دید وغیرہ کتب پوشیدہ رہیں اور یہ علمی خزانہ مسلمانوں کو ان کی ہر قسم کی بے مائگی اور فقر کے زمانے میں دیا گیا تا کہ اس امر کی دلیل ہو کہ اسلام اپنی صداقت منوانے کے لیے دنیوی شوکت کا محتاج نہیں بلکہ اس کے دامن میں وہ علمی جواہر ریزے بھی موجود ہیں جو ہزارہا سال تک غیر مذاہب کے خزانوں میں بطور ایک نایاب عطیۂ خداوندی کے مدفون رہے۔

اقوام عالم کے لیے ایک قابل غور نکتہ اقوام عالم کے مشہور مذاہب میں یہودی، عیسائی، مجوسی و بودھ اور آریہ دھرم سر فہرست ہیں۔ دنیا کی ان تمام اقوام میں انبیاء و مصلحین کا سلسلہ ایک زنجیر کی طرح مسلسل زمانہ کے ساتھ چلتا نظر آتا ہے۔ ان تمام عظیم المرتبت انبیائے کرام، رشیوں اور وخشوروں کی زندگی عوام کی زندگی سے اس قدر بلند تھی کہ بعض ان میں سے خدا، خدا کے اوتار اور خدا کے بیٹے سمجھ کر پوجے گئے اور جن کی شمع حیات نے کروڑوں مردوں کو زندگی بخشی۔ ان کا نام زبان پر لانے کے لیے منہ کو مشک و گلاب سے پاک کرنے کی شرط ہے۔ انہوں نے اپنے پاک کلمات میں کہ جن کے متعلق کسی دنیوی غرض، لالچ و فریب کا شائبہ تک نہیں ایک نبی موعود کے ظہور کی پیشگوئی کی اور اس عہد و میثاق کو پورا کیا جو سورۂ عمران میں مذکور ہے جس کو نوری کرن شمارہ نمبر میں اجمالاً پیش کیا جا چکا ہے تو پھر ایسے نبی موعود پر ایمان لانا، درحقیقت اپنے اپنے انبیاء کی اطاعت اپنے ہی رشیوں اور وخشوروں کی فرمانبرداری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ وہ انبیاء جو ہزارہا سال پیشتر عرب سے دور و دراز ممالک میں مبعوث ہوئے ان سب نے ایک ہی علیم و خبیر خدائے برتر کی وحی سے خبر پا کر ایک عظیم الشان نبی کے ظہور کی پیشینگوئی کی جو محض خبر کے رنگ کی نہیں بلکہ اس

کے ساتھ دلائل اور اللہ تعالیٰ کی زبردست قوت و قدرت کے نشانات میں جگہ پیدا کر لینا ایک کمزور انسان کی طاقت سے قطعی محال اور غیر ممکن ہو گیا یہ امر واقعہ اس قابل نہیں کہ دنیا کے عقلاء و دانشمند اس امر پر غور کریں کہ ایک امی محض اور دنیوی علوم سے ناواقف وہ باتیں پیش کرتا ہے جو اس سے پیشتر کسی عالم نے نہیں بتائیں ان باتوں کی اگر تشریح کی جائے تو مضمون طویل ہو جائے گا۔ اس لیے طوالت سے بچنے کے لیے صرف دو ایک باتوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔

موعود نبی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو انبیا عالم میں بہت سی خصوصیتیں حاصل ہیں۔ ان میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ حضورؐ نے تمام انبیائے عالم کی تصدیق کی ان پر ایمان لانا ایسا ہی ضروری قرار دیا جیسا خود اپنی نبوت و رسالت پر۔ اسلام کا یہ عقیدہ اس قدر مہتم بالشان ہے کہ اس پر نہ صرف اتحاد اقوام اور مذاہب کی بنیاد قائم ہے، بلکہ اس عقیدے سے اگر ایک لمحہ کے لیے بھی روگردانی کر لی جائے تو مذاہب کی عمارت اسی وقت زمین پر آ رہتی ہے کیونکہ اسلام کے نزدیک مذہب ایک عالمگیر حقیقت ہے جو دنیا کی تمام اقوام کے اندر پائی جاتی ہے اور اس کا ماننے والا بین الاقوامی انسان ہے۔ آنحضورؐ کی بعثت سے پہلے کسی نبی نے یہ تعلیم نہیں دی اور نہ کل انبیاء عالم پر ایمان لانے کے عقیدہ کو کسی اور مذہب نے جزو ایمان ٹھہرایا۔ اس لیے اُس موعود نبی پر ایمان لانے والے مسلمانوں کا ذاتی فخر یہی ہے کہ وہ یہودیوں سے زیادہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے اور عیسائیوں سے زیادہ حضرت عیسیٰ روح اللہ کے پیرو ہیں اور ان تمام انبیاء کرام پر ایمان لانا جزو ایمان سمجھتے ہیں کہ جن کا ذکر فرقان حمید میں ہے اور جن کا ذکر نہیں کیا گیا ان کو بھی عزت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں صفحات ۴۱۱-۴۸۰-۵۶۵-۵۷۵-۵۷۶-۵۹۹-۶۵۹)۔

تفسیر کنز الایمان از شیخ اہل السنۃ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحبؒ) نیز صفحات خطبات احمدیہ ۵۶۹ اور ۵۷۹ از سر سید احمد خاں مرحوم۔

نسل انسانی کی ہر امت میں انبیاء کی بعثت کو تسلیم کرنا تو ایک طرف اکثر و بیشتر مذاہب نے تو اس امر کو بھی کشادہ دلی سے تسلیم نہیں کیا کہ ان کا خدا دنیا کی دوسری اقوام کا بھی خدا اور معبود ہے۔ برہمن دھرم تو صرف آریوں کو ایشور کی اولاد سمجھتا رہا (رگ ادھیاء ۶ کھنڈ ۲۶) ان کے خیال میں دیدوں کی گئوماتا صرف برہمن، چھتری اور ویش کو دودھ دہانہ اور ان کی پرورش کرنے والی ہے (اتھروید کانڈ ۱۹ سوکت ۱۷ منترا)۔ اسی طرح بنی اسرائیل کا خداوند یہودہ صرف بنی اسرائیل کا خدا تھا۔ جان۔ ایس۔ ہیلینڈ "مختصر تاریخ تہذیب" میں لکھتے ہیں:-

THE GOD, WHOM THE JEWS WORSHIPED HAD AT FIRST BEEN CONCEIVED OF AS THE TRIBLE DIETY OF A NOMADIC PEOPLE FOR MANY CENTURIES THE JEWS CONTINUED TO CONCEIVE THIS GOD OF RIGHTEOUSNESS AS THEIR GOD ONLY..... BUT THIS IDEA THEIR OWN NATIONAL GOD WAS ALSO THE GOD OF ALL OTHER MEN WAS NEVER WELCOMED AND ADEPTED BY THE MASS OF THE JEWISH POPULATION.

(A BRIEF HISTORY OF CIVILIZATION P.72)

بہرحال دنیائے مذہب میں جویائے حق کے لیے یہ ایک قابلِ غور نکتہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مصدقِ انبیائے عالم تھے۔ یہ اتحادِ اہلِ عالم کی بنیاد ہے اور انبیاءِ عالم سرکارِ دوعالم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مصدِق تھے۔ یہ دنیائے مذہب کا حصن حصین اور حریم امن ہے۔ اس حریمِ پاک سے جو شخص باہر رہے گا وہ دہریت و لامذہبیت کا شکار ہوگا اس لیے نہایت ادب کے ساتھ اپنے بھائیوں سے گزارش ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا عیسائی۔ یہودی ہوں یا مجوسی یا کوئی اور کہ وہ نہایت فراخدلی اور سنجیدگی کے ساتھ سطورِ ذیل پر غور فرمائیں۔

قانونِ شہادت کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ :-

DECOMENTS ARE SUPERIOR TO ORAL TESTIMONY AND ARE NOT TO BE OVER RULED BY WITNESSES OR BY ON OATH.

یعنی تحریری سند زبانی شہادت پر فضیلت رکھتی ہے اور اسے گواہوں کی شہادت اور قسم سے مسترد نہیں کیا جاسکتا تو پھر غور کیجیے کہ یہ وہی تحریری اسناد اور الہی نوشتے ہیں جو مقدس انبیاء رشیوں اور وخشوروں کی یادگار رہیں جن میں اللہ کے ان پاک اور برگزیدہ بندوں نے آنحضورؐ کی ذاتی وصفاتی خوبیوں کو بتاکر پیشینگوئی کی ہے کہ (امی نبی موعود محمد رسول اللہ) کا وہ چراغ ہے جیسے داغ ہے اور جس کی روشنی کو دوام ہے وہی روشنی گمراہی سے بچانے والی ہے"۔ اس لیے آئیے سب سے پہلے توریت وانجیل کی شہادتوں پر غور کریں۔

توریت وانجیل کی شہادتیں | (۱) حضرت آدمؑ کا کوئی الگ صحیفہ بائبل

میں موجود نہیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ حضرت آدمؑ کے متعلق فرمایا وہ بھی ان کے اصل الفاظ میں کہیں موجود نہیں جو حیثیت تاریخ کی نگاہ میں باقی قصص تورات کی ہے وہی حیثیت قصۂ آدم کی ہے البتہ یہود میں ایک کتاب "آدم وحوا" کے صحیفہ کے طور پر مشہور ہے جو یقیناً جعلی ہے اور غالباً حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سو دو سو سال پہلے کی تصنیف ہے۔ تاہم اس قصہ کو مسیحی دوستوں نے جناب مسیحؑ کے متعلق بطور پیشینگوئی سمجھ کر غلط استنباط کیے۔ پیشینگوئی کے الفاظ یہ ہیں :-

سانپ کو ملعون ٹھہراتے ہوئے خداوند نے کہا "میں تیرے اور عورت کے درمیان اور تیری نسل اور عورت کی نسل کے درمیان عداوت ڈالوں گا وہ تیرے سر کو کچلے گا اور تو اس کی ایڑی پر کاٹے گا" (پیدائش باب ۳ آیۃ ۱۵ بر مکاشفہ کتاب مقدس مطبوعہ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور ۱۹۵۶ء)

مسیحی دوستوں کا کہنا ہے کہ جناب مسیحؑ نے کفارہ ہو کر سانپ (شیطان) کا سر کچل دیا اس طرح جناب آدم کے سلسلہ کی پیشینگوئی پوری ہو گئی حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس دکھائی دیتا ہے کیوں کہ اناجیل کی تصریحات کی بنا پر مسیحؑ نے ہرگز شیطان کا سر نہیں کچلا وہ ان کے حواریوں میں گھسا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً یوداس میں ہو کر شیطان نے جناب مسیحؑ کو بے حد تکالیف پہنچائیں، پطرس کو جناب مسیحؑ کی سرکار سے شیطان کا خطاب دلوایا۔ انجیل متی ۱۶: ۲۳ میں ہے "پر اس نے (مسیحؑ نے) پھر کے پطرس سے کہا اے شیطان میرے سامنے سے دور ہو تو میرے لیے ٹھوکر کا باعث ہے" شیطان نے یہودا اسکریوطی میں ہو کر خدا کے اکلوتے بیٹے کو صلیب دلوا دی۔ اس کے

متعلق جناب مسیح فرماتے ہیں:-

"کیا میں نے تم بارہوں کو نہیں چنا جو اور ایک تم میں سے شیطان ہے۔"
(یوحنا ۶: ۷۰) اب رہا کفارہ کا عقیدہ اس کے متعلق کیا کہا جائے۔ اس نے گناہ کی جڑ کو بجائے کاٹنے کے اسے اور مزید تقویت دی۔ اس عقیدہ کی بنا پر مقبول شخصے عصے ہر گناہ داخل ثواب ہے آج۔ البتہ اس پیشگوئی کی حقیقی مصداق جناب محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔ جنہوں نے لوگوں کو گناہ سے اس قدر نفرت دلائی کہ وہ گناہ یا شیطان کے حقیقی دشمن بن گئے۔ اور اس سے بیزار ہو گئے۔ شراب، جوا، زنا، چوری، جھوٹ غرضیکہ ہر بدی و بدکاری ان سے دور ہو گئی۔ انھیں کے متعلق فرمایا گیا۔

"قال هذا صراطٌ علىّ مستقيم ان عبادى ليس لك عليهم من سلطان۔ یعنی یہ سیدھا راستہ میری طرف پہنچتا ہے۔ میرے بندوں پر تیرا (اے شیطان) کوئی غلبہ نہیں۔" (۱۵: الم: ۴۲)

جناب آدمؑ کی مذکورۂ بالا پیشنگوئی کے متعلق خود جناب مسیحؑ شہادت دیتے ہیں کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ہے فرماتے ہیں: "میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر تمہیں کہیں لیکن وہ فارقلیط (روح القدس) جسے باپ، میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تمہیں کہی ہیں تمہیں یاد دلائے گا۔" (بحوالہ یوحنا باب ۱۴ آیات ۲۵ و ۲۶) اس پیشنگوئی پر تفصیلی بحث انجیلی بشارات کے ضمن میں کی جائیگی سر دست اتنا بتا دینا کافی ہے کہ فارقلیط جن کے تشریف لانے کی خوشخبری جناب مسیحؑ سنا رہے ہیں اس کے لفظی معنی کیا ہیں؟ فارقلیط مرکب لفظ ہے فارق + لیط۔ فارق بمعنی پھاڑنے والا یا سر کچلنے والا۔ لیط بمعنی شیطان رجیم۔

اس طرح پورے لفظ کے معنی ہیں "شیطان کا سر کچلنے والا"۔ اللہ تعالیٰ اس امر سے بخوبی واقف تھا کہ وہ اپنے پیارے حبیب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو خوشخبری حضرت آدمؑ کے ذریعہ سنا رہا ہے وہ مسیحی لوگ جناب مسیحؑ پر منطبق کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس لیے اس کی حکمتِ بالغہ نے مسیحؑ کی زبان سے کہلوا دیا کہ اس بشارت کے مصداق وہ نہیں ہیں بلکہ فارقلیط کی ذاتِ گرامی ہے جو میرے جانے کے بعد تشریف لائیں گے۔ اللھم صلّ وسلم وبارک علیہ۔

(۲) جناب حنوک (ادریسؑ) کی پیشینگوئی | حضرت حنوک یا ادریس علیہ السلام جناب آدم علیہ السلام کی ساتویں پشت میں ایک جلیل القدر پیغمبر گزرے ہیں۔ ان کی عظمت و شان کا اندازہ توریت کی اس آیت سے ظاہر ہے کہ "حنوک تین سو برس خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ ... اور غائب ہو گیا۔ اس لیے کہ خدا نے اُسے لے لیا"۔ (توریت پیدائش باب ۵ آیات ۲۲، ۲۴) کتب جوبلی میں جو بائبل کے یونانی نسخہ میں شامل ہے ان کے متعلق لکھا ہے "اس نے سب سے پہلے علم و حکمت، رسم الخط اور علم نجوم ایجاد کیا۔ خدا کے فرشتے تین سو سال تک اس کے ساتھ ساتھ رہے اور انھوں نے اسے زمین و آسمان کی ہر ایک چیز کا علم دیا"۔ (جوبلی باب ۴) قرآن عزیز میں انھیں صادق و صابر نبی بتایا گیا ہے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ وہ علم رمل میں ماہر تھے۔ معراج شریف میں ان سے چوتھے آسمان پر ملاقات ہوئی۔ حکماء و فلاسفہ نے حضرت ادریسؑ کی تعلیم و نصائح کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اس کے لیے ملاحظہ ہو "تاریخ الحکماء" از علامہ جمال الدین قفطی نیز قصص القرآن جلد اول ص ۹۳ تا ص ۱۰۱۔

انھیں اللہ تعالیٰ نے ایک کتاب دی جو صحیفۂ حنوک کہلا[illegible]
عبرانی زبان میں تھی اور اب اتھوپیا زبان میں اس کا ترجمہ ہو گیا ہے [illegible]
کتاب "اسرارِ حنوک" ہے جو سالونیکا زبان میں موجود ہے۔ انسا[illegible]
ببلیکا کے مطابق تیسری چوتھی صدی عیسوی تک لوگ اس سے [illegible]
بائبل کے مروجہ نسخہ میں ان کی کسی کتاب کا ذکر نہیں لیکن آج کل بائبل [illegible]
نے جو الواح الگ دی ہیں ان میں حضرت حنوک کا خصوصیت سے ذکر ہے۔ وہ
علم و حکمت اور بے نظیر اطاعت احکام الٰہی کے اعتبار سے ایک ممتاز حیثیت
رکھتے ہیں۔ قرآن حمید میں ان کے لیے "اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا" کہہ کر ان
کی بے نظیر نبوت کی تصدیق کی ہے اور "وَّرَفَعۡنٰہُ مَکَانًا عَلِیًّا" کہہ کر ان کے
لیے علم و حکمت عطا کیے جانے کا ذکر ہے۔ انھوں نے جو پیشینگوئی آنحضورؐ
کے متعلق کی ہے وہ یہوداہ کے خط سے ظاہر ہے۔ یہ خط عہد نامہ جدید
میں شامل ہے (ملاحظہ ہو صفحہ ۲۴ آیۃ ۱۴) اور مسیحی مسلمات سے ہے۔ خط
کی عبارت یہ ہے :۔

" حنوک نے جو آدم کی ساتویں پشت میں تھا ان کی بابت بتایا کہ دیکھو خداوند
اپنے دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آتا ہے تاکہ سبھوں کی عدالت کرے
اور سب بے دینوں کو ان کی بے دینی کے کاموں پر جو انھوں نے بے دینی سے
کیے اور ساری سخت باتوں پر جو بے دین گنہگاروں نے اس کی مخالفت میں کہی
ہیں ملزم گردانے۔" یہ پیشینگوئی پوری کی پوری جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ
وسلم پر صادق آتی ہے اس لیے کہ :۔

(۱) دس ہزار قدسیوں کا آقا بجز جناب محمد رسول اللہ کے اور کوئی
نہیں۔ فتح مکہ کے وقت یہ جماعت آپ کے ساتھ تھی۔ ویدھی اسکی تصدیق

کرتے ہیں اور صاحب تیر بھی (۲) فتح مکہ کے وقت عدالت بھی ہوئی اور یہودیوں کو ملزوم قرار دیا گیا (۳) یہ سب حضرات ایک خداوند اعظم کی آمد کے منتظر تھے ۔ (۴) اس پیشینگوئی کے بعد یہ جناب مسیح نہیں ہیں کیونکہ یہوداہ کا خط مسیح علیہ السلام کے بعد لکھا گیا ہے۔ جسمیں انہیں اس پیشینگوئی کا مستحق نہیں گردانا گیا۔

(۳) حضرت نوح علیہ السلام کی پیشینگوئی | حضرت نوح علیہ السلام کی شخصیت یہودی، عیسائی، مجوسی، ہنود نیز مسلمانوں بلکہ تمام اقوام عالم کے نزدیک مسلم ہے ان کی پیشینگوئی دبشارت سرور کائنات جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہم سب کے لیے قابل غور ہے۔ جناب نوحؑ کو ویدوں و شاستروں میں "منوح" اور "زندا وستا میں یم" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ جس طرح یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں میں انھیں آدم ثانی کہا گیا ہے۔ اسی طرح "منوح" کو ویدوں میں ساری نسل انسانی کا باپ بتایا گیا ہے۔ وید کے کم و بیش پچاس حوالہ جات میں اس کی صراحت موجود ہے۔ اسی طرح قرآن عزیز میں ۲۸ سورتوں کے اندر ۴۳ جگہ حضرت نوحؑ کا اجمالی و تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔ سورۂ اعراف، ہود، مومنون، شعراء، قمر و نوح میں اہم تفصیلات درج ہیں۔ توریت موسوی اور ان الواح میں جو بابل کے کھنڈرات سے دستیاب ہوئی ہیں ایک حیرت انگیز مطابقت پائی گئی ہے۔ طوفان نوح کا "قصہ گل گمیش کی مثنوی" جو بابل کے کھنڈرات سے ملی ہے اس کی گیارھویں لوح کے پہلے چار کالموں میں کندہ ہے۔

توراۃ موسوی کی کتاب پیدائش باب ۹ آیۃ ۱۴ میں جناب نوح علیہ السلام کی بشارت کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

میں اپنی کمان بدلی میں رکھتا ہوں اور یہ ایک عہد کا نشان ہوگی میرے اور زمین کے درمیان۔ اور ایسا ہوگا کہ جب میں زمین کے اوپر بادل لاؤں گا تو کمان

بدلی میں نظر آئے گی اور میں اپنے عہد کو جو میرے اور تمہارے اور ہر جاندار کے درمیان ہے یاد کروں گا اور طوفان کا پانی پھر نہ ہوگا کہ سب جانداروں کو تباہ کرے اور کمان بادل میں ہوگی اور میں اس پر نگاہ کروں گا تا کہ اس ہمیشہ کے عہد کو جو خدا کے اور زمین کے سب جانداروں کے درمیان ہے یاد کروں۔

اس پیشنگوئی کے الفاظ پر غور کیجیے تو دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ (۱) ایک یہ کہ جس طرح حضرت نوحؑ کے زمانے میں بدیوں کی کثرت تھی اسی طرح ایک زمانہ پھر ایسا ہی ہوگا جس میں کہ بدیوں کا زور ہوگا (۲) دوسری بات یہ کہ بدی کے طوفان کے بالمقابل اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسا طوفان نہیں آئے گا کہ کل دنیا کو شرارت اور بدی کی سزا میں غرق کر دے یعنی وہ اپنی کمان بدلی میں رکھتا ہے اس کی کمان اب بدلی سے باہر نہ ہوگی۔ یاد رکھیے بائبل، ژندا وستا، وید اور مثنوی گل گمیش میں کمان اٹھانے کا محاورہ جنگ کی تیاری اور کمان رکھ دینے کا محاورہ جنگ ختم کر دینے کے لیے مستعمل ہے اور خدا کا بدلی میں ہونے کا محاورہ رحمت کے پردے میں ہونے کے لیے بولا جاتا ہے (ملاحظہ ہو احبار ۱۶: ۲)

یہ پیشنگوئی نہایت واضح طور پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے اور ان کے زمانے کے لیے مخصوص ہے۔ اس کی تائید جناب مسیحؑ کے ان الفاظ سے ہوتی ہے جو متی ۲۴: ۳۷ میں درج ہیں۔ جناب مسیحؑ نے فرمایا ... نوح کے دنوں میں ہوا ویسا ہی ابن آدم (یعنی احمدؐ) کا آنا ... جس طرح طوفان سے پہلے لوگ کھاتے پیتے بیاہ ... طوفان آیا اور ان سب کو بہا لے گیا اسی طرح ابن آدم کا ... کھیت میں ہوں گے ایک پکڑا اور دوسرا چھوڑا جائے گا۔ دو عورتیں چکی پیستی ...

ایک پکڑی دوسری چھوڑی جائے گی۔" (متی ۲۴ آیۃ ۳۷)

حضرت مسیح کے الفاظ پر غور کیجیے کہ بدی اور غفلت کا طوفان عالمگیر ہوگا مگر سب پکڑے نہ جائیں گے صرف حق کا دشمن ماخوذ ہوگا اور توبہ کرکے نیکی کی طرف رجوع کرنے والوں کو چھوڑ دیا جائے گا نیز ایسا وقت مسیح علیہ السلام کے جانے کے بعد آئے گا۔ اس طرح جناب عیسیٰ علیہ السلام کے بعد صرف آنحضورؐ وہ نبی ہیں جن پر یہ پیشنگوئی صادق آتی ہے۔ اللہ کے حکم سے آنحضرتؐ نے جناب نوحؑ کی طرح پیشتر ہی سے اپنی قوم کو بتلا دیا تھا کہ میرا اور تمہارا معاملہ نوحؑ اور ان کی قوم کے ساتھ مماثلت رکھتا ہے۔ جس طرح قوم نوحؑ غرق ہوئی اور مومنین کو بچا لیا گیا۔ اسی طرح یہاں بھی ہوگا حسب بشارت توریت کتاب پیدائش باب ۹ آیۃ ۱۴ جنگ کے بادل فضا میں چھا گئے مسلمانوں اور کفار میں رعد و برق کے خوب مظاہرے ہوئے مگر خدا کی کمان بدلی سے باہر نہیں ہوئی بلکہ رحمت کی بدلیوں میں ہمیشہ نظر آئی پیشینگوئی کے مطابق اگر بدکار پکڑے گئے تو کثرت سے مومنوں اور تائبین کی جان بخشی بھی کی گئی۔ چونکہ آنحضورؐ رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گئے ہیں اس لیے بھی اب منکرین اور بدکاروں کے ساتھ معاملہ نوحؑ کی قوم کی طرح نہیں ہوگا ان کی بداعمالیوں پر سزا ضرور دی جائیگی لیکن انھیں نیست و نابود نہیں کیا جائے گا بلکہ تائب ہونے کا موقع دیا جائے گا اگر توبہ کرکے ایمان لے آئے تو اللہ کی طرف سے نجات کا وعدہ ہے۔

(۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بشارت

حضرت نوحؑ کے بعد [illegible] عظمت کے لحاظ سے جناب ابراہیم علیہ السلام دنیا کی تمام قوموں کے مشترکہ باپ [illegible] قرآن مجید کی ۲۵ مکی و مدنی سورتوں میں ۶۳ آیات کے اندر ذکر مذکور ہے، ہندو [illegible] کے نزدیک برہما جی ابوالبشر ہیں۔ دیوتاؤں میں وہ سب سے پہلے پیدا ہوئے اور برہم وِد یا (صحیفۂ الہٰی) جو سب علموں کی بنیاد ہے اپنے بڑے لڑکے اتھروا کو سکھائی۔

(ملاحظہ ہو منڈک اُپ نشد ا : ۱) اس لیے اتھروید انگیس کی طرف منسوب ہے ان کا چھوٹا لڑکا انگرس تھا (ملاحظہ ہو گوپتھ برہمن) چنانچہ از روئے تاریخ حضرت ابراہیم کے دو بیٹے تھے۔ بڑے حضرت اسماعیلؑ اور چھوٹے حضرت اسحٰقؑ۔ انھوں نے یہ تمنا کی کہ اے پروردگار عالم میں تیرا فرماں بردار ہونے پر بھی تنہا اور بے اولاد ہوں۔ کیا اچھا ہو کہ میں اپنی مثل اپنی صفات کا دوسرا دیو (روشن پیغمبر) پیدا کروں میں نے سخت محنت شاقہ سے ریاضت کی" (گوپتھ برہمن ۱:۱، بائبل پیدائش ۱۶:۱ تا ۱۶) گوپتھ برہمن میں اس کے بعد افسانہ کے رنگ میں لکھا ہے کہ ان کے یہاں میٹھے اور کھاری دو الگ الگ پانیوں سے اتھروا اور انگرس پیدا ہوئے۔ میٹھے پانی سے اتھروا اور کھاری پانی سے انگرس کی پیدائش ہوئی۔ میٹھے پانی سے مراد اتھروا کی ماں ہاجرہ (ہاجرہ) جو حلیم مزاج اور صابر تھیں۔ کھاری پانی سے مراد انگرس کی ماں سرسوتی (سارہ) جو نہایت تنک مزاج اور غصیلی تھیں۔

اس افسانہ میں بھی ایک حقیقت ہے اور وہ یہ کہ ان دونوں بیٹوں کی نسل یعنی بنو اسماعیل اور بنو اسرائیل میٹھے اور کھاری سمندر کی مثال ہیں۔ بائبل میں کئی جگہ کھاری اور میٹھے سمندر کی تمثیل آتی ہے۔ کھاری سمندر بنی اسرائیل ہیں جنکو قربانیوں بچہ کی پیدائش وغیرہ کی رسوم میں نہایت سختی سے نمک کے استعمال کا ذکر ہے (احبار ۲: ۱۳، حزقیل ۱۶: ۴) جناب مسیحؑ فرماتے ہیں۔" اے بنو اسرائیل تم زمین کے نمک ہو۔" (متی ۵: ۱۳) کتاب شمار ۱۸: ۱۹ میں لکھا ہے "یہ نمک کا عہد خدا کے حضور ہمیشہ کے لیے ہے۔" بائبل کے ان بیانات سے آپ کو کھاری و نمکین سمندر کا پتہ چل گیا۔ اب آئیے شیریں اور میٹھے سمندر پر نظر ڈالیں جو حضرت ہاجرہ اور ان کی اولاد سے متعلق ہے۔ ارشاد باری ہے" وھو الذی مرج البحرین هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا

(۵۲:۲۵) اور اللہ وہی ہے جس نے دو سمندر چلا رکھے ہیں یہ میٹھا ہے اور
بہت میٹھا اور وہ کھاری ہے سینہ جلانے والا۔ ان دونوں کے درمیان ایک
برزخ ہے اور روکنے والی روک ہے۔ گویا بنو اسماعیل اور بنو اسرائیل دو
میٹھے اور کھاری سمندر ہیں۔ اَلْمُؤمِنُ حُلْوٌ مؤمن شیریں ہوتا ہے (حدیث)
ان میٹھے اور کھاری سمندروں کے ملنے میں صدیوں سے ایک روک ہے۔ مگر اب
مرج البحرین یلتقیان بینھما برزخ لا یبغیان (۵۵:۲۱) یہ بہتے ہوئے
دونوں سمندر ملا دیئے جائیں گے ان دونوں کے درمیان ایک برزخ ہے جس سے
ایک دوسرے پر بغاوت نہیں کر سکتے۔ غور کیجیے یہ شرقی و غربی آرین اور سامی
یا اسرائیلی و اسماعیلی دو کھارے اور میٹھے سمندر ہیں جو اقوام عالم کے باپ برہما
جی یا حضرت ابراہیمؑ سے پیدا ہوئے ہیں یہ ابراہیم کی اولاد میں سے اس پیشینگوئی
کا مبشر نبی اس برزخ (اوٹ) کو کاٹ کر دونوں سمندروں کو ملا دے گا جب
ابراہیمؑ کی نسل کے کل انبیاء کی تصدیق کرے گا اور کل امۃ واحدۃ کا سبق
پڑھائے گا۔ جبکہ بنی اسرائیل نے صرف اپنے انبیاء کی تصدیق کی۔ آریوں نے
صرف اپنے رشیوں کو تسلیم کیا۔ لیکن پیشینگوئی کا وہ موعود برہما اور دعاء
ابراہیم آتا ہے جو ابراہیم کے گھرانے کی تمام بکھری ہوئی قوموں کو یکجا جمع
کرے گا۔ مسیح اس لیے آئے کہ صرف بنو اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو جمع
کریں۔ لیکن وہ موعود نبی (محمدؐ) اس لیے مبعوث ہوئے کہ تمام دنیا کی گم شدہ
قوموں کو یکجا اکٹھا کریں۔ اتنا سمجھ لینے کے بعد اب ذرا اس پیشینگوئی پر نظر
ڈالیے جو پیدائش باب ۱۲ آیۃ ۲ میں محفوظ ہے۔

(باقی آئندہ)

تفسیری رجحانات اور نئی تفسیر کی ضرورت

ڈاکٹر معین الدین اعظمی

روئے زمین پر قرآن کے علاوہ کوئی ایسی دینی کتاب نہیں ہے جس نے دیباچہ کے بعد اپنا آغاز اس چیز سے کیا ہو کہ اس کی صداقت پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا؟ الم ذلك الكتاب لا ريب فيه اور اگر کوئی آدمی اور خاص کر تعلیم یافتہ خواہ وہ کسی مذہب کا پیرو ہو اگر اس جملہ سے قرآن کی ابتدا پر سنجیدگی سے غور کرے تو وہیں اس کو اس کتاب کی عظمت کا اندازہ ہونے لگے گا اور معلوم ہوگا کہ اس کتاب کا ایک ایک جملہ اور لفظ کسی خاص حکمت کے پیش نظر رکھا گیا ہے جو خاص دقت اور مطالعہ چاہتا ہے۔

واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے شروع ہی سے اس کتاب مقدس کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اور ہر پہلو سے اس کی تعلیمات کو جاننے اور اس کو مشعلِ راہ بنانے کے لیے شاندار کوشش کی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی تفسیر کا جو مفہوم بالکل آغاز میں تھا وہ باقی نہ رہ سکا یعنی شروع میں تفسیر کا فن مستقل فن نہ تھا لیکن یہ علم حدیث کا ایک جزو تھا اور جب کسی آیت کی تفسیر اور اس کا مطلب سمجھنا ہوتا تھا تو رسول اللہ اور اس کے اصحاب سے اس سلسلہ میں جو مروی ہوتا تھا اس کو پیش کر دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ تفسیر کو تفسیر بالرائے یعنی من مانی یا خیالی تصور کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے اس مفہوم و تصور کے لحاظ سے قرآن کی تفسیر کا ذخیرہ بہت ہی معمولی تھا اور اس دائمی چشمہ سے پورے طور پر فیض یاب

نہیں ہو اجا سکتا تھا۔ لہٰذا علماء کی ایک جماعت نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ عقل اور اجتہاد کو بھی قرآن کی تفسیر میں دخل ہونا چاہیے۔ مگر عقل کا یہ استعمال قرآن میں ایک جائز حدود اور دائرہ میں ہونا چاہیے۔ یعنی قرآن کی تفسیر جو بھی ہو اگر وہ عربی اصول اور قواعد کے لحاظ سے درست ہے تو وہ تفسیر بالرائے نہ ہوگی۔

تفسیر میں یہ طریقہ ماثور یعنی ایک آیت کی تفسیر کلام رسول اور اقوال صحابہ سے کرنا سب سے پہلے رائج ہوا، اس اصول و نہج پر جو مشہور تفسیریں لکھی گئیں وہ یہ ہیں:۔ تفسیر ابن عباس، تفسیر ابن جریر الطبری، تفسیر ابن کثیر، سیوطی کی تفسیر الدر المنثور، تفسیر ماثور کے ساتھ ہی ساتھ دوسری تفسیریں بھی وجود میں آنے لگیں، جن میں ماثور کم اور دوسری عقلی اجتہادی اور خصوصی باتیں زیادہ ہونے لگیں۔ اعتقادی تفسیر جیسے زمخشری کی مشہور کتاب 'کشاف'، صوفی رجحانات کے مطابق تفسیر جیسے ابن العربی کی تفسیر، اسی طرح شیعی تفسیر اور عقلی و کلامی تفسیر جیسے امام رازی کی تفسیر مفاتیح الغیب۔ ان مشہور و عام رجحانات کے علاوہ اور بھی مختلف نقطہ ہائے نظر سے تفاسیر وجود میں آنے لگیں۔ جیسے نحوی، ادبی، فقہی، تاریخی اور سائنسی لحاظ سے۔

غرض قرآن جو انسانی ہدایت کے لیے نازل ہوا تھا ہر گوشہ سے مفسرین نے اس سے روشنی حاصل کرنی چاہی اور اس چیز میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ اصلی مقصد اس لحاظ سے ثانوی ہو گیا کہ دوسری بحثیں بہت زیادہ شروع ہو گئیں اور باوجود اس کے کہ اصول تفسیر کے کچھ شرائط مقرر کر دیئے گئے تھے ان کی پابندی نہ ہو سکی۔

میرا مقصد یہاں تاریخ تفسیر بیان کرنا نہیں ہے بلکہ صرف اہم تفاسیر،

اور اہم تفسیری جہات کا ایک جائزہ لینا ہے۔ ورنہ میں اس کو تفصیل سے بیان کرتا۔

یہاں پر ایک عجیب بات ہے اور وہ یہ کہ تفسیر میں ہر ایک مفسر نے اپنے پہلے مشہور مفسر سے اس قدر چیزیں نقل کی ہیں کہ ایک تفسیر کے طالب علم کو حیرت ہوتی ہے اور خاصکر تفسیر کی وہ کتابیں جو تفسیر ماثور کے نام سے موسوم ہیں، لہذا جب کوئی تفسیر ابن جریر الطبری، تفسیر ابن کثیر اور تفسیر الدر المنثور میں باہم موازنہ کرے تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی اور ان تفاسیر میں مروجہ روایات کا اس قدر وافر حصہ ہے کہ بسا اوقات وہ قرآن کے ربط اور نظم معنوی کو منقطع اور درہم برہم کر دیتا ہے۔ نیز ان تفسیروں میں اس قدر سطحیت نظر آتی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کے ظاہری معنیٰ کے علاوہ اس کے اندر کیا فلسفہ اور کیا حکمت ہے اس تک رسائی نہ ہو سکی۔

دوسرے مکتب خیال کی تفسیر جس کو اعتقادی یا اپنے خیالات و افکار کے مطابق قرآن کی تفسیر کہا جائے ان میں تفسیر کشاف ہے۔ اس تفسیر نے سب سے پہلے قرآن کے اندر جو ادبی لطافت اور معنوی نظم ہے اس کو اس طرح اجاگر کرنے کی کوشش کی کہ قاری مطمئن و متاثر ہو جائے، اس میں بہت حد تک کامیابی حاصل کی۔ اس کے علاوہ اس نے عقلی تحلیل پر خاص زور دیا جو تفسیر ماثور میں نہیں پائی جاتی۔

مگر عجیب لطف ہے کہ مفسرین اس کو معتزلی قرار دیتے ہیں اور اس کو مستحسنہ تفاسیر میں شامل نہیں کرتے لیکن اس سے مفسرین نے اس قدر فائدہ اٹھایا ہے اور متاثر ہوئے ہیں کہ میرے خیال میں اگر تفسیر طبری سے زیادہ

نہیں تو تفسیر ابن کثیر اور الدرالمنثور سے کہیں زیادہ اٹھایا اس تفسیر کے اندر گو اعتزال تھا۔ مگر جو اچھائیاں تھیں اگر دوسرے مفسرین ان اچھائیوں کا ادراک کرتے تو قرآن کی تفسیر صحیح سمت میں دور تک پہنچ سکتی تھی۔

تیسری تفسیر جس پر مفسرین نے عام طور پر تنقید کی ہے اور بعض لوگوں نے یہاں تک کہدیا کہ تفسیر کے علاوہ اس میں ہر چیز ہے وہ تفسیر مفاتیح الغیب ہے جو تفسیر رازی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بیان ایک متطرفانہ بیان تھا کیوں کہ مفسرین اس تفسیر سے تفسیر کشاف سے بھی زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔ اس تفسیر کا خاص امتیاز یہ ہے کہ عقلی طور پر امام رازی ہر قسم کے مسائل اور علوم کا استخراج کرتے ہیں اور ہر مسئلہ میں نقلی و عقلی دونوں تاویلیں تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ میں نے عام طور پر یہ دیکھا ہے کہ مفسرین انھیں اقوال میں سے اپنے پسند کے لحاظ سے کوئی تاویل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس تفسیر کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ نظم معنوی کو اجاگر کرنے کی قابل ستائیش کوشش کی گئی ہے اور کہیں کہیں بہت ہی واضح قسم کا ربط معنوی موجود ہے۔

ان کے علاوہ جتنی بھی تفسیریں ہیں اگر وہ تفسیر ماثور میں سے ہیں تو طبری ابن کثیر اور الدرالمنثور سے متاثر ہیں اور اگر عقلی ہیں تو کشاف اور رازی سے سخت متاثر ہیں اور جدت ابتکار اور اصلیت اور نئے منہج و اسلوب کا ان میں فقدان ہے اس طریقہ علوم قرآن پر جو کتابیں ہیں ان کا بھی یہی حال ہے۔ یعنی لوگوں کو تفسیر پر کام کرنے کا شوق بہت ہوا مگر اس میں محققانہ بات کہنے کی ہمت کم ہوئی۔ مثال کے طور پر آپ امام زرکشی کی کتاب البرہان فی علوم القرآن اور امام سیوطی کی کتاب الاتقان فی علوم القرآن کا موازنہ کیجیے تو پتہ چلے گا کہ امام سیوطی صاحب نے صفحے کے صفحے زرکشی

کی کتاب البرہان فی علوم القرآن سے بغیر حوالہ کے نقل کئے ہیں۔

ان تمام تفاسیر اور علوم قرآن کی کتابوں میں دو باتیں مشترک ہیں اور وہ یہ کہ ان میں ہر مسئلہ پر مختلف رایوں کو جمع کر دیا گیا ہے اور نقل اور [illegible] کم ملتی ہے۔

اب ہم ان تفسیروں کا سرسری جائزہ لینے کے بعد، دو تین صدی کے اندر ہند و مصر میں تفسیر پر جو کام ہوا ہے اس کا سطحی جائزہ لیتے ہیں۔

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ کے بعد سے تفسیر پر بہت قابلِ قدر کام ہوا۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنے وسعت مطالعہ اور اجتہادی رائے کے ذریعہ بہت سے مسائل پر محققانہ بحث کی۔ آپ نے علوم قرآن کے مسائل جیسے اسباب نزول، ناسخ و منسوخ، متشابہات اور دوسرے مسائل پر سیر حاصل بحث کی۔ قرآن کا ترجمہ کیا جو تفسیر کے مانند ہے۔ اس کے بعد تفسیر کا کام بہت تیزی سے آگے بڑھا اور تفسیر میں مولانا فراہی، مولانا تھانوی اور مولانا آزاد کی بہتر تفسیریں ملیں۔ ان تفسیروں میں نظم معنوی کا کافی خیال کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی التزام کیا گیا کہ مختلف تاویلات میں سے جو تاویل صحیح ہو صرف اس کو نقل کیا جائے اور بقیہ کو چھوڑ دیا جائے۔

ہندوستان کے مفسرین میں سے فراہی صاحب کے یہاں اس کا التزام سب سے زیادہ ہے۔ آپ نے قرآن کی ایک قطعی تاویل پر زور دیا۔ فراہی صاحب نے گو پوری تفسیر نہ کی کیوں کہ عام اور سطحی تفسیر کو وہ پسند نہ کرتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ محققانہ بات کرنے پر زور دیتے تھے۔ انہوں نے قرآن میں نظم معنوی کے وجود اور اس کو تلاش کرنے کے مختلف نقلی اور عقلی اصول بتائے۔ اور ہم دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ نظم قرآن پر، گو یہ رائے ابوبکر النیشاپوری

نادے سے موجود تھی اور زمخشری ورازی کے علاوہ دوسرے مفسرین نے بھی
ن کی طرف توجہ کی۔ مگر امام فراہی نے نظم قرآن کو جاننے کے لیے سب سے پہلے
ول و قواعد بنائے اور اس کو باقاعدہ ایک فن بنا دیا اور اس طرح تمام
ندمین و متاخرین و معاصرین پر سبقت لے گئے۔ اس طرح اگر فراہی کے اصول
یر کے مطابق تفسیر کی جائے تو سب سے پہلے آیت کی صحیح تاویل سامنے
ئے گی پھر قرآن کی سورتوں اور آیتوں میں باہم گہرا تعلق سامنے آئیگا۔
ث عرب دنیا میں مصر میں تفسیر پر دو تین صدی میں بہت اچھا کام ہوا ہے
ختلف اعتبارات سے ہندوستان سے کہیں زیادہ بہتر اور عمدہ ہے ان
یں شیخ عبدہٗ نے جو تفسیر کی، اور جو اصول اور مناہج بنائے وہ پرانی تفسیر
مقابلہ میں بہت عمدہ ہیں۔ اس تفسیر کا خاص امتیاز یہ ہے کہ قرآن انسانی
یت کے لیے نازل ہوا، لہذا سب سے پہلے مفسر کو قرآن میں یہ چیز حاصل کرنی
ہیے۔ ساتھ ہی اس تفسیر میں قرآن کی ادبی فنی اور نظم معنوی کو بھی اجاگر کرنے
رشش کی گئی ہے لیکن بہت التزام کے ساتھ نہیں۔ یعنی ثانوی حیثیت کے
مد شیخ رشید رضا کی تفسیر چونکہ شیخ عبدہٗ کی تفسیر کا اکمال ہے۔ اس لیے اس
ام و بحث کرنے کا خاص فائدہ نہیں۔
ے مصر کی دوسری تفسیروں میں سید قطب کی مشہور تفسیر فی ظلال القرآن
یہ مکمل تفسیر ہے اور اسلوب و بیان کے لحاظ سے تمام تفسیروں میں عمدہ
۔ ان تفسیروں میں قرآن کی فنی خوبیوں کو اس قدر پیارے انداز میں بیان
یا تا ہے کہ جس کی نظیر نہیں۔ البتہ معنوی نظم و ربط اس قدر معقول و
وط نہیں ہوتا۔ یہ تفسیر بہت عمدہ ہے اگر مؤلف نے نظم معنوی کے
ل کے لیے کوئی اصول بیان نہیں کیا۔ جس سے دوسروں کو کچھ

آسانی ہو، اس تفسیر میں ایک کمزوری مجھ کو یہ نظر آئی کہ تفسیر و تاویل میں محققانہ انداز اختیار نہیں کیا گیا ہے اور بہت جگہوں پر کمزور، نقلی تاویلات واقوال پر اعتماد کیا گیا ہے اور اجتہادی و محققانہ چیز کم ہے۔

۳۔ مصر میں تیسری تفسیر جو چند سورتوں کی تفسیر ہے مگر باقاعدہ ایک اصول اور منہج رکھتی ہے، اس منہج کے ذریعہ پورے قرآن کی تفسیر کی جاسکتی ہے وہ ڈاکٹر بنت الشاطی کی التفسیر البیانی للقرآن، یہ بالکل ایک نئے منہج اور اصول پر لکھی گئی ہے جو تفسیر کے مقدمہ اور امین الخولی صاحب کی کتاب مناہج تجدید فی النحو والبلاغت والتفسیر والادب میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس منہج کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ قرآن کی موضوع کے لحاظ سے تفسیر کرنے پر زور دیتا ہے۔ یعنی یہ کہ قرآن کو موضوع کے لحاظ سے مرتب نہیں کیا گیا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکاۃ قصص احکام اور تبلیغ کو مختلف جگہوں پر بیان کیا گیا ہے۔ لہذا جب کسی چیز کی تفسیر مطلوب ہو تو پورے قرآن میں اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا چاہیے اور تاریخ نزول کے اعتبار سے اس کا پورا علم حاصل کرنا چاہیے اور پھر اس کی تفسیر کرنی چاہیے۔

اس تفسیر کی خاص خوبی یہ ہے کہ یہ ہر آیت پر از سر نو غور و فکر کی دعوت دیتی ہے اور کسی بھی مفسر کے قول کو بغیر تنقید وتمحیص کے قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس تفسیر میں تمام نقلی وعقلی اور دوسری تاویلات میں سے کسی ایک تاویل کو لے کر دوسری تاویلات کے بطلان اور کمزوری کو اجاگر کیا جاتا ہے اور اسرائیلیات کا جو تسلط ہو گیا تھا اس کو باطل کیا جاتا ہے اس طرح یہ بہترین تفسیر ہے۔

سوریا میں ڈاکٹر محمد المبارک نے بھی اپنی کتاب المنہل الخالد میں قرآن کی

تفسیر کا ایک طریقہ پیش کیا ہے۔ یہ طریقہ محمد قطب اور بنت الشاطی کے طریقے سے ملتا جلتا اور مشابہ ہے۔ اس میں انھوں نے قرآن کے نظم معنوی اور ادبی خوبصورتی کی طرف خاص اہتمام کیا ہے۔ مگر انہوں نے نظم معنوی تلاش کرنے کے لیے کوئی اصول نہ بتائے بلکہ اس کو لوگوں کے ذوق و ذہانت اور وجدان پر چھوڑ دیا۔ ساتھ ہی انھوں نے صرف چند سورتوں کا نمونہ پیش کیا۔ کاش وہ پورے قرآن کی تفسیر اس انداز سے کر دیتے تو اسرائیلیات اور قیاسی باتوں کا جو ایک بہت بڑا ذخیرہ قرآن کی تفسیر میں داخل ہو گیا ہے۔ وہ دور ہو جاتا اور قرآن کو خود قرآن سے سمجھنے کا راستہ ایک خاص منزل تک پہنچ جاتا۔

ہندوستان کے علامہ فراہی اور مصر کی ڈاکٹر بنت الشاطی کی تفسیر میں مجھ کو بہت پسند آئیں، کیونکہ ان دونوں تفسیروں میں کئی چیزیں بیّن طور پر مشترک ہیں۔ مثال کے طور پر۔

۱۔ قرآن کی قطعی تفسیر یعنی اسبات کی تحدید کہ قرآن کی کیا مراد ہے۔

۲۔ بلاغتِ قرآن کا ظہور۔

۳۔ اسرائیلیات جو قرآنی کی تفسیر میں بڑی حد تک سرایت کر گئی ہیں ان کا اخراج۔

۴۔ اخلاق، احکام کے حلت وحرمت کا فلسفہ اور ان کے دور رس فوائد و نتائج کا انکشاف۔

۵۔ اسباب نزول، ناسخ و منسوخ، متشابہات، قسم قرآنی، اور مقطعات کے مسائل کا حل اور ان پیچیدہ مسائل کی اقرب ترین تاویل۔

نئی تفسیر کی ضرورت اور طریقۂ تفسیر۔

یہاں پر ایک اہم سوال ہے جو بہت سے لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب تفسیر اور علوم تفسیر پر اس قدر ذخیرہ موجود ہے تو پھر نئی تفسیر کی کیا ضرورت ہے اور اس کا کیا اصول ہونا چاہیے۔

اس سوال کے مختلف جواب ہو سکتے ہیں۔

(۱) یہ تفسیریں مواد تنظیم و تنسیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی نہیں ہیں اور نہ ہی اپنے آخری منزل کو پہنچ گئی ہیں جس کے بعد اس میں تحسین و تکمیل کی گنجائش نہ ہو۔

(۲) قدماء مفسرین نے اپنے زمانے کے لحاظ سے یہ کتابیں لکھی تھیں۔ مگر اب جبکہ علم کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا ہے اور کم وقت میں زیادہ چیز جاننے کی ضرورت ہے لہٰذا ان تفسیروں میں جو بہت سی دور از کار چیزیں آ گئی ہیں، جن کی چنداں ضرورت نہیں تھی مگر اُس زمانہ کے لحاظ سے مفید تھیں، ان سے نئی تفسیر کو خالی ہونا چاہیے۔

(۳) ان تفسیروں کی زبان بھی بہت خشک اور نامانوس ہے۔ نیز ان میں اس قدر تکرار اور ایک دوسرے مواد کی ترتیب و تبویب اس قدر خلط ملط اور نقص ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ بہت زیادہ ہیں بہت کم ہیں۔

(۴) موجودہ عمدہ تفسیریں جن کا ابھی ذکر ہوا وہ نامکمل ہیں اور صرف چند سورتوں کی تفسیر ہیں۔

(۵) سابقہ تفسیر قدیم و جدید انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہیں اس وقت عالم اسلام و عرب کی مشترکہ کوشش سے تدریجی طور پر مجموعی لحاظ سے کام کرنے کی ضرورت ہے اور تفسیر قرآن اور علوم قرآن کے سلسلہ میں مختلف مباحث پر مختلف کمیٹیاں قائم ہوں جن میں عالم اسلام و عرب کے وہ ممتاز علماء شریک ہوں جن کا قرآنیات سے گہرا تعلق ہو اور ہر کمیٹی کے نتیجہ کو دوسری کمیٹی تنقیدی نقطہ نظر

سے دیکھے اور مباحثہ کرے۔

اس مشترک سعی کی اس لیے بھی ضرورت ہے کہ قرآن میں جس قدر بے پایان علم ہیں اور جس ذات کی طرف سے اترا ہے ایک انسان اس کو کما حقہ سمجھنے سے قاصر ہے۔

اب دوسرا سوال یہ ہے کہ اس نئی تفسیر کا کیا طریقہ اور کیا منہج ہونا چاہیے۔ اس کے لیے اسکیم اور کام کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے میرے خیال میں تدریجی طریقہ کا اپنانا مفید ہوگا۔

سب سے پہلے جو تفسیر لکھی جائے، اس میں اس فکر کی کلی تطبیق ہو جس کو معسرین نے عام طور پر تسلیم کیا ہے مگر عمدہ کام بہت کم ہوا اور وہ یہ ہے کہ قرآن کو شروع سے آخیر تک فکری لحاظ سے منظم و مربوط کتاب مانا جائے۔ جس کے علمبردار اس زمانہ میں ہندوستان کے علامہ فراہی ہیں۔ اس فکر کے موئدین کی یہ دلیل بہت معقول معلوم ہوتی ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آیتوں کو مختلف سورتوں میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک ہی باب وسورت میں تمام آیتوں کو جمع کر دیا جاتا مگر افسوس ہے کہ اس نہج پر کوئی بھی مکمل تفسیر نہیں ہے اور جو ہیں ان میں باقاعدہ اس کا التزام نہیں کیا گیا ہے اور جو فکری ومعنوی ربط وتعلق بنائے گئے ہیں وہ لبا اوقات کمزور اور عقلی لحاظ سے ناقابلِ قبول ہیں۔

اس سلسلہ میں نظم الدرر فی تناسب الآی والسور اور تفسیر کشاف، رازی، عبدہٗ، رشید رضا، سید قطب اور ہندوستان میں مولانا فراہی، مولانا تھانوی، مولانا آزاد کے یہاں بہت کچھ مواد مل جاتا ہے:

مولانا فراہی ان تمام معسروں میں تنہا معسر ہیں جنھوں نے قرآن میں نظم معنوی کو معلوم کرنے کے لیے مستقل کتاب دلائل النظام لکھی اور اس میں قرآنی نظم کو

معلوم کرنے کے لیے بہت سے نقلی وعقلی طریقے بتائے۔

مولانا فراہی نے قرآن فہمی میں چالیس سال گزارے مگر وہ پوری تفسیر نہ لکھ سکے۔ کیونکہ جو راستہ انہوں نے اختیار کیا اس پر ان کو قدم قدم پر دشواری سامنے آئی ہے۔

اس طریقہ پر تفسیر کرنے سے فراہی صاحب کے قول کے مطابق مختلف ومتضاد تاویلات میں سے صحیح تاویل کھل کر سامنے آجاتی ہے اس قسم کی جو تفسیر کی جائے تو ہر سورت کی ابتدا میں اس کے موضوع، موضوع کے جزئی وکلی عناصر کو خلاصہ کے ساتھ بیان کر دیا جائے تاکہ ہر سورت مکمل خیال و موضوع کا ایک پیکر معلوم ہو۔

۲۔ دوسری تفسیر موضوعی لحاظ سے ہو جس طرح کی مصر کی ذاکر بنت الشاطی نے کی ہے۔

۳۔ جب یہ دونوں تفسیریں مکمل ہو جائیں، اس کے بعد ان کے اندر جو مشترک چیزیں ہیں ان کی روشنی میں ایک تیسری تفسیر لکھی جائے اور جہاں کہیں اختلاف ہو اس کو از سر نو غور کیا جائے۔ اس طرح ایک بہترین تفسیر وجود میں آسکتی ہے جو تمام تفاسیر سے اصح اور صحیح ہوگی۔

اس قسم کی تفسیر کی تیاری کے ساتھ علوم قرآن کے مختلف اہم پہلوؤں پر نہایت محققانہ مستقل بحثیں ہونی چاہئیں اور وہ یہ ہیں:-

۱۔ نظم قرآن کو کیسے جانا جائے، قرآن اس کو کس طرح پر بیان کرتا ہے اور کس طرح قرآن اپنے اساسی اغراض ومقاصد کو جیسے توحید، رسالت اور آخرت مستقل موضوع بناتا ہے اور پھر دوسرے جزئی امور کی طرف ملتفت ہوتا ہے۔

۲۔ بلاغت قرآنی کو معلوم کرنے سے پہلے خود قرآن کے اسالیب کو معلوم کیا جائے جو قرآن نے خود استعمال کیے ہیں۔

۳۔ اقسام القرآن پر مفصل کتاب ہو جس میں تمام قسمیہ آیات کے وجہ استدلال اور مقسم بہ اور مقسم علیہ کو ظاہر کیا جائے، ساتھ ہی ان میں جو بلاغتی خوبیاں ہیں ان کو بھی اجاگر کیا جائے۔

۴۔ ناسخ و منسوخ پر مستقل رسالہ ہو جس میں اس قسم کی تمام آیات کو یکجا کیا جائے اور آیا واقعی ان میں نسخ ہے یا نہیں اس کو بیان کیا جائے۔ اور امام سیوطی اور شاہ ولی اللہ نے ناسخ و منسوخ میں تاویل کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کو سامنے رکھا جائے، ساتھ ہی ان آیات کے بعد تخصیص و تعمیم کی جو آیات ہیں ان کے اتارے جانے کی حکمت کو بیان کیا جائے۔

۵۔ اسباب نزول پر مستقل بحث ہو اور ان تمام آیات کو جن کی تاویل میں مشکل پیش آتی ہے یکجا جمع کر کے ان کی تاویل بیان کی جائے اور ان واقعات کو ظاہری سبب بنا کر جو آیات نازل ہوں ان کے اندر جو فلسفہ ہے اسکو اجاگر کیا جائے۔

۶۔ قصص القرآن پر محققانہ بحث ہو اور قصص کے تاریخی پہلو کے علاوہ ان میں جو حکم و مواعظ اور فلسفہ ہیں ان کو بیان کیا جائے۔

۷۔ امثال و تشبیہات پر مستقل کتاب ہو جس میں ان کے فنی اور معنوی حکمت و فلسفہ کو بیان کیا جائے۔

۸۔ مجادلۂ یہود و نصاریٰ، مشرکین و منافقین کے اندر جو فلسفہ موجود ہے اس کو مفصل بیان کیا جائے اور صرف اس کی ظاہری صورت پر اکتفا نہ کیا جائے۔

یہ چند وہ عام موضوعات ہیں جن کی قرآن فہمی میں بعد وقت ضرورت پیش آتی ہے اور اس قسم کی اب تک جتنی کتابیں ہیں وہ بے حد سطحی ہیں لہذا ضرورت ہے کہ ان پر از سر نو بہت تحقیق کے ساتھ کام ہو اور کچھ نئی چیزیں دریافت کی جائیں جو اب تک دریافت نہ ہو سکیں۔

اس طرح قرآن وعلوم قرآن پر اس وقت ایک عالمی اور اسلامی سطح پر محنت وکوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس طریقہ کا کوئی قدم اٹھایا گیا تو یقیناً اہم اور مفید کام اب بھی ہو سکتا ہے جو پہلے کاموں سے زیادہ بہتر زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ امت کے اندر ایک جوش اور ہمت ہو اور اس فکر سے گریز ہو کہ جو کچھ قدیم مفسروں نے لکھا ہے اب مزید اس میں اضافہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یقیناً نہیں ہے۔ مگر ان میں نکھار پیدا کیا جا سکتا ہے اور جو کج روی ہوتی ہے اس کو دور کیا جا سکتا ہے۔

بعض اہم مراجع

۱۔ تفسیر طبری
۲۔ تفسیر الکشاف
۳۔ تفسیر ابن کثیر
۴۔ الدر المنثور
۵۔ التفسیر البیانی للقرآن
۶۔ تفسیر نظام القرآن
۔ تاویل الفرقان بالفرقان
۷۔ فی ظلال القرآن
۸۔ دلائل النظام
۹۔ الفوز الکبیر
۱۰۔ المنہل الخالد
۱۱۔ البرہان فی علوم القرآن
۱۲۔ الاتقان فی علوم القرآن
۱۳۔ مذاہب فی التفسیر الاسلامی
۱۴۔ مباحث فی علوم القرآن
۱۵۔ مناہج تجدید فی النحو والتفسیر والادب
۱۶۔ منہج الامام عبدہ فی تفسیر القرآن
۱۷۔ منہج الزمخشری فی تفسیر القرآن
۱۸۔ مقدمۃ ابن خلدون
۱۹۔ فجر الاسلام
۲۰۔ ضحیٰ الاسلام

شایق اور انکا دیوان فارسی[ل]

ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، دہلی یونیورسٹی

انیسویں صدی عیسوی میں جب شمالی ہند میں فارسی کا چرچہ کم ہوا اور آہستہ آہستہ فارسی کی جگہ اردو نے لینی شروع کی، اس وقت جنوب ہند میں کرناٹک کے نوابوں نے بڑی فراخدلی سے فارسی کی سرپرستی کی۔ کرناٹک کے آخری نواب والاجاہ امیر الہند عمدۃ الامراء مختار الملک سراج الدولہ غلام محمد غوث خاں شہامت جنگ متخلص بہ اعظم (متوفی: ۱۸۵۵/۱۲۷۲) نے اس دور میں ایک مجلس مشاعرہ کی تشکیل کی جس میں مصرع طرح کا اعلان کر دیا جاتا تھا اور مختلف شعرا جنہیں اس مجلس میں شرکت کی اجازت تھی، اپنی اپنی فارسی غزلیں پیش کرتے۔ شعراء کے کلام پر تبصرہ اور تنقید ہوتی۔ میر مجلس، محمد حسین قادری مخاطب بہ شیریں سخن خان بہادر متخلص بہ راقم[ل۲] اور حکمین مشاعرہ

ل دہلی یونیورسٹی لائبریری، شمار مخطوطہ: ۲۸۳۶۸۵

ل۲ راقم اپنے وقت کے اساتذہ میں سے تھے انھیں نواب اعظم کی سہ درسی کا فخر حاصل تھا یہی وجہ ہے اپنے تذکرے گلزار اعظم کی تالیف میں نواب موصوف نے راقم کو شامل رکھا اور راقم نے بھی اس کی ترتیب میں نواب کا ہاتھ بٹایا۔ جب مجلس شاعرہ قائم ہوئی تو راقم کو اس کا میر بنا کر افضل الشعراء شیریں سخن خان بہادر کا خطاب دیا: سخنوران بلند فکر، طبع مدراس، ص: ۱۷۱۔

واقف[۱] و قدرت[۲] اس بحث و مباحثہ میں اپنی رائے دیتے۔ اگر مسئلہ حل نہ ہو
پاتا تو نواب موصوف اس میں مداخلت کرتے اور ان کی رائے مسلم مانی جاتی[۳]
علام محی الدین المخاطب بہ شائق علی خاں متخلص بہ شائق نے کرناٹک
میں اسی دور میں زندگی گزاری ہے۔ شائق ۱۲۰۲/ ۸۸-۱۷۸۷ میں اُدگیر (مہاراشٹر)
میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان علما اور صوفیوں کا خاندان تھا۔ شاہ صبغۃ اللہ

---

۱ مولوی میران محی الدین قادری متخلص بہ واقف ۱-۱۷۹۰/۱۲۰۵ میں ادگیر میں پیدا ہوئے
علمی فضیلت اور شاعرانہ مہارت کی وجہ سے نواب اعظم نے انھیں حکم اول مجلس مشاعرہ
مقرر کیا۔ مدراس میں شہر استاد کہلاتے تھے۔ نواب اعظم نے مدراس میں ایک مدرسہ قائم کیا
جس کا نام مدرسۂ اعظم رکھا۔ واقف اس مدرسہ میں مدرس مقرر کیے گئے۔
۲ محمد قدرت اللہ خاں گوپاموی مؤلف تذکرہ نتائج الافکار کا شمار پختہ گو شعرا
میں کیا جاتا ہے۔ قدرت ۱۷۸۵/ ۱۱۹۹ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۱۲/۱۲۲۷ میں مدراس
آئے۔ نواب اعظم جاہ بہادر نواب کرناٹک (۹-۱۸۱۰/۱۲۲۴ — ۶-۱۸۲۵/۱۲۴۱)
کے دربار سے خان کا خطاب اور نواب عظیم الدولہ بہادر رحمت مآب (۲-۱۸۰۱/
۱۲۱ — ۹-۱۸۱۸/۱۲۳۴) کے مقبرے کی تولیت مرحمت ہوئی۔ سخنورانِ بلند فکر
ص ۱۲۶، نتائج الافکار، طبع بمبئی: ص ۳۔
۳ اشارات بینش: (مخطوطہ) ایشیاٹک سوسائٹی، شمارہ ۶۲، ورق ۳، ۹
۵ گلزار اعظم: ص ۲۳۳
۶ اشارات بینش: ورق ۳۲ ب؛ نتائج الافکار: ص ۲۰۶؛ اس کے علاوہ دیوان میں
موجود ان اشعار سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شائق کا وطن اُدگیر تھا۔
بلی شائق تکالیف بہر حشمت مکنی ∴ رفتی گر یا بدت، برقلعۂ ادگیر باش (دیوان: ص ۴۲)
تا ازانکہ بہ مدراس زواقف دیدم ∴ محو گردید ز دل الفت ادگیر مرا (دیوان: ص ۱۱)

تائب رسول کے مرید مولانا حبیب اللہ اور سید محمد گیسو دراز، شایق کے خاندانی بزرگوں میں سے ہیں۔

شایق کے آبا و اجداد گلبرگہ سے ہجرت کرکے اُدگیر میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوئے[1]۔ عمر کے ابتدائی دور میں شائق اپنے والد شاہ احمد ابو تراب کے ہمراہ مدراس چلے آئے اور مدراس ہی میں مختلف اساتذہ کی نگرانی میں انکی ابتدائی تعلیم شروع ہوئی[2]۔ مولوی عبدالقادر اور مولوی شرف الملک بہادر نے انہیں عربی کی تعلیم دی۔ مولانا محمد باقر آگاہ[3] اور مولوی سید خیرالدین فایق نے انھیں فارسی سے روشناس کرایا۔ مؤخرالذکر ہی نے فارسی شاعری میں بھی شایق کی راہنمائی کی[4]۔ شایق اردو کے شاعر بھی تھے اور اس میدان میں مرزا محمد ظہیرالدین علی بخت اظفری[5] اور میر شاہ حقیقت حسین نے ان کی تربیت کی[6]۔

---

[1] گلزار اعظم: ص ۲۳۳ - [2] ایضاً: ص ۲۳۳، نتایج الافکار: ص ۷۰، ۴

[3] ان کے والد محمد مرتضیٰ المعروف بہ محمد صاحب تھے۔ ان کے اسلاف کا وطن بیجا پور تھا اور یہ ۱۷۴۵/۱۱۵۸ میں بمقام ویلور پیدا ہوئے، پندرہ سال کی عمر میں فارسی نظم و نثر لکھنے پر قادر ہو گئے۔ آگاہ حضرت سید شاہ ابوالحسن قدس سرہ سے بیعت تھے اور آپ ہی سے اشعار کی اصلاح لیتے تھے۔ آگاہ نے اپنے دور میں بڑا نام پیدا کیا اور ۱۸۰۵/۱۲۲۰ میں انتقال کیا، سخنوران بلند فکر: ص ۱۳۲-۱۳۴ - [4] گلزار اعظم: ص ۲۳۳، اشارات بنیش: ورق ۳۲ ب [5] ان کے والد کا نام محمد ولی تھا جو اورنگ زیب کی پوتی عفت آرا کے پوتے تھے۔ اظفری ۸-۱۷۹۷/۱۲۱۲ میں مدراس پہنچے اور یہاں مستقل قیام اختیار کیا۔ اظفری اردو کے اچھے شاعر اور ترکی زبان کے ماہر تھے لیکن فارسی شاعری کی طرف ان کی توجہ نہ تھی۔ ان کا انتقال ۹-۱۸۱۸/۱۲۳۴ میں ہوا۔ گلزار اعظم: ص ۴۱ - [6] گلزار اعظم: ص ۲۳۳ -

شایق کے مربی نواب اعظم نے اپنے تذکرہ گلزار اعظم میں شایق کی شاعرانہ صلاحیت کی بہت تعریف کی ہے۔ اعظم نے لکھا ہے کہ انھیں فی البدیہہ شعر کہنے میں کمال حاصل تھا۔ اس کے علاوہ ایک واقعہ اور بیان کیا ہے کہ شایق نے نواب موصوف کی فرمائش پر تیرہ دن کے دوران نعت اور منقبت میں سینتیس (۳۷) غزلیں کہہ ڈالیں۔[1]

شایق ۱۸۱۷-۸/۱۲۳۳ میں اپنی شادی کے سلسلے میں اپنے وطن ادگیر گئے اور وہاں سے واپسی پر نواب محمد غوث اعظم ہی کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور شہرت و نام پایا یہی وہ زمانہ ہے جب نواب نے انھیں شایق علیخاں کا خطاب عطا کیا اور اپنے ایک مدرسہ میں استاد مقرر کر دیا۔[2]

اپنی خاندانی روایات کے مطابق شایق کو بھی تصوف سے خاص لگاؤ تھا اسی مناسبت سے یہ اپنے چچا سید شاہ منصور قادری کے مرید ہو گئے تھے۔[3]

شایق کی وفات ۱۸۳۳-۴/۱۲۴۹ میں ہوئی جس پر ان کے چھوٹے بھائی اور مجلسِ مشاعرہ کے حَکَم مولوی واقف نے مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ لکھا:۔

بیدل عصر حضرت شایق	قدس اللہ سرہٗ السامی
کام دل جست چوں بقرب اللہ	کہ جہانست جای ناکامی
ہاتفم سال رحلتش فرمود	رفتہ ہیہات ہم دم جامی[4]
	۱۲۴۹

یہ واقف ہی تھے جن کے اچھے برتاؤ اور مہربانیوں کی وجہ سے شایق کے دل سے غریب الوطنی کا احساس ختم ہو گیا تھا۔

خلق از بسکہ بہ مدراس ز واقف دیدم محو گردید ز دل الفت ادگیر مرا[5]

[1] گلزار اعظم: ص ۵-۲۲۴ [2] ایضاً ص ۲۲۵؛ اشارات بنیش: ورق ۳۲ ب [3] ایضاً ص ۵-۲۲۴، نتایج الافکار: ص ۷۰ [4] ایضاً ص ۲۲۵؛ اشارات بنیش ورق ۳۲ ب [5] دیوان شایق: ص ۱۱۔

نواب اعظم نے گلزار اعظم میں شایق کے مندرجہ ذیل فارسی اور اردو آثار کا ذکر کیا ہے :- فارسی

۱- مرج البحرین : نعت ومنقبت میں غزلوں کا مجموعہ ۔

۲- روضۂ قدسیہ : شایق کے آبا واجداد کے حالات ۔

۳- مختصر فارسی دیوان ۔

اُردو :-

۱- رشک نسب ۔

۲- مختصر دیوان ۔

دیوان شایق :- شایق کے اس فارسی دیوان کا ذکر کسی فہرست نگار نے نہیں کیا ہے ۔ اس فارسی دیوان کے مخطوطہ کے شروع صفحہ پر ذیل کی عبارت درج ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا نام چمنستانِ فصاحت ہے ۔

" دیوانِ شایق مسمی بہ چمنستانِ فصاحت، من تصنیف شاعر نازک خیال، سرآمد اہل کمال، وحید عصر، علامۂ دہر، جناب غلام محی الدین صاحب المخاطب بہ شایق علی خاں تخلص شایق، مرحوم مغفور حسب اجازت، خاکسار سید خواجہ معین الدین چشتی معروف بخواجہ بڑ، تخلص سلام، مدراسی نبیسہ حضرت شایق ۔"

اس سلسلہ میں کوئی بات قطعی طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ اس دیوان کا ذکر شایق کے ہم عصر تذکرہ نگاروں نے کیوں نہیں کیا ۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ اعظم نے جس " مختصر فارسی دیوان " کا نام لیا ہے، زیر بحث دیوان وہی ہو۔ بہرحال اس دیوان پر کوئی تاریخ موجود نہیں اس کا سائز ۶" x ۸" ہے اور یہ تقریباً ۹۹ صفحات پر مشتمل ہے ۔ حاشیوں پر کہیں کہیں مشکل الفاظ کی تشریح

کی گئی ہے۔ معمولی مگر صاف نستعلیق میں لکھے گئے اس دیوان میں کل (۹۳) تیرانوے غزلیں، ایک مستزاد، دو قطعے، چھبیس[۲] رباعیاں، کچھ متفرق اشعار اور منقبت میں دو[۲] مطلع جمع کیے گئے ہیں۔ دیوان کی پہلی غزل جو حمدِ باری تعالیٰ میں ہے، اس مطلع سے شروع ہوتی ہے:

الٰہی زنگ روی گلرخان ده داستانم را
برنگِ کاکل مشکیں مسلسل کن بیانم را

شایق کا یہ دیوان مختصر سہی لیکن ان کی شاعرانہ مہارت، صوفیانہ طرزِ فکر اور فنی پختگی کا آئینہ دار ہے۔ دیوان کی بیشتر غزلیں شاعر کی بلند فکری کا نمونہ ہیں اور اس بات کا ثبوت بھی کہ شایق غزل کی نزاکت کو سمجھتے تھے اور اس صنف میں انھیں کمال حاصل تھا۔ اگر کچھ اشعار سے شائق کے صوفیانہ مزاج کا علم ہوتا ہے اور محبوبِ حقیقی کی تعریف میں شعر ملتے ہیں تو ایسے اشعار بھی کثرت سے نظر آتے ہیں جس میں محبوب مجازی کی تحسین و توصیف کی گئی ہے۔ اور جو اپنے شیریں اندازِ بیان، آسان طرز اور عام فہم ہونے کے وجہ سے پڑھنے والے کا دل موہ لیتے ہیں۔ اپنی اس خوبی کو شایق نے اس شعر میں نظم کیا ہے۔

گہی گریان وگہ خنداں، گہی سرمست وگہ حیراں
گہی صوفی وگہ رندم، اغثنی یا رسول اللہ[۱]

مزید برآں شایق خود کو عاشقوں کا امام بتاتے ہیں کیوں کہ انھیں محبوب حقیقی کے عاشق ہونے کا شرف حاصل ہے ؎

تا فدای الفتِ معشوقِ رحمانی شدم　　　در دو عالم گشتہ ام شایق امامِ عاشقاں[۲]

---

[۱] دیوان شایق: ص　　　[۲] دیوان شایق: ص ۹۳

جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے کہ شایق تصوف سے خاص لگاؤ رکھتے تھے اسی وجہ سے دیوان میں ایسے متعدد شعر نظر آتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مشہور صاحب تصوف ان کے نزدیک نہ صرف محترم تھے بلکہ شایق ان سے تعلق کو اپنے لیے وسیلۂ نجات سمجھتے تھے۔ ایک پوری غزل سید محمد غوث گوالیاری (متوفی: ۱۵۶۲ء/۹۷۰) کی شان میں ہے جس کے دو شعر یہ ہیں:-

خوش نادیش ہوای بہشت بریں گہی یکدم چو سیر کرد کسی گلستان غوث[1]

از ظلمت گناہ، چہ باک است شایقا داغیست بر جبین من از آستان غوث

شاہ جیلان کی تعریف میں بھی بہت سے شعر دیوان میں موجود ہیں، مثلاً:

قال اللہ چہ شان شاہ جیلانست در عالم کہ گردون پیش درگاہش سر خود بر زمین دارد[2]

ربزم گاہ وحدت مسند نشین عزت کس نی چو شاہ جیلان من خوب میشناسم[3]

وحدت الشہود کی تائید میں شایق نے ذیل کے اشعار میں اظہار خیال کیا ہے:-

ہاں یک ذات شد در کثرت کون و مکان مشہود

تو شاہد باش ای زاہد زعرفانی کہ من دارم[4]

ہر چند بی نشانی ای جان خلق لاکن

ظاہر توئی و پنہان، من خوب می شناسم[5]

تراچگونہ دگر دانم از نبان یارب وجود خویش عیان کردہ لشانی چند[6]

[؟] منش ہونے کی وجہ سے شایق نے ایک حد تک دنیوی جھمیلوں سے بچ کر [؟] گزاری ہے۔ اور اپنے تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر ہی وہ دعوی کرتے [؟] دنیا میں شہرت و نام پانا آسان ہے۔ مگر دنیا کو ترک کر دینا اور گوشہ نشینی

---

[1] دیوان شایق: ص ۲۳۔ [2] ایضاً: ص ۳۳۔ [3] ایضاً: ص ۵۶

[4] ایضاً: ص ۶۴۔ [5] ایضاً ص ۵۵ [6] ایضاً: ص ۲۰

کا زندگی گزارنا دشوار ہے۔

سہل باشد شہرۂ آفاق کردہ خویش را!
ہمچو شایق در جہانِ عزلت گزیں مشکل است[1]

شایق ساری پریشانیوں کی وجہ نفس پرستی کو سمجھتے ہیں اور مال ومتاع کے جمع کرنے کو ان کے نزدیک تکلیفوں اور نامرادیوں کو دعوت دینا ہے۔

کثرت زر نقد آفت در بغل دارد نہاں | اجتماع زر کند آخر پریشاں غنچہ را[2]
از خویش برآ و بی نشان شو | آماج بلا است این نشانہ[3]

دنیا میں دکھ سکھ کا ساتھ چولی دامن کا ہے وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ اگر کوئی آج پریشانی سے دوچار ہے تو وہ وقت دور نہیں جب اس کی ہمت اور محنت آسے راحت واطمینان سے ہمکنار کرے گی۔ شایق نے اس کلیہ کو نہایت آسان اور دلنشین انداز میں نظم کیا ہے۔

عیشی بجہاں غیر الم نیست میسر | این گلشن رعنا گل بیخار ندارد[4]

اخلاقی قدروں کی اہمیت پر فارسی کے تقریباً ہر شاعر نے اظہار خیال کیا ہے شایق بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، لیکن ہمارے شاعر کی خوبی یہ ہے کہ وہ آسان، دلنشین اور مدلل طریقے سے اپنے پڑھنے والوں میں ان خیالات کی تبلیغ کرتا ہے۔ سخاوت کے سلسلے میں شایق نے کہا ہے۔

سخاوت پیشۂ خود کن تو انگر تا شوی شایق | کہ چوں گل کیسہ بکشاید بدستش زر شود پیدا[5]

لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنا شایق کی نظر میں بے جا ہے۔

دست خواہش پیش زرداران دراز مکن | ہر چہ خواہی چوں صدف از عالم اعلیٰ طلب[6]
خم شو پیش بزرگاں بہر سیم وزر کہ طفل | شاخ را سازد برای میوہای خام خم[7]

---

[1] دیوان شایق: ص ۱۸۔ [2] ایضاً ص ۶ [3] ایضاً ص ۳ [4] ایضاً ص ۳۵ [5] ایضاً ص ۱۲-۱۳
[6] ایضاً ص ۱۴ [7] ایضاً ص ۵۳۔

اگر اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے دور سے مقابلہ کیا جائے تو شایق کا زمانہ فارسی علم و ادب کے لحاظ سے تنزل کا دور ہے۔ انیسویں صدی کی سیاسی اور اقتصادی زبوں حالی نے بادشاہوں، نوابوں اور جاگیرداروں کو اس قابل ہی نہ چھوڑا تھا کہ وہ اپنے پیشرو بادشاہوں کی طرح عالموں اور شاعروں کی سرپرستی کر سکیں اور ان کی قابلیت اور فضیلت کے شایانِ شان ان کی قدر و منزلت کریں اور مال و دولت سے نوازیں شایق نے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اپنے دور کی تعلیمی بدحالی کی طرف اشارہ کیا ہے:-

خارِ جہل است نوک زن ہر سو　　　من ازیں روزگار می ترسم[۱]
دریں گلشن کہ خارستانِ نافہمیست نشتر زن　　　برنگ غنچہ باید بست لب را از سخن گوئی[۲]

ہر انسان اپنے دور سے متاثر ہوتا ہے اور اپنی تحریروں میں ایسے اشارے ضرور کرتا ہے جس سے اس کے زمانے کے سماجی یا سیاسی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انیسویں صدی میں ہندوستان پر انگریزوں کا اقتدار بہت بڑھ گیا تھا اور یہ لوگ اب ہر جگہ اور ہر معاملہ میں پوری طرح دخیل ہو چکے تھے۔ شایق نے اس تبدیلی کو بڑی خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے:-

چو اکثر با فرنگی ہست اکنوں کار و بار اینجا　　　چرا مشتاق چشمانش نگردد جانِ من شایق[۳]

شایق نے اپنے استاد فایق کی تعریف کی ہے، ان کی شخصیت کو اپنے زمانے میں غنیمت سمجھا ہے اور ان کی شاگردی پر فخر کیا ہے۔

عالی سخن چو حضرتِ فایق ندیدہ شد　　　فیضش ہمیشہ باد، بدوراں غنیمت است[۴]
حضرتِ فایق چو استاد است　　　چوں نہ نازم بہ شعر خود شایق[۵]

شایق کی بیشتر غزلیں رواں، سہل اور شستہ ہیں، انداز بیان نیازدر ہے، عام فہم

---

[۱] دیوان شایق ص ۶۵ [۲] ایضاً ص ۸۶ [۳] ایضاً ص ۹ [۴] ایضاً ص ۱۹ [۵] ایضاً ص ۱۷

تشبیہ واستعاروں نے شایق کی غزلوں کو پرکشش بنا دیا ہے۔ اعظم نے گلزار اعظم میں شایق کے طرزِ سخن کے بارے میں لکھا ہے کہ "شایق ظہوری، طغرا اور بیدل کے پیرو کار تھا۔" اس میں اتنا اور اضافہ ہونا چاہیے کہ شایق صائب سے بھی متاثر ہوئے ہیں جیسا کہ ذیل کے شعر سے پتہ چلتا ہے۔

شایق از صائب شنو وصفِ قدِ دلدار من ‌ ‌ ‌ ‌ ہر چہ میخواہد دلت از عالم بالا طلب[2]

بہر حال مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ شایق کا امتیاز یہ ہے کہ موجودہ مختصر دیوان میں مشکل سے کوئی ایسا شعر نظر سے گزرے گا جو معنویت یا زبان کے لحاظ سے مشکل یا پیچیدہ ہو ورنہ شایق کا طرزِ بیان سادہ اور سہل ہے، اسکے علاوہ شایق نے اپنے دعووں کے ثبوت میں جو مثالیں پیش کی ہیں وہ بہت دلچسپ اور دلکش ہیں، چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کباب از دل، شراب از اشک، سرخم ہست در محفل ‌ ‌ ‌ ‌ مذاق دیگری بخشد اگر آید نگار امشب[3]

صبر سے زمن، از تو کرم، ایں ہم غلط آں ہم غلط ‌ ‌ ‌ ‌ مہر سے ز تو از من ستم، ایں ہم غلط آں ہم غلط[4]

گرچہ شایق بہ بود عزلت نشینی مرد را ‌ ‌ ‌ ‌ گر نباشد آں پری از گوشۂ تنہا چہ حظ[5]

عشق عاشق در دلِ معشوق آخر جا کند ‌ ‌ ‌ ‌ گل گریباں چاک دارد از ولای عندلیب[6]

بہر دیدار آب و تاب رخش ‌ ‌ ‌ ‌ بحر را عینک از حباب شدہ[7]

سیر مژگان و دہان وروی دلبر کردنیست ‌ ‌ ‌ ‌ گل بہ بین و غنچہ بین و نیزہ ہای خار بین[8]

شایق اپنے کلام کے ان محاسن کی وجہ سے اپنے دور کے بہترین فارسی شعرا میں شامل کیے جا سکتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کے مندرجہ ذیل اشعار محض شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت معلوم ہوتے ہیں۔

---

[1] گلزار اعظم: ص ۲۳۴ [2] دیوان شایق: ص ۱۵ [3] ایضاً: ص ۴ [4] ایضاً ص ۵۴ [5] ایضاً: ص ۶۴ [6] ایضاً: ص ۱۵ [7] ایضاً ص ۵ [8] ایضاً ص ۶۶۔

شایق چو بیت ابروی دلدار شعر من
نام خدا که نزد خلایق بلند شد[1]

شود کمال من از شعر من عیاں شایق
برنگ معنی خوش، در کلام مستورم[2]

معارف گل کند از طبع جولانی که من دارم
بہارستان معنیہاست دیوانی کہ من دارم[3]

دیوان میں موجود بیشتر رباعیاں مذہبی قسم کی ہیں۔ مدح رسول، علی، حسن حسین، اور خاتونِ جنت کی منقبت میں رباعیاں ہیں۔ ایک مستزاد ہے جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

مستانہ پیٔ قتل چو آں یار برآمد صد شور و فغاں شد
مردانہ دلم پیش ستمکار برآمد بی نام و نشاں شد

ایک قطعہ بے نقطہ کے الفاظ پر مشتمل ہے جس کا ایک شعر ہے۔

محرم سر درگہ سرمد
مہر علم و امام اہل کمال

زیر بحث دیوان ان اشعار پر ختم ہوتا ہے۔

بدورِ تنگ چشمی ہائے گردوں
بتنگ آمد دلم از تنگ دستی
بسویم کن نگاہی از عنایت
خدارا ای شہ دیوان ہستی

[1] دیوان شایق: ص ۳۶ - [2] ایضاً: ص ۶۰
[3] ایضاً ص ۶۳

تبصرے

مجلات و رسائل

مجلہ علوم الدین مرتبہ مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی تقطیع متوسط ضخامت دو سو صفحات کتابت و طباعت بہتر، قیمت درج نہیں۔ پتہ فیکلٹی آف تھیالوجی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

دوسری یونیورسٹیوں کی طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مختلف فیکلٹیوں کی طرف سے سالانہ یا ششماہی مجلات شائع ہوتے ہیں لیکن اب تک دینیات کی فیکلٹی کا کوئی مجلہ نہیں تھا خوشی کی بات ہے کہ اب اس نے بھی مجلہ شائع کرنا شروع کر دیا ہے اور زیر تبصرہ پرچہ اس کا پہلا نمبر ہے اور اس میں شک نہیں کہ بہمہ وجوہ فیکلٹی کی شایان شان ہے اس نمبر میں لائق مرتب کا مضمون مولانا عبدالحئی فرنگی محلی اور ڈاکٹر مجتبیٰ حسن کامونپوری کا مقالہ "شریف مرتضیٰ علم الہدیٰ" اور ناسخ و منسوخ" از ڈاکٹر قاری محمد رضوان اللہ محققانہ مقالات ہیں جو محنت اور مطالعہ کے بعد لکھے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ تدوین حدیث کی مختصر تاریخ" از قاضی مظہر الدین احمد صاحب بلگرامی (ڈین فیکلٹی) عقل، قلب اور وحی" مولانا محمد تقی امینی "مذاہب عالم اور ان کی رجائی تعلیم" ڈاکٹر سید ارتضا حسین قیام دارالعلوم دیوبند" از ڈاکٹر اقبال حسن خاں، یہ سب مقالات بھی دل چسپ اور لائق مطالعہ ہیں، شروع میں (جس کی انتہا آخر میں ہوئی ہے اور یہ طرز ایک علمی رسالہ کی وضع کے خلاف ہے) ابتداء کے زیر عنوان چند صفحات میں جناب مرتب کے قلم سے ان تبدیلیوں اور فیکلٹی کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو ایک برس میں پیش آتی رہیں مثلاً نظام الدین

محمد سہالوی بانی درس نظامی کے دو اصل خطوط کے عکس اور ان کی تشریح نے مجلہ کی علمی شان کو دوبالا کر دیا ہے۔ بہر حال فیکلٹی اس کامیاب اور شاندار مجلہ کی اشاعت پر لائق مبارکباد ہے۔

دعوت مسلم یونیورسٹی نمبر۔ اخباری سائز، کتابت و طباعت بہتر، ضخامت ۶۸ صفحات قیمت درج نہیں۔ پتہ:۔ روزنامہ دعوت دہلی ۶۔

دعوت مسلمانوں کا بہت مقبول اور نہایت سنجیدہ و متین روزنامہ ہے اس کا سہ روزہ ایڈیشن بلند پایہ فکر انگیز اور حسب ضرورت معلوماتی افزا مقالات و مضامین سے پُر ہوتا ہے اور اسی لیے کثرت سے پڑھا جاتا ہے۔ زیر تبصرہ نمبر جیسا کہ نام سے واضح ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۷۲ء کے خلاف جو ایجی ٹیشن پورے ملک میں چل رہا ہے اور اندیشہ ہے کہ بین الاقوامی نہ بن جائے، یہ نمبر اس ایجی ٹیشن کی تقریب میں شائع کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک دو مقالات میں یونیورسٹی کی ابتدائی تاریخ یعنی سرسید کے محمڈن کالج کی تاسیس اور اس کے مقاصد کا جائزہ لینے کے علاوہ ۱۹۶۵ء (جبکہ یونیورسٹی میں ایک نیا ایکٹ نافذ ہوا تھا) سے لیکر ۱۹۷۲ء کے ایکٹ کے بننے تک یونیورسٹی کے لیے مسلمانوں اور حکومت کی طرف سے جو کچھ بھی ہوا ہے اس سب کی نہایت مفصل اور واضح روداد مرتب کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں ۱۹۲۰ء کا ایکٹ اور پھر ۱۹۷۲ء کا ایکٹ ان دونوں کو تمام و کمال نقل کرنے کے بعد ان کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے اور یونیورسٹی کس کلچر کی نمائندہ رہی ہے، موجودہ ایکٹ کے خلاف ایجی ٹیشن کے کیا وجوہ ہیں؟ ان سب امور پر مختلف مقالات میں خاطر خواہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ غرض کہ یہ نمبر اپنے مقصد میں بے حد کامیاب ہے اور اس کا مطالعہ ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو یونیورسٹی کے معاملات سے دلچسپی رکھتا ہے۔ ضرورت ہے کہ یہ نمبر دو تین اور مقالات کو شامل کر کے مجلد کتابی صورت میں شائع کیا جائے اور انگریزی اور ہندی میں اس کا ترجمہ بھی چھاپا جائے۔

ندائے ملت جائزہ نمبر، تقطیع، اخباری سائز، ضخامت ۱۰۸ صفحات کتابت طباعت بہتر، قیمت دو روپے۔ پتہ:۔ ندائے ملت دیکلی لکھنؤ۔

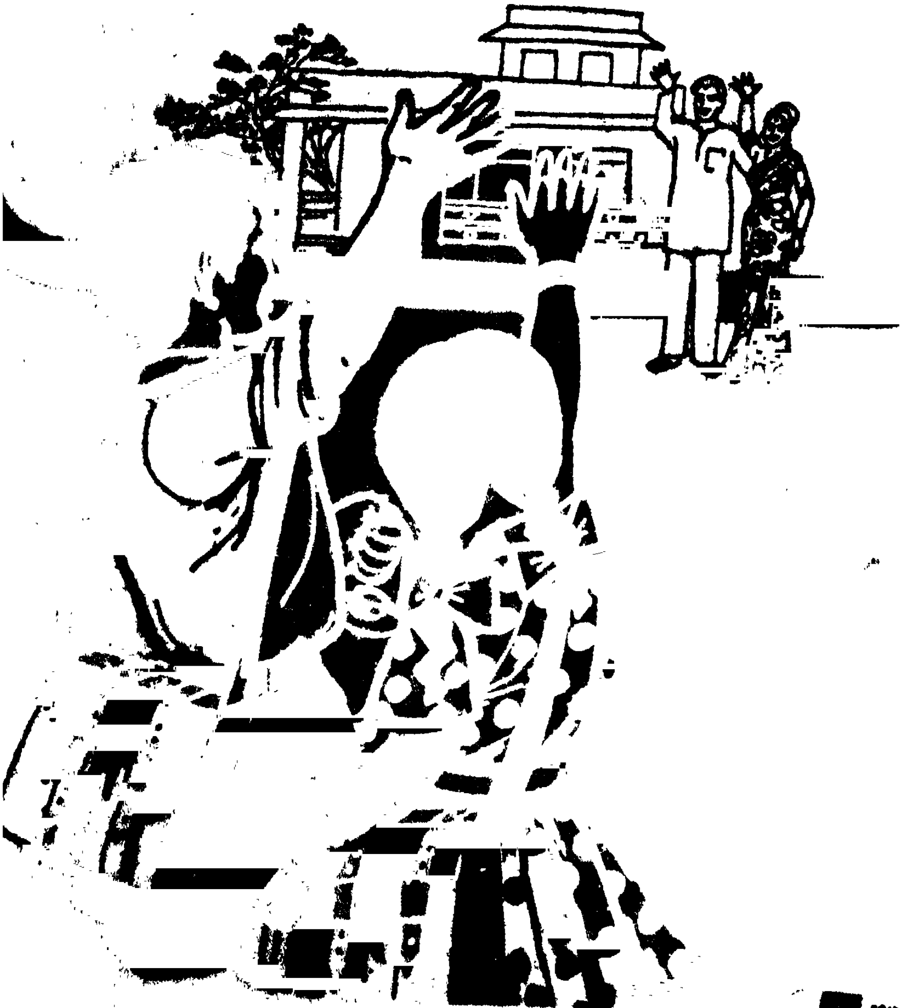
ندائے ملت ملکی و وطنی معاملات و مسائل میں مسلمانوں کے احساسات و جذبات اور ان کی مشکلات کا بے باک ترجمان ہے اور اس حیثیت سے مسلمانوں میں وقعت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، آزادی کی پچیس سالہ جوبلی کی تقریب سے اس نے یہ خاص نمبر اس غرض سے شائع کیا ہے کہ گزشتہ ربع صدی میں جو کچھ ہوا ہے مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ لیا جائے۔ موجودہ زمانہ میں جبکہ قومیں بجلی کا پاؤں لگا کر ترقی کے میدان میں دوڑ رہی ہیں ایک آزاد و خود مختار اور حوصلہ مند قوم کے لیے پچیس برس کی مدت کم نہیں ہوتی اور پھر ہندوستان تو ایک بہت بڑا اور وسیع تر ملک ہے۔ اس کے ذرائع پیداوار لا محدود ہیں اور اس کی آبادی دنیا کی ۱/۶ ہے اگر ہندوستان کو صحیح لیڈر شپ ملی ہوتی تو وہ اس مدت میں کیا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ چین، جاپان اور مغربی جرمنی ہمارے سامنے کی بات ہیں۔ جائزہ میں نفع اور نقصان دونوں دکھائے جاتے ہیں تب جائزہ مکمل ہوتا ہے۔ اس بنا پہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے یہ جائزہ مکمل اس وقت ہوتا ہے جب کہ الگ الگ عنوان مقرر کیے جاتے، مثلاً صنعت و حرفت، فلاحت و زراعت قومی آمدنی، تعلیم، امن اور قانون، سیاست، سماجی فلاح و بہبود، اور زبان اور ان سب سے ہر عنوان کے ماتحت اعداد و شمار کی روشنی میں یہ دکھایا جاتا کہ اس میں ملک نے شروع سے اب تک کیا ترقی کی ہے اور اس ترقی میں مسلمانوں کا اثبات اور نفی کے اعتبار سے کیا اور کتنا حصہ ہے۔ اگر جائزہ اس طرح لیا جاتا تو بے شبہ وہ ایک عظیم کارنامہ ہوتا، اس سے مسلمانوں کو بھی فائدہ ہوتا اور حکومت اور اکثریت کو بھی۔ آج جبکہ ہر چیز کا ریکارڈ موجود ہے

اس پر کتابیں اور سرکاری و غیر سرکاری رپورٹیں موجود ہیں اس نوع کا جائزہ لینا چنداں مشکل نہیں ہے البتہ اس کے لیے ضرورت ہے صرف زر کثیر کی، محنت اور استقلال سے تحقیق و تفتیش کرنے کی اور یہ ایک شخص کا نہیں بلکہ پورے ادارہ کا کام ہے۔ لیکن جو قوم بے حس بے خبر اور اپنے انجام سے غافل ہو اور اس بنا پر اس کے اخبارات و رسائل عسرت و افلاس کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں اور اس کے کسی جریدہ سے اس کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ ان دشواریوں کے باوجود ندائے ملت کا یہ خاص نمبر لبا غنیمت ہے۔ اس میں مقالات کے دو حصے ہیں ایک حصے میں مسلمانوں کے ان کارناموں کو بیان کیا گیا ہے جو انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں انگریزوں کے عمل دخل کے خلاف، اور پھر ۱۸۵۷ء میں اور اس کے بعد سے ۱۹۴۷ء میں حصول آزادی تک انجام دیئے ہیں۔ اس حصہ میں مولانا ابوالحسن علی کا مقالہ خاصہ کی چیز ہے۔ دوسرے حصہ میں جو نسبتاً طویل اور مفصل ہے اور جو سترہ مقالات پر مشتمل ہے، دستور اور آئین جمہوریت پر گفتگو کرنے کے بعد ان آلام و شکایات کا تذکرہ ہے، جو مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً پیش آتے رہے ہیں اور جو خود آئین کے خلاف ہیں ان مضامین کو پڑھکر مایوسی اور دل گرفتگی کی جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کے لیے تعمیر نشیمن کے زیر عنوان چند مقالات ہیں جن میں حکومت اور مسلمان دونوں کو تعمیری مشورہ دیئے گئے ہیں، ان سنجیدہ مضامین کے علاوہ زیب داستان کی غرض سے کچھ طنزیہ مضامین اور نظمیں بھی ہیں غرض کہ اس میں شبہ نہیں کہ یہ خاص نمبر بڑی محنت، توجہ اور لگن سے مرتب کیا گیا ہے اور مضامین کے تنوع افادیت اور جامعیت کے باعث اس کا مستحق ہے کہ ہر صاحب ذوق مسلمان بلکہ حکومت اور اکثریت کے حق پسند افراد بھی اس کا مطالعہ کریں جو مضامین دیر میں وصول ہونے کے باعث اس اشاعت میں شریک نہیں ہو سکے ہیں، بہتر ہے کہ ان کو اس جائزہ نمبر کا حصہ دوم بنا کر شائع کیا جائے اور پھر ان سب مضامین کو اشتہارات سے الگ کر کے کتابی صورت میں چھاپ دیا جائے

اس طرح ان مضامین کی افادیت کچھ اور مستقل ہو جائے گی۔

بھارت کی طاقت زیادہ آبادی میں نہیں
بلکہ صحت منداور زیادہ تعلیم یافتہ شہریوں میں ہے

چھوٹے کنبہ کا مطلب ہے
صحت مند بچے
ہر ایک کے لئے زیادہ خوشحالی
اچھی تعلیم کے بہتر مواقع



مکمل لغات القرآن

(چھ جلدوں میں)

قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اس کے معانی و مطالب کے حل کرنے اور سمجھنے کے لئے اردو میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اس عظیم الشان کتاب میں الفاظ قرآن کی مکمل اور دلپذیر تشریح کے ساتھ تمام متعلقہ بحثوں کی تفصیل بھی ہے۔ ایک مدرس اس کتاب کو پڑھ کر قرآن مجید کا درس دے سکتا ہے اور ایک عام اردو خواں اس کے مطالعہ سے نہ صرف قرآن شریف کا ترجمہ بہت اچھی طرح کر سکتا ہے بلکہ اس کے مضامین کو بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے اور اہل علم و تحقیق کے لئے اس کے علمی مباحث لائق مطالعہ ہیں۔ "لغات قرآن" کے ساتھ الفاظ قرآن کی مکمل اور آسان فہرست بھی دی گئی ہے جس سے ایک لفظ کو دیکھ کر تمام لفظوں کے حوالے بڑی سہولت سے نکالے جا سکتے ہیں۔ "مکمل لغات قرآن" اپنے انداز کی لاجواب کتاب ہے جس کے بعد اس موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

جلد اول	صفحات	۳۳۴	بڑی تقطیع	غیر مجلد	پانچ روپے	مجلد	چھ روپے
جلد دوم	〃	۳۳۶	〃	〃	پانچ روپے	〃	چھ روپے
جلد سوم	〃	۳۳۲	〃	〃	پانچ روپے	〃	چھ روپے
جلد چہارم	〃	۳۸۶	〃	〃	چھ روپے	〃	سات روپے
جلد پنجم	〃	۵۰۰	〃	〃	آٹھ روپے	〃	نو روپے
جلد ششم	〃	۳۲۴	〃	〃	پانچ روپے	〃	چھ روپے

(پوری کتاب کے مجموعی صفحات ۲۲۱۲)

مکتبہ برہان۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

ندوۃ المصنفین دہلی

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر [illegible] سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبر آبادی

برہان دہلی

| جلد ۶۹ | رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۲ء | شمارہ ۴ |

۱۔ نظرات — سعید احمد اکبر آبادی — ۲۱۸

مقالات:

۲۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی — " " — ۲۲۲

۳۔ رسول شاہد و مشہود — جناب قاری بشیر الدین صاحب (پنڈت) ایم۔ اے نیشنل ایوارڈی۔ شاہجہاں پور — ۲۲۹

۴۔ اسلامی شریعت میں چند زوجگی کی اباحت۔ تنقید و جواب "مضرت و منفعت؟" — جناب مولانا محمد برہان الدین سنبھلی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ — ۲۵۵

۵۔ مرزا غالب اور مدرسہ کار کمپنی — جناب پروفیسر ابو محفوظ الکریم معصومی مدرسہ عالیہ کلکتہ۔ — ۲۷۲

نظرات

مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے : اگر میرے اختیار میں ہو تو دارالعلوم دیوبند سے فراغت کی سند حاصل کرنے کے لئے یہ شرط بھی لگا دوں کہ فارغ التحصیل کم از کم چھ مہینے کے لئے یورپ میں گھوم آیا ہو" اس سے مولانا کا مقصد یہ تھا کہ ایک عالم دین کو ارشاد و ہدایت کا جو فرض انجام دینا چاہیئے، موجودہ زمانہ میں کوئی عالم یہ فرض کما حقہ اس وقت تک ادا نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں گھوم پھر کر انسانی معاشرہ میں جو عظیم انقلاب ہوا اور اس کی وجہ سے جو نئے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ ان سب کا جائزہ بصارت اور بصیرت کے ساتھ نہ لے، دراصل یہی وہ ضرورت ہے جس کی وجہ سے درمختار میں قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے :-

من لم یکن عالما باحوال زمانہ لم یجز له الفتیا۔ جو شخص اپنے زمانہ کے احوال سے واقف نہ ہو اس کے لئے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔

ترقی یافتہ ممالک میں جا کر مزید برآں یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اکثریت میں ہو یا اقلیت میں، کس طرح اپنی تعمیر کرتی ہے، وہاں کس طرح ہر شخص بولتا کم اور کام زیادہ کرتا ہے۔ محنت اس طرح کرتا ہے کہ کام کے اوقات کا ایک منٹ ضائع نہیں کرتا۔ اپنا فرض منصبی ادا کرنے میں سستی، کاہلی، بے ایمانی اور بددیانتی کو دخل نہیں دیتا۔ پھر کام چھوٹا ہو یا بڑا اسے کسی کام میں عار نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ ان ممالک میں انسانی فلاح و بہبود، اپنی قومی روایات، علم و ادب، صنعت و حرفت اور مذہب و تعلیم ان سب کی ترقی کے لئے کیسی اعلیٰ سے اعلیٰ تنظیمات اور ادارے ہیں جو بڑے خلوص اور شفقت کے

ساتھ اپنے کاموں میں مشغول ہیں اور ان کی وجہ سے قومیں ترقی کی راہ پر آگے ہی بڑھتی جارہی ہیں۔

ابھی چند مہینے ہوتے ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی جو معاشیات میں ڈاکٹر اور اس کے نامور استاد ہونے کے باوصف نہایت راسخ العقیدہ اور پُر ولولہ و جوش مسلمان بھی ہیں، وہاں مسلمان طلبا کی انجمن کی دعوت پر اسلام پر مختلف مراکز میں لکچر دینے کی غرض سے امریکہ گئے ہیں اور یہ ان کا عمر میں پہلا غیر ملکی سفر ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے اب تک انھوں نے جو لکچر دیئے ہیں وہ بڑے کامیاب رہے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں شکاگو سے ان کا ایک خط آیا ہے جس میں تحریر فرماتے ہیں: ہندوستان میں گذشتہ پچیس برس میں ہم نے (مسلمانوں نے) احتجاج کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن یہاں کے مسلمان مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ اس مدت میں ہم نے کوئی تعمیری (Constructive) اور مثبت کام بھی کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو وہ کیا ہے! یہ سن کر سخت شرمندگی ہوتی ہے، آپ ازراہِ کرم اس پر توجہ کیجئے۔ راقم الحروف نے اس کے جواب میں لکھا ہے: آپ نے یہ وہی بات لکھی ہے جس کو میں شروع سے کہتا اور لکھتا چلا آرہا ہوں، لیکن افسوس! یہاں کے مسلمانوں میں اجتماعی اور قومی سطح پر حیثیت اور تعمیری کام کرنیکا کوئی جذبہ ہی نہیں ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لیڈر شپ بالکل نکمی اور ناکارہ ہے، اس کے پاس نہ دل ہے نہ دماغ۔ ہواؤں پر اڑتی اور جلسوں جلوسوں پر جیتی ہے۔ اب آپ امریکہ سے واپس آجائیے تو ہم دونوں مل کر مسلمانوں کے لئے ایک ہمہ جہتی تعمیری منصوبہ (حکومتوں کے پنجسالہ منصوبوں کے طرز پر) بنائیں گے۔

ہمارے جو لیڈر آئے دن مسلمانوں کی بے روزگاری، تعلیمی پسماندگی، اردو کی حق تلفی، اور مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کا رونا روتے رہتے اور پبلک میں شور مچاتے رہتے ہیں ان کو بتانا چاہیئے کہ انھوں نے اب تک ان مسائل کے حل کے لئے کونسا تعمیری کام کیا ہے؟ مسلمانوں

کی بے روزگاری کا علاج کرنے کے لیے مسلمانوں کے کتنے نئے کارخانے، فیکٹریاں اور صنعتی ادارے قائم کرائے، تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کی غرض سے کتنے اسکول اور کالج بنائے، ذہین اور غریب طلبا کے لیے کتنے وظائف کا بندوبست کیا، ان کے لیے کتنے پالی ٹیکنک، کتنے انجینئرنگ اور میڈیکل کالج کھولے، کتنی کوآپریٹو سوسائٹیاں قائم کیں، اردو اخبارات و رسالات کی حوصلہ افزائی اور جگہ جگہ پرائمری اسٹینڈرڈ کے دینی مکاتب اور اردو کی نشر و اشاعت کے اداروں کی ترقی کے سلسلے میں کیا کیا کوششیں بروئے کار آئیں! حکومت کی ناانصافی اور دھاندلی مسلّم، لیکن جمہوریت میں حکومت کی کسی بھی پالیسی یا اس کے کسی بھی کام کو موثر طریقہ پر اس وقت تک چیلنج نہیں کیا جاسکتا جب تک رائے عامہ کو چیلنج کی ہمنوائی پر آمادہ نہ کر دیا گیا ہو! اب سوال یہ ہے کہ ہمارے زعمائے ملّت نے اس راہ میں کیا کچھ کیا اور کر کے دکھایا ہے ہندوستان ایسے عظیم ملک میں جہاں ہر فرقہ و ملت کے لوگ کثرت سے آباد ہیں، اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ فرقہ وارانہ سیاست کی بنیاد پر کسی ایک فرقہ وارانہ مسئلہ کا کل ہند حل نکل سکتا ہے تو اس کی عقل کا ماتم کرنا چاہیئے۔

مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند نے جو اہم اقدام کیا ہے اور جس کا تذکرہ اخبارات میں وقتاً فوقتاً آتا رہا ہے، یہ تو خدا ہی کو معلوم ہے کہ جہاں تک حکومت پر اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت اور اس کے خاطر خواہ عواقب و نتائج کا تعلق ہے اس اقدام کا نتیجہ کیا ہوگا، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دارالعلوم کا یہ اقدام بالکل بر وقت، برمحل اور اس کی روایات کے شایانِ شان ہے۔ اس سلسلہ میں دارالعلوم کی مقرر کردہ کمیٹی کی طرف سے ایک طویل مگر جامع سوالنامہ مستند علمائے کرام کی خدمت میں ارسال کیا گیا تھا۔ اس سوالنامہ کے جو جوابات موصول ہوئے تھے، پچھلے دنوں ان پر غور و خوض اور بحث و گفتگو کرنے کی غرض سے دارالعلوم دیوبند میں تیاری کمیٹی کا ایک جلسہ دو تین نشستوں میں منعقد ہوا اور اس میں یہ موصولہ جوابات پڑھ کر

سنائے گئے۔ راقم الحروف بھی اس جلسہ میں شریک تھا اور اسے یہ کہنے میں بڑی مسرت ہے کہ جوابات عموماً بڑے مدلل مفصل، واضح اور صاف تھے، جو فقہ اور اصول فقہ کی کتابوں کو کھنگال کر مرتب کئے گئے تھے۔ ان جوابات میں قیمتی مواد کے علاوہ منطقی اور فقیہانہ استدلال بھی تھا اور وقت کے تقاضوں سے باخبر ہونے کا ہوشمندانہ ثبوت بھی! جوابات اکثر و بیشتر بلکہ غالباً سب ہی نوجوان علما کے لکھے اور مرتب کیے ہوئے تھے۔ یہ اور بھی مسرت انگیز بات ہے، بہرحال اس سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند کی سعی کا کوئی اور نتیجہ نہ بھی نکلا، تو بھی یہ کچھ کم اہم بات نہیں ہے کہ اس تقریب سے اس مسلم پرسنل لا کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں پر فقہی تصریحات و بیانات کا ایسا عمدہ ذخیرہ مہیا کر دیا ہے جو اگر شائع ہو گیا تو یہ بجائے خود دارالعلوم کا ایک عظیم کارنامہ اور علما کی طرف سے اتمام حجت کا باعث ہوگا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر خلافتِ راشدہ کی کوئی اسلامی حکومت قائم ہو تو درحقیقت کوئی بھی سماجی اور معاشی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا حل آسانی کے ساتھ ممکن نہ ہو۔ لیکن موجودہ حالات میں جب کہ غیر مسلم حکومتوں کا کیا ذکر، خود مسلم حکومتوں میں کوئی ایک حکومت بھی صحیح معنی میں اسلامی حکومت نہیں ہے، علما کو سب سے زیادہ توجہ اس بات پر کرنی چاہیے کہ معاشرہ میں فساد اور حالات میں تبدیلی کے باعث احکام میں جو تغیر و تبدل ضروری ہوتا ہے اس کی تنفیذ کی کیا صورت ہو سکتی ہے! کیا یہ اختیار حکومت کو دیا جا سکتا ہے اور اس سے کہہ کر کوئی قانون ایسا بنوایا جا سکتا ہے جس کے ذریعہ مسلمان اپنی سماجی زندگی میں عام طور پر مروج غیر اسلامی اور خلاف شرع رسوم و عوائد سے محفوظ رہ سکیں۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو اختیار دینے کا یہ جواز مطلق ہے یا مقید، یعنی بعض امور کی نسبت یہ اختیار دیا جا سکتا ہے اور بعض کے متعلق نہیں، اگر مقید ہے تو ان امور و معاملات کی تنقیح ہونی چاہیئے اور وجہ بتانی چاہیے کہ کیوں بعض امور کا اختیار دیا جا سکتا ہے اور کیوں بعض اور امور کا نہیں دیا جا سکتا، درانحالیکہ فساد کا سبب ہونے میں سب یکساں ہیں، اور اگر حکومت کو کوئی اختیار دیا ہی نہیں جا سکتا تو پھر مسلمانوں کو معاملات میں خلاف شرع طور طریقوں سے محفوظ رکھنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ مسلم پرسنل لا کی بحث کے سلسلے میں ہمارے نزدیک سب سے اہم موضوع گفتگو یہی ہونا چاہیے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۴)
اسلامیانِ ہند کا ایک تہذیبی ورثہ

سرسید اور اسلامی تعلیم وتہذیب : ۔ سرسید نے بار بار، پُر زور الفاظ میں کہا اور لکھا تھا کہ ان کے کالج سے ایسے نوجوان پیدا ہوں گے جن کے داہنے ہاتھ میں (ایک اور جگہ) یا ان کے سر پر قرآن مجید ہوگا ..... تو اب دیکھنا چاہیے کہ سرسید نے اس اہم مقصد کے لیے کیا کیا اور اس کے لیے کیا انتظامات کیے؟ اس ایک سوال کے دو جز ہیں : (الف) دینیات کی تعلیم اور (ب) اسلامی تہذیب و کردار ۔ اب ہم ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ گفتگو کریں گے تاکہ اس موضوع پر گفتگو زیادہ واضح ہو سکے ۔

دینیات کی تعلیم : ۔ سرسید نے داہنے ہاتھ میں یا سر پر قرآن مجید کی جو بات کہی تھی پوری سچائی، عزم راسخ اور جذبۂ کامل سے کہی تھی ۔ اس میں اشک شوئی یا محض تصنع کا (جیسا کہ سرسید کے ناقد کہتے ہیں) ہرگز کوئی دخل نہیں تھا ۔ ان کو دل سے اس بات کا یقین تھا کہ مسلمانوں کو بہر حال عمل اور کردار کے اعتبار سے پکا اور سچا مسلمان بننا ہے کیونکہ دنیا میں اس قوم کا کوئی وجود نہیں ہوتا جس کی اپنی کوئی تہذیب نہیں ہوتی اور مسلمانوں کی تہذیب کا تار و پود جو کچھ ہے وہ ان کے مذہب کی بنا اور اعتبار سے ہے ۔ اس بنا پر اگر مسلمان مذہب سے الگ ہو گئے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کا قومی اصل وجود [illegible] یہ بے شبہ سرسید مسلمانوں کو [illegible] اور [illegible] زمانہ کے تقاضوں کے مطابق [illegible] یافتہ اور [illegible] قوم بنانا چاہتے تھے، لیکن ان کو یقین تھا کہ اسلام [illegible]

[illegible] ہے اور اس کی اصل اور بنیادی تعلیمات نہ صرف اجازت دیتی ہیں۔ بلکہ حکم دیتی ہیں کہ ہر زمانہ میں دنیا کی جو اعلیٰ تہذیب ہو اس کی اچھی اور مفید باتوں کو اختیار کر کے اسلام کے اصول اور اس کی بنیادی تہذیبی و تمدنی تعلیمات کو ان کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ بنایا جائے کہ ان دونوں کے امتزاج سے تہذیب کا جو خاکہ تیار ہو وہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی منفرد تہذیب ہو۔ صحرائے عرب سے نکلنے کے بعد جب مسلمانوں نے دنیا میں پھیلنا شروع کیا اور اس راہ میں ان کو اس عہد کی نئی نئی قوموں اور ان کی تہذیبوں سے واسطہ پڑا تو ان کا عمل ہمیشہ خذ ما صفا ودع ما کدر پر رہا ہے، اسی کو ہم دوسرے لفظوں میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں نے فاتح ہونے کے باوجود مفتوح اقوام کی تہذیبوں کا قلع قمع نہیں کیا۔ بلکہ ان کی تہذیب کے صالح عناصر و اجزا کو اختیار کر کے ان کی اسلامی اصولِ معاشرت و اخلاق کے ساتھ ایسی پیوند کاری کی کہ قالب تو بدل گیا مگر روح سرتاسر اسلامی رہی۔ اسلام کی تعلیمات کے ماتحت زندگی سے متعلق مسلمانوں کا بھی وہ نقطۂ نظر ہے جو تاریخ کے ہر دور میں اور تہذیبِ انسانی کے عروج و ارتقا کے ہر مرحلہ میں مسلمانوں کے قومی وجود کے استحکام اور اس کے نشو و نما کا ضامن رہا ہے۔ سرسید کے علم و یقین میں مسلمانوں کو پہلے واسطہ اپنی مفتوح اقوام کی تہذیب اور ان کے تمدن سے پڑتا تھا۔ لیکن آج خدا کی مرضی! ان کا واسطہ اس قوم کی تہذیب سے ہے جو مسلمانوں کی محکوم نہیں۔ بلکہ حاکم ہے، اور جو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پورے مشرق و مغرب میں اپنے علوم و فنون اور اپنی تہذیب کی طاقت و قوت کے سہارے پھیلتی اور غالب ہوتی جا رہی ہے۔ اس بنا پر مسلمانوں کی جو روش ماضی میں دوسری تہذیبوں کے ساتھ رہی ہے وہی اب مغربی تہذیب کے ساتھ بھی ہونی چاہیے، ورنہ تہذیبِ جدید کے اس کمال و علم کے زمانہ میں مسلمانوں کا رویہ اگر منفی رہا اور عہدِ جدید کے تقاضوں پر [illegible] عہدِ گذشتہ کی ایک حسرت ....

انگریز یا انگار ہو کر رہ جائیں گے۔ یہی وہ فکر و خیال تھا جس کے باعث سرسید جہاں مسلمانوں کے لئے اعلیٰ ماڈرن تعلیم اور مغربی تہذیب کے صالح اور مفید عناصر کو اختیار کرنا ضروری سمجھتے تھے مذہبی تعلیم اور اسلامی تہذیب اخلاق کے مطابق زندگی بسر کرنے کو بھی ان کے لئے ضروری اور لازمی قرار دیتے تھے۔ مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کی اس پیوند کاری پر سرسید کے مخالفوں نے انھیں اور علی گڑھ کالج کو کیا کچھ نہیں کہا۔ لیکن مجھے آج تک کسی ایسے مسلمان کا نام معلوم نہیں ہوا جو علی گڑھ میں تعلیم پانے کے باعث عیسائی بن گیا ہو۔ حالانکہ عیسائی مشن نے اپنا ایک بڑا ادارہ وہاں بھی قائم کر رکھا تھا۔

بہرحال اس اہم اور عظیم مقصد کے پیشِ نظر سرسید نے جو نصابِ تعلیم بنایا اس میں دینیات کی تعلیم کو ہر ایک مسلمان طالبِ علم کے لئے ضروری اور لازمی قرار دیا۔ اس معاملہ میں سرسید کی نیک نیتی اور ان کے خلوص کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ چونکہ اپنے مذہبی خیالات و افکار (جن میں سے بعض ہمارے نزدیک صحیح ہیں اور بعض غلط) کے باعث وہ مسلمانوں میں عام طور پر بدنام تھے اس بنا پر دینیات کی تعلیم اور اس کے نصاب وغیرہ پر غور کرنے کی غرض سے انھوں نے شیعہ و سنی دینیات کیلئے الگ الگ جو دو کمیٹیاں بنائی تھیں اپنے آپ کو ان دونوں سے الگ رکھا اور کسی ایک کمیٹی کے معمولی ممبر بھی نہیں بنے۔ علاوہ ازیں انھوں نے اپنی مذہبی کتابوں اور رسالوں میں سے کسی ایک کتاب یا رسالے کو کلاً یا جزواً نہ شریک نصاب بنانے کی خواہش کی اور نہ طلبا کو ان کے مطالعہ کی ترغیب دی۔ دینیات کے معاملہ میں سرسید کے اس خلوص اور ان کے جذبۂ صادق کے باوجود نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ دینیات کی تعلیم سرسید کے زمانہ میں اور ان کے بعد کالج کے یونیورسٹی بن جانے کے عہد میں بھی کبھی کالج یا یونیورسٹی کے شایانِ شان اور خاطر خواہ نہیں ہو سکی۔ اور اس سے وہ توقعات بالکل پوری نہ ہوئیں جو سرسید کے نہاں خانۂ قلب و دماغ میں موجزن تھیں۔ اس کا سبب

گیا تھا۔ مولانا حالی فرماتے ہیں :

"مذہبی تعلیم و تربیت بھی اس کالج کے خصوصیات میں سے ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ بات جیسی کہ ایک محمڈن کالج میں ہونی چاہیے ابھی تک اس درجہ پر نہیں پہونچی لیکن اس کا الزام سرسید یا کالج کے منتظموں پر عائد نہیں ہوتا۔ اول تو دو مذہبی کمیٹیاں جو شیعہ اور سنی دونوں کی مذہبی تعلیم کی نگرانی اور انتظام کے لیے جدا جدا مقرر ہوئی ہیں اور جن سے سرسید نے لوگوں کی بدگمانی کے خیال سے خود علیحدگی اختیار کی تھی، انھوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ دوسرے دنیوی تعلیم کے کورس جو یونیورسٹی وقتاً فوقتاً مقرر کرتی ہے وہ اس قدر مشکل اور طویل الذیل ہوتے ہیں کہ ان کے پورا کرنے میں طلبا کو دوسری طرف متوجہ ہونیکا بہت ہی کم موقع ملتا ہے" (حیاتِ جاوید حصہ دوم ص ۸۲)۔

لیکن ہمارے نزدیک اس کے بنیادی سبب دو ہیں :-

(۱) ایک یہ کہ سرسید نے، جیساکہ اصولاً ہونا چاہیے تھا۔ دینیات کی تعلیم اور اس کے بندوبست کا سارا کام علما کے سپرد کر دیا تھا۔ اس زمانہ میں مولانا محمد قاسم النانوتوی سے بڑھ کر مستند اور بلند پایہ عالم اور کون ہو سکتا تھا اور مولانا اور سرسید میں جو مخالفت تھی وہ بھی سب کو معلوم ہے، لیکن اس کے باوجود سرسید نے دینیات کی تعلیم اور اس کی نگرانی کا سارا کام مولانا کے سپرد کرنا چاہا۔ اس مقصد کے لئے سرسید نے مولانا سے درخواست کی اور مولانا کی شرط کے مطابق سرسید اس کمیٹی سے الگ بھی رہے، لیکن اس کے باوجود سرسید مولانا کا تعاون حاصل نہ کرسکے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید کے منشا کے مطابق یہ کام علما کے کرنیکا تھا لیکن اس موقع پر انہوں نے وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنی فرض شناسی کا ثبوت نہیں دیا۔ عالم اسلام کی بدقسمتی! علما جو ہوا میں گرہ باندھ سکتے اور دور کی کوڑی لانے میں مشق و مہارت رکھتے ہیں وقت پر ہوا کا رُخ پہچاننے میں ناکام رہ جاتے ہیں۔

... وہ دور ... سب ... علمائے ... تھے ... [illegible]

تھے وہ پڑھے استعداد ضرور رکھتے تھے لیکن یہ روشن خیال علما نہیں تھے ... [illegible]

دینیات اور خود اسلام کا تصور محدود تھا۔ انھوں نے اسلام کا [illegible]

یا جمال الدین افغانی کے نقطۂ نظر سے نہیں کیا تھا۔ ان کے نزدیک اسلام کا ماحصل بجز اس کے کچھ اور نہ تھا کہ "خاتمہ بالخیر" ہو اور آخرت میں جنت نصیب ہو جائے۔ اسلام کس طرح ایک عالمگیر اور اجتماعی مذہب ہے؟ وہ کس طرح ہر لحظہ نمو پذیر معاشرۂ انسانی کی جملہ ضروریات کی علیٰ وجہ الکمال والتمام تکمیل کا ضامن ہے؟ مغربی تہذیب اور مغربی علوم و فنون نے کس طرح ایک جدید علم کلام کی ضرورت پیدا کی ہے اور وہ ضرورت کیونکر پوری کی جا سکتی ہے؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے سوالات سے ان حضرات کا ذہن بالکل خالی تھا۔ اس بنا پر یہاں دینیات کے لئے جو نصاب تیار کیا گیا وہ وضو اور نجاست اور نماز روزہ وغیرہ کے مسائل تک محدود رہا اور اس لئے یونیورسٹی کے ایک وقیع مضمون کی حیثیت سے اس کو کوئی وقعت حاصل نہ ہو سکی۔

یہ حال تو تھا دینیات کے نصابِ تعلیم کا! اب ذرا اس کے اہتمام اور اس کی نگرانی کا ماجرا بھی سُن لیجئے۔ علی گڑھ کے ایک قدیم پوسٹ گریجویٹ حمید الدین خاں صاحب اپنے عہد کے شعبۂ دینیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولانا عبد اللہ انصاری بڑے نیک خصلت بزرگ تھے اور طلبا سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے بعض لوگ دینیات کی کلاسوں میں کم ہی حاضر ہوتے تھے اور عموماً کوئی نہ کوئی دوست غیر حاضروں کی طرف سے "حاضر جناب" کسی گوشہ سے پکار دیتا تھا۔ دینیات کے امتحان میں بعض کمزور طلبا کاپی میں خوش خط جلی قلم سے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" "امور ماخوذ از لیکچرہائے جناب مولانا ابو محمد عبد اللہ انصاری" وغیرہ جیسے الفاظ لکھ کر نہایت عاجزانہ انداز

سوالوں کے جوابات میں جو غلطیاں کی ہوں ان کو اپنی رحمت سے بخشدے. مولانا مرحوم ایسی تحریریں پڑھ کر معاف بھی کر دیتے تھے اور فرماتے : سبحان اللہ کیسا دیندار لڑکا ہے۔ (مجلۃ علوم الدین جلد ا نمبر ا ص ۱۴) .

پس جب دینیات سے متعلق خود وہاں کے ذمہ دار علماء اور اساتذہ کی سہل انگاری اور بے اعتنائی کا یہ عالم ہو تو اربابِ انتظام اور دوسرے حضرات سے کیا توقع ہو سکتی تھی کہ وہ اس شعبہ کا بھی خاطر خواہ انتظام اور بندوبست کرتے، چنانچہ آج بھی جب کہ سائنس، انجنیئرنگ اور کامرس کا ذکر نہیں ! آرٹس اور سوشل سائنس کے بعض بعض شعبوں میں دو دو اور تین تین پروفیسر ہیں اور یونیورسٹی کا بجٹ ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے دنیات کی فیکلٹی سنی اور شیعہ دینیات میں ایک ریڈر اور چند لکچرروں کے سہارے چل رہی ہے۔

اسلامی تہذیب :۔ بہر حال سرسید نے داہنے ہاتھ میں قرآن کی جو بات کہی تھی، علماء کی کوتاہی اور بے بصیرتی کے باعث اس میں تو کامیابی حاصل نہ ہو سکی، لیکن اس کا دوسرا جزء تھا اسلامی تہذیب ! یہ خود سرسید کے اپنے بس کی بات تھی، چنانچہ انہوں نے اس کو بڑی قوت اور عزم کے ساتھ قائم کیا اور جس طرح کیمبرج اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیاں عیسائی تہذیب و تمدن کی، اور پھر امریکہ اور کناڈا اور یورپ میں بعض یونیورسٹیاں کیتھولک چرچ اور بعض یونیورسٹیاں پروٹسٹنٹ چرچ کی نمائندہ ہیں بنارس ہندو یونیورسٹی ہندو کلچر کی اور شانتی نکیتن ڈاکٹر ٹیگور کے تہذیبی تصور کی ترجمان ہیں۔ اسی طرح علی گڈھ کالج (جو بعد میں یونیورسٹی بنا) اسلامی کلچر اور اسلامی ثقافت و تہذیب کا ایک مرکز بن گیا۔

کسی ادارہ کے تہذیبی مرکز ہونیکا مطلب :۔ لیکن اس موقع پر یہ حقیقت ذہن

یقین کرینی چاہیے کہ کسی ادارہ کے تہذیبی مرکز ہونیکا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوگا اس ادارہ
کے تمام افراد عبادات اور جملہ رسوم و معاملات میں یکساں ہوتے ہیں، عبادات کا معاملہ
بندہ اور خدا کے درمیان ہوتا ہے اس لئے وہ انفرادی اعمال و افعال ہیں اور تہذیب
کا تعلق اجتماعیت کے ساتھ ہے، اس بنا پر کسی ادارہ کے تہذیبی مرکز ہونے کا مطلب
ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں سب افراد اپنی تہذیب کے اقدارِ عالیہ سے وابستہ ہیں
اور وہ اس کا احترام و ادب ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کے اخلاق، عادات، ان کا اپنوں
اور غیروں کے ساتھ برتاؤ اور ان کی معاشرتی زندگی، ان کے فکر کا اسلوب ان کی رفتار
اور گفتار یہ سب ان کی تہذیبی اقدار کا ترجمان ہوتے ہیں، عبادات کے معاملہ میں وہ
باہم گر کیسے ہی مختلف ہوں، لیکن اجتماعی زندگی میں مذہبی شعائر و رسوم جو ایک قوم کے
ملی خصائص اور اس کے لئے وجہ امتیاز ہوتے ہیں ان کی رعایت اور نگہداشت بہر حال
ضروری اور واجب ہوتی ہے، اسی کو علامہ اقبالؔ نے سورج کی کرن کہا ہے۔ فرماتے ہیں:

چمک سورج میں کیا باقی رہیگی

اگر بیزار ہے اپنی کرن سے !!

یہ تہذیب ایک قوم کی انفرادیت اور انسانی معاشرہ میں اس کے امتیاز کی دلیل
ہوتی ہے۔ ان وجوہ کے باعث سرسید نے کالج میں تعلیم پانے کے ساتھ وہاں کی اقامتی
زندگی کو بھی لازمی قرار دیا کیونکہ اس کے بغیر تربیت کا سروسامان نہیں ہوسکتا تھا سرسید
کو اس تربیت کا اس درجہ سے اہتمام تھا کہ انھوں نے بچوں کے لئے بھی کالج میں جگہ پیدا
کی کیونکہ بچپن میں جو تربیت ہوتی ہے اس کا رنگ بڑا پختہ ہوتا ہے۔ ان بچوں کے نظام
تربیت کے متعلق مولانا حالیؔ لکھتے ہیں:

"صبح کے پانچ بجے سے رات کے نو بجے تک یہ بچے مختلف فرائض میں جکڑے
رہتے ہیں نماز پڑھنا، قرآن پڑھنا، ہوا خوری کرنا، گیند بلا کھیلنا، ڈرنگ

اسکول، نائٹ اسکول اور بڑے اسکول میں پڑھنا، کھانا کھانا، مطالعہ دیکھنا، اور سونا یا سوکر اٹھنا، غرض ہر ایک کام کے لئے خاص اوقات مقرر ہیں، جن میں بیاری کے سوا کبھی فرق نہیں آنے پاتا، ظاہر ہے جب ان کی زندگی اس پابندیٔ اوقات کے ساتھ گزرے گی توامید نہیں کہ وہ اس عبادت کو چھوڑ سکیں، اگرچہ بڑی عمر کے لڑکوں کے لئے بھی فرائض اور اوقات مقرر ہیں مگر جو عادت بچپن میں ڈالی جاتی ہے وہ طبیعتِ ثانیہ ہو جاتی ہے۔

(حیاتِ جاوید حصہ دوم ص ۷۷)

ہوسٹل کے علاوہ مختلف قسم کی سوسائٹیاں، انجمنیں اور ادارے بھی قائم کئے گئے جو طلبا کی تربیت کا کام کرتے تھے۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو نوجوان آٹھ دس برس وہاں گذار لیتے تھے وہ خاص خاص اخلاق وعادات اور صفات کے حامل ہوتے تھے۔ یہ لوگ نماز روزہ کے پابند ہوں یا نہ ہوں [1] لیکن ان میں غیرت وحمیتِ اسلامی ہوتی تھی، جری اور بے باک ہوتے تھے، ہنس مکھ اور شگفتہ مزاج ہوتے تھے، ایک دوسرے کے ہمدرد و غمگسار، ضرورت کے وقت مدد کرنے کے لئے ہمیشہ تیار، تنگ نظری اور تعصب سے بالاتر، فراخ حوصلہ اور عالی ہمت ہوتے تھے۔ صاف ستھری زندگی عام بول چال میں گویا ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے۔ طبیعت میں بلند پروازی ہوتی اور شرافت وحسن اخلاق کا پیکر ہوتے تھے، میرے بچپن کی بات ہے اور خود میرے خاندان کے متعدد عزیز اور بزرگ علی گڈھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ مذکورہ بالا اوصاف اس زمانہ میں علی گڈھ کے خصوصیات میں سے سمجھے جاتے تھے۔ یہ کیرکٹر اور کردار تو تھا ان نوجوانوں کا جو علی گڈھ

---

[1] اگرچہ علی گڈھ کبھی چند ایک ایسے طلبا سے محروم نہیں رہا جو پنجوقتہ نماز تلاوتِ قرآن کے ہی پابند نہیں، تہجد کے بھی پابند ہوتے تھے۔

کے سرچشمۂ فیض سے سیراب ہو کر آتے تھے اور خود کالج کا اسلامی کیرکٹر یہ تھا کہ یہاں ایک عالی شان مسجد ہے، اس کے علاوہ ہوسٹلوں میں بھی نماز کا اہتمام تھا۔ طلبا کو جماعت سے نماز ادا کرنے کی نہ صرف ترغیب دی جاتی بلکہ مسجد میں باقاعدہ حاضری بھی لی جاتی تھی۔ مسجد میں خاص خاص دنوں میں وعظ یا درسِ قرآن کا اہتمام بھی ہوتا تھا۔ کالج میں تعطیل جمعہ کو ہوتی تھی پورے کیمپس میں کوئی شراب نہیں پی سکتا تھا۔ عورتیں بے پردہ نہیں آسکتی تھیں۔ کالج میں جب کوئی فنکشن ہوتا تو اس کا آغاز تلاوتِ قرآن مجید سے ہوتا تھا۔ مغرب کی نماز کے وقت جلسہ ملتوی یا ختم ہو جاتا تھا۔ رمضان کے دنوں میں کوئی شخص کھلے بندوں کھاتا پیتا نظر نہیں آسکتا تھا۔ اسلامی تہوار اور تقریبات بڑے اہتمام اور شان و شوکت سے منائے جاتے تھے۔ ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت السلام علیکم کہتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کوئی خواہ کسی عقیدہ یا خیال کا ہو، لیکن کوئی شخص یونیورسٹی کے احاطہ میں خدا، پیغمبر یا مذہب کے مسلمات کے خلاف کوئی بات نہیں کہہ سکتا تھا[1]۔ اس ایک چیز کا اس درجہ اہتمام تھا کہ ملازمت کے وقت ہر شخص کو ایک عہد نامہ پر دستخط کرنے ہوتے تھے کہ وہ اسلام کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں کہے گا اور نہ کوئی ایسا عمل کریگا جس سے اسلام کی توہین و تنقیص ہوتی ہو، علی گڑھ میں تعلیم کے ساتھ کھیل کود (Sports) پر بھی بڑا زور ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود مجال نہیں تھی کہ لڑکے اور لڑکیاں ڈرامہ میں ایک ساتھ ایکٹنگ کریں، ناچ رنگ وغیرہ یہ سب ممنوع تھے۔ اقبال نے جو کہا ہے :-

---

[1] اس کا اہتمام ڈاکٹر سر ضیاء الدین کے زمانہ میں بھی اس درجہ تھا کہ ایک مشہور کمیونسٹ جن کا چند برس ہوئے انتقال ہو گیا ہے کا ایک مرتبہ شعبہ تاریخ میں لیکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا اور انھوں نے کسی لیکچر میں خدا اور مذہب کے خلاف کوئی بات کہدی تو ادھر لڑکوں میں ہنگامہ ہوا اور ادھر ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان کو فوراً نوکری سے برخواست کر دیا۔

آپ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر
سرسید اس فلسفہ سے اچھی طرح آشنا تھے، اس لئے انھوں نے اپنے نوجوانوں کو ہمیشہ شمشیر و سناں بکف ہونے اور طاؤس و رباب سے مجتنب رہنے کی تاکید کی۔ سرسید کو ترکوں کا لباس بہت پسند تھا انھوں نے خود اسے اختیار کر لیا تھا اور چاہتے تھے کہ لڑکوں کے لئے اسے ہی یونیفارم بنا دیں۔ لیکن بقول مولانا حالی کے بعض موانع کے باعث اسے نافذ نہیں کر سکے، تاہم سرسید کے دیکھا دیکھی یہ لباس کالج میں اس درجہ مقبول ہوا کہ علی گڈھ کے تعلیم یافتہ اسے علی گڈھ سے باہر بھی استعمال کرتے تھے۔ ترکش کوٹ گیا تو اس کی جگہ شیروانی نے لی۔ کھڑے پائنچوں کا پاجامہ اور شیروانی کی ایک مخصوص تراش علی گڈھ کٹ کہلاتی تھی اور پورے ملک میں اسی نام سے معروف تھی۔ علی گڈھ میں یہ دونوں اور ان کے ساتھ ترکی ٹوپی، ان تینوں کا اس درجہ اہتمام تھا کہ کوئی استاذ یا طالب علم اپنے مکان یا کمرہ سے باہر ان کے بغیر نہیں نکل سکتا تھا۔ اساتذہ اور طلبا میں باہم باپ اور اولاد کا سا تعلق ہوتا تھا۔ اساتذہ کلاس روم سے باہر بھی طلبا کا برابر خیال رکھتے اور ان کی ہر قسم کی امداد کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے، اسی طرح طلبا ان کے ساتھ ادب و احترام اور محبت کا معاملہ کرتے تھے۔

غرض کہ یہ ہے وہ کلچر اور وہ تہذیب جس کو اس کے پورے لوازم کے ساتھ سرسید نے کالج میں برپا کیا اور یہی کلچر اس درس گاہ کی خصوصیت اور نشانِ امتیاز بن گیا۔ ۱۹۷۲ء کا ترمیمی ایکٹ منظور ہو جانے کے بعد وزیر تعلیم نے متعدد تقریروں میں بہ طور طنز کہا ہے کہ "علی گڈھ یونیورسٹی مذہبی ادارہ نہیں اور اس کا کام مولوی ملا نے پیدا کرنا نہیں ہے"۔ گذارش یہ ہے کہ بجا فرمایا آپ نے! بیشک علی گڈھ ایک مذہبی مدرسہ نہیں اور اس نے مولوی ملاؤں کے بجائے (مولانا) محمد علی، محمد شعیب قریشی، عبدالرحمن بجنوری اور محفوظ علی جیسے انگریزی زبان کے ادیب اور انشا پرداز اور علوم جدیدہ کے ماہر و فاضل ایسے

ہزاروں افراد پیدا کیے ہیں جنھوں نے اس ملک کی قسمت بدل دی اور ہر شعبۂ زندگی میں ناموری حاصل کی. لیکن یہ سب حضرات ایک مخصوص کلچر اور تہذیب کے حامل تھے اور یہی تہذیب علی گڈھ کالج (اور پھر یونیورسٹی) کا طغرائے امتیاز تھی. اگر کیمبرج اور آکسفورڈ کو عیسائی تہذیب پر. بنارس ہندو یونیورسٹی کو ہندو تہذیب پر اور شانتی نکیتن کو ٹیگور کی تہذیب پر فخر ہے تو بے شبہ سرسید کے کالج کو اسلامی تہذیب پر فخر تھا اور ہونا چاہیے تھا.

اس موقع پر گاندھی جی کا ایک واقعہ یاد آیا. میں اسے برہان میں پہلے بھی [illegible] ہوں اور موقع کی مناسبت سے اب پھر یہاں لکھتا ہوں:

۱۹۴۷ء کے آخر کی بات ہے، ایک روز مولانا ابوالکلام آزاد نے مفتی محمد کفایت اللہ مولانا احمد سعید، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، ڈاکٹر ذاکر حسین (اللہ اکبر! اب یہ سب ہی مرحوم ہوگئے. رحمہم اللہ) مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور خاکسار راقم الحروف (کاروانِ رفتہ کے ماتم کنندگانِ حسرت سرا) ان سب کو لنچ پر مدعو کیا. اس دعوت کا اصل مقصد تو تھا ان مسجدوں کے متعلق مشورہ کرنا جن کے علاقوں میں ایک مسلمان بھی نہیں رہا اور اب وہ وہاں اجاڑ اور ویران پڑی ہوئی ہیں لیکن جب

؎ میں عملی سیاست کا مردِ میدان کبھی بھی نہیں رہا. البتہ مولانا ابوالکلام آزاد برہان کا برابر مطالعہ کرتے اور میری بعض تصانیف جو ان کی نظر سے گذر چکی تھیں ان پر تحسین فرماتے تھے خاص طور پر میری کتاب "اسلام میں غلامی کی حقیقت" کے بارہ میں فرمایا کہ اس موضوع پر مصر کے شفیق بک نے "الرق فی الاسلام" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے وہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے اور میں نے اس کو بھی پڑھا ہے، لیکن تمہاری کتاب اس سے بھی کہیں زیادہ جامع اور بہتر ہے، بہرحال ان وجوہ سے مولانا مجھ پر خاص شفقت کی نظر رکھتے تھے اور اس لئے جب کبھی مسلمانوں سے متعلق کوئی علمی یا تعلیمی مشورہ کرنا ہوتا تھا مجھے اس میں ضرور

(اگلے صفحہ پر)

بات چلی تو اور چند امور بھی زیرِ گفتگو آگئے۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے مولانا ابو الکلام آزاد کو خطاب کر کے پوچھا "مولانا! کیا اب علی گڑھ اور بنارس کے ہندو مسلم یونیورسٹی نام رہ

شریک کر لیتے تھے۔ یہی ان کی وہ شفقتِ بزرگانہ تھی جس کے باعث جب مغربی بنگال کی گورنمنٹ نے ان سے کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل کی پوسٹ کے لئے آدمی طلب کیا تو انہوں نے فوراً وہاں میرا نام لکھ بھیجا، ۱۹۴۹ء میں اس عہدہ کا چارج لینے کے ایک دن میں مغربی بنگال گورنمنٹ کی وزارتِ تعلیم کے اڈیشنل سکریٹری مسٹر اے۔ کے چندا سے ملا۔ یہ نہایت شگفتہ مزاج اور خوش باش بنگالی آفیسر اور مولانا آزاد کے بے تکلف دوست اور ان کے حاضر باشوں میں تھے۔ ادہر ادہر کی باتیں کرتے ہوئے اچانک چندا صاحب بولے: "اور ہاں اکبر آبادی صاحب! معلوم ہوتا ہے آپ بڑے قابل آدمی ہیں"! میں نے کہا آپ کو کیسے معلوم ہوا! انھوں نے جواب دیا "سنیے! میں مولانا ابو الکلام کو تیس برس سے جانتا ہوں وہ کسی کی تعریف کرنے میں بیحد بخیل ہیں۔ لیکن آپ کی تعریف میں انھوں نے مجھ سے وہ سب کچھ کہا جو میں نے ان کی زبان سے کسی کی نسبت نہیں سنا۔ ہوا یہ کہ ادہر کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل کی پوسٹ کے لئے مولانا نے آپ کا نام بھیجا اور ادہر پروفیسر ہمایوں کبیر نے کلکتہ کے ہی ایک نیم بنگالی جو ڈبل ایم۔ اے تھے اور تعلیم کا پرانا تجربہ رکھتے تھے اس پوسٹ کے لئے ان کے نام کی سفارش کی۔ پھر جب دہلی جاکر مولانا سے ملا اور ہمایوں کبیر کی تجویز کا ذکر کیا تو مولانا یہ سنتے ہی غصہ کے مارے سرخ ہو گئے۔ اور فرمایا: "ہرگز نہیں! اکبر آبادی کے سوا دوسرا کوئی شخص ہرگز پرنسپل نہیں ہوسکتا"، یہ کہنے کے بعد مولانا نے آپ کی نسبت وہ تعریفی الفاظ کہے جن کو میں ان کی زبان سے سن کر سخت متعجب ہو رہا تھا۔ یہ الفاظ کیا تھے؟ ان کو نہ چندہ صاحب نے بیان کیا اور نہ میں نے ان کی کرید کرنا مناسب جانا! بہرحال میں اگر کوئی اچھا مضمون میرے قلم سے نکلتا تو عند الملاقات اس پر داد کا اظہار فرماتے تھے اور اگر کوئی جملہ یا فقرہ یا کوئی پیراگراف پسند نہیں آتا تھا

(اگلے صفحہ پر)

لگیں گے ؟ مولانا یہ سنکر جیسے کسی سوچ میں ڈوب گئے اور آنکھیں بند کر کے کچھ [illegible]
اتنے میں میں نے کہا ، اگر گستاخی نہ ہو تو گاندھی جی کا ایک واقعہ عرض کروں جو میں نے [illegible]
الرحمٰن صاحب (مرحوم) سے براہِ راست سنا ہے ، مولانا نے فرمایا کہیے کہیے ! [illegible]
کیا واقعہ ہے ؟ " میں نے عرض کیا : شفیق الرحمٰن صاحب نے کہا : ایک مرتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی
مالی حالت اتنی خراب ہوگئی کہ اس کا چلنا دشوار ہوگیا تو اس معاملہ پر غور و خوض کرنے کے
لیے ڈاکٹر انصاری (مرحوم) کی کوٹھی نمبر ا ۔ دریا گنج میں ایک اہم اجتماع ہوا جس میں گاندھی
جی ، حکیم اجمل خاں ، ڈاکٹر انصاری ، سیٹھ جمنالال بجاج اور شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی
وغیرہم حضرات شریک تھے ، اصل موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی کہ اچانک سیٹھ جمنالال بجاج
حکیم اجمل خاں صاحب کو مخاطب کر کے بولے : حکیم صاحب ! اگر آپ جامعہ کے نام سے
اسلامیہ کا لفظ نکال دیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ لاکھوں روپیہ تو جامعہ کے لئے میں ہندوؤں
سے دلوادوں گا ، " گاندھی جی اس وقت گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے ۔ یہ سنا تو
ادبدا کے پالتی مار کر بیٹھ گئے اور فرمایا : " ہیں بجاج ! یہ کیا کہا تم نے ! یہ جامعہ کا نام
اسلامیہ تو میں نے رکھوایا ہے اور اسی مقصد اور ارادہ سے کہ یہ اسلامی کلچر کی درس گاہ
ہوگی یہ کلچر دنیا کا ایک عظیم کلچر ہے اور مسلمانوں کو ہی نہیں ہندوؤں کو بھی اس کلچر کی تعلیم
حاصل کرنی چاہیے ۔ پھر فرمایا ، آخر کوئی ایک درس گاہ تو ایسی ہونی چاہیے جہاں اگر میں اپنے بیٹے
دیوداس گاندھی کو اسلامی کلچر کی تعلیم دلانا چاہوں تو بھیج سکوں[1] ۔ اس کے بعد گاندھی جی

---

[1] چنانچہ غالباً دیوداس گاندھی نے کچھ عرصہ رہ کر جامعہ میں تعلیم بھی پائی ہے ۔

تو اس پر بھی متنبہ فرما دیتے اور کہتے : مولوی صاحب ! اگر آپ اس جملہ میں الفاظ کی ترتیب
اس طرح کر دیتے تو کلام [illegible]
اب بھی میں [illegible]

نے حکیم صاحب سے مخاطب ہوکر کہا: حکیم صاحب! آپ بجاج کی بات کا کوئی خیال نہ کریں میں اگر آپ ملک کے دورہ پر نکلیں گے اور آپ دیکھیں گے کہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے کتنے لاکھوں روپیہ ہندوؤں سے لا دوں گا۔ یہ واقعہ اس اجتماع کے سب شرکا نے بہت دلچسپی اور توجہ سے سنا جب میں سنا چکا تو مولانا نے ڈاکٹر ذاکر حسین سے پوچھا: کیا یہ واقعہ صحیح ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے بھی تصدیق کی اور فرمایا: جی ہاں! شفیق صاحب نے یہ واقعہ ہم لوگوں کو بھی سنایا تھا۔

سرسید انگلینڈ گئے تو وہاں علوم و فنونِ جدیدہ، نظامِ تعلیم و تربیت اور ایڈمنسٹریشن ان سب سے اس درجہ متاثر ہو کر آئے کہ یہاں بات بات میں کیمبرج اور آکسفورڈ کو سامنے رکھتے تھے۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ یہ دونوں یونیورسٹیاں عیسائی تہذیب و تمدن اور ان کی روایات کی پاسباں ہیں اور سرسید اپنے کالج کو اسلامی تہذیب اور اس کے کلچر کا ترجمان بنانے کا عزم اور جذبہ رکھتے تھے اور اسی وجہ سے کالج کا نام "محمڈن کالج" رکھا گیا تھا۔ ورنہ اس زمانہ کے کلکتہ مدرسہ اور سنسکرت کالج، کلکتہ کی طرح یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ یہ کالج صرف ایک فرقہ کے طلبا کے لئے مخصوص ہے اور دوسرے فرقہ کے طلبا کے لئے اس کا دروازہ بند ہے۔ پس اگر کالج ایک جسم تھا تو اس کی روح اسلامی کلچر ہے، اگر وہ ایک پھول تھا تو اس ... اسلامی تہذیب تھی، اگر کالج شراب دو آتشہ کہیئے تو اسلامی ثقافت کو اس کا نشہ سمجھیئے ... مند ادارے اور باحمیت قومیں کس طرح اپنے کلچر اور تہذیب کی حفاظت کرتی ہیں! اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ دنیا میں بڑی بڑی جنگیں اسی تہذیب کی خاطر ہوئی ہیں۔ یہی قوموں میں باہم کشیدگی اور رقابت کا بڑا سبب تہذیب ہی ہے۔ بہرحال ... چہ دینیات کی تعلیم اور ان کے درو بست کا معقول اور خاطر خواہ انتظام نہیں ... نے ان کے ساتھ تعاون نہیں کیا اور جو علما اس شعبہ کے ساتھ وابستہ رہے ... استعداد کے اعتبار سے کیسے ہی لائق و فائق ہوں، فکر و نظر، مطالعہ اور

[illegible] آں اندیشی کے لحاظ سے "ملائے مکتب" سے زیادہ نہیں تھے لیکن اسلامی تہذیب کو تا[illegible]
[illegible] کی بات تھی اس میں انھوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

سات اصول :- اب تک جو کچھ عرض کیا گیا، اس سب کو سامنے رکھیے تو سرسید نے کالج کو جن روایات کے ساتھ چھوڑا اور اس سلسلہ میں ان کی جو پالیسی رہی اسے دفعات ذیل میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) کالج صرف ایک درس گاہ نہیں تھا، بلکہ ایک تحریک تھا۔

(۲) کالج کا مقصد مسلمانوں کو حضیضِ ذلت و خواری سے نکال کر عزت و رفعت کے مقام پر لانا تھا۔

(۳) کالج میں علوم و فنونِ جدیدہ کی تعلیم کا اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام کیا جائے۔

(۴) کالج صرف ایک تعلیم کا نہیں بلکہ تہذیب و تربیت کا بھی مرکز تھا۔

(۵) کالج میں مسلمانوں کے علاوہ دوسرے فرقوں اور مذاہبِ غیر کے نوجوان بھی تعلیم پا سکیں گے۔

(۶) کالج کا کوئی تعلق ملک کی سیاست سے نہیں ہوگا۔

(۷) کالج حکومتِ وقت سے اشتراک و تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔

نواب محسن الملک کا دور :- سرسید کے انتقال کے بعد سید محمود آنریری سکریٹری ہوئے، لیکن کثرتِ بادہ نوشی کے سبب ان کی صحت کو گھن لگ چکا تھا۔ وہ زیادہ دنوں نہ چل سکے اور دس ماہ کے بعد ہی یعنی ۳۱ر جنوری ۱۸۹۹ء کو نواب محسن الملک کالج کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ نواب صاحب مسلمانوں کے نہایت دردمند، خاموش کارکن اور بے حد مخلص اور مستعد بزرگ تھے۔ انھوں نے سکریٹری ہوتے ہی کالج کو وہ بال و پر دیئے کہ کالج شاہراہِ ترقی پر تیز رفتاری سے گامزن ہو گیا۔ مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری لکھتے ہیں :-

"سرسید کے انتقال کے بعد نہ صرف علی گڈھ کالج کی حیثیت قائم رہی، بلکہ نواب

محسن الملک بہادر کی پالیسی سے پہلے نقصانات کی تلافی کا دور شروع ہوا..... آپ کی کوشش سے تھوڑے عرصہ میں نہ صرف کالج کے ذمہ کا پہلا قرضہ ادا کر دیا گیا، بلکہ لاکھوں روپیہ کالج میں جمع ہوگیا اور جو عمارتیں سالہا سال سے ناتمام پڑی چلی آرہی تھیں وہ مکمل ہوگئیں۔ ایک بڑا کام نواب صاحب نے یہ کیا کہ اپنے جلسوں اور قومی تقریبات میں علما اور مشائخ کو شریک کرکے جو رکاوٹ جدید اور قدیم تعلیم یافتگان میں عرصہ سے چلی آرہی تھی اسے دور کیا اور اس طرح تمام مسلمانوں کو بہت کچھ ایک مرکز پر لانے میں کامیابی حاصل کی، اس کا ایک بدیہی نتیجہ یہ ہوا کہ تین سال کے عرصہ میں تعدادِ طلبا دوگنی کے قریب ہوگئی" (مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۲۲۱)۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس: سرسید نے کالج کے نمونے پر ملک بھر میں جگہ جگہ اسلامیہ اسکول اور کالج بنانے کی غرض سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے نام سے ایک ادارہ کی تاسیس کی تھی۔ لیکن وہ کالج کے معاملات میں ہی اس درجہ مصروف رہے کہ اس طرف زیادہ توجہ نہ کرسکے اور کانفرنس کا کام آگے نہ بڑھا۔ نواب محسن الملک نے بعد از فرزانگی اور روشن دماغی کی راہ سے اس ادارہ کی اہمیت اور مسلمانوں کے لئے اس کی شدید ضرورت کو محسوس کیا تو انھوں نے اس پر بھی خاطر خواہ توجہ مبذول فرمائی اور اس کو ترقی دی، چنانچہ اپنے سکریٹری بننے کے پہلے ہی سال ۱۸۹۹ء کے ماہ دسمبر میں کلکتہ میں کانفرنس کا جو اجلاس منعقد ہوا اس میں ایک تجویز منظور کرائی جس کا حاصل یہ تھا کہ "ہندوستان کے مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اشاعت کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ اسلامیہ کالجوں کو طلبا بہم پہونچانے کے لئے ہر ضلع یا مجموعہ اضلاع میں تمہیدی مدارس قائم کئے جائیں، اس تجویز کا اثر یہ ہوا کہ کانفرنس کی سعی اور کوشش سے مختلف مقامات میں مسلمانوں کے اسکول قائم ہونے لگے، علاوہ ازیں نواب صاحب (مرحوم) کی جد و جہد اور کوشش کے باعث ہندوستان کے بڑے بڑے صوبوں میں کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوئے اور ان اجلاسوں میں مقامی مسلمانوں نے اپنے اپنے

صوبوں کی تعلیمی ضرورتوں کے متعلق تجویزیں حکومت کو پیش کیں اور اس سلسلہ میں گورنمنٹ سے مطالبے کیے مثلاً مسلمان انسپکٹر آف ایجوکیشن کا تقرر، سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم کا بندوبست، طلبا کے لیے سرکاری وظائف، غریب طلبا کی فیس کی معافی، نصاب تعلیم میں ایسی ترمیم کہ وہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہو جائے، سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم کی اجازت، مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری لکھتے ہیں: یہ وہ مراعات تھیں جو ۳۰ - ۲۵ سال قبل گورنمنٹ نے مسلمانوں کے لیے منظور کی تھیں اور جن کی طرف اجتماعی طور پر مسلمانوں کو اس وقت توجہ ہوئی جب کہ وقت بہت کچھ نکل چکا تھا۔ بہرحال نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ جو بالآخر کانفرنس کے ذریعہ ہونا شروع ہوا۔ (ص ۲۳۳)

انگریز اساتذہ کی خدمت کا تسلسل:- سرسید کو انگریز اساتذہ کی تعلیمی خدمات حاصل کرنے پر جو اصرار تھا نواب محسن الملک کو اس کی افادیت اور اہمیت کا احساس تھا۔ اس لیے وہ اپنے دورِ سکریٹری شپ میں بھی اس پر عامل رہے۔ چنانچہ سرسید کے انتقال کے ایک برس بعد ہی جب پرنسپل بیگ کا انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ پروفیسر مارسین پرنسپل مقرر ہوئے اور انھوں نے کالج کی ہمہ جہتی اور طلبا کی عام فلاح و بہبود کے لیے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ ان سے نہ صرف یہ کہ کالج کو مزید استحکام ہوا بلکہ ملک میں بھی اس کے وقار اور شہرت کو چار چاند لگ گئے، پرنسپل مارسین طلبا سے، ان کے علی گڑھ سے فراغت کے بعد بھی تعلق اور رابطہ رکھتے، ملازمت کے حصول میں ان کی مدد کرتے، اور اپنے مشوروں سے ان کی رہنمائی کرتے رہتے تھے۔

نماز کی پابندی:- خود نماز روزہ کے بہت پابند تھے اور اکثر نماز باجماعت یونیورسٹی کی مسجد میں ادا کرتے تھے، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ جب اپنے دفتر سے اٹھ کر مسجد میں نماز کیلیے جاتے تھے تو راہ میں جو مسلمان طالب علم بھی مل جاتا اسے بھی ساتھ لیتے تھے۔ مشہور ہے کہ ایک زمانہ میں نماز کے وقت طلبا کی باقاعدہ حاضری ہوتی تھی اور جو طلبا کسی معقول عذر کے بغیر غیر حاضر ہوتے تھے ان پر جرمانہ ہوتا تھا۔ غرض کہ سرسید نے کالج میں جو اسلامی تہذیب قائم کرنا چاہی تھی نواب محسن الملک کے زمانہ میں اس پر اور جلا ہوئی اور اس کا رنگ نکھر گیا۔

رسولؐ شاہد و مشہود

(۲)

(از جناب قاری بشیر الدین صاحب پنڈت۔ ایم۔ اے)

اللہ تعالیٰ نے دعاء ابراہیمؑ کو شرفِ قبولیت بخشا۔ کعبہ تعمیر کرتے وقت دعا مانگی تھی:
رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا ـ تا ـ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (سورۂ بقر آیات ۱۲۸، ۱۲۹) یعنی اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا اور زیادہ مطیع بنا لیجیے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کیجیے جو آپ کی مطیع ہو اور ہم کو حج کرنے کے احکام بھی بتا دیجیے اور ہمارے حال پر توجہ رکھیے فی الحقیقت آپ ہی ہیں توجہ فرمانیوالے، مہربانی کرنیوالے۔ اور اے ہمارے پالنہار اس جماعت کے اندر ان ہی میں کا ایک ایسا پیغمبر بھی مقرر کیجیے جو لوگوں کو آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کرے اور ان کو آسمانی کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک کردے بلاشبہ آپ ہی ہیں غالب اور حکمت والے۔

اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی ارشاد ہوا "تجھے بڑی قوم بناؤں گا ـــ تیرا نام بڑا کرونگا۔ اور ان کو برکت دوں گا جو تجھے برکت دیتے ہیں اور لعنتی کروں گا تیرے (تجھے) خفیف کرنیوالوں کو اور برکت پائیں گے تجھ سے سب زمین کے سب گھرانے۔"

اس پیشینگوئی کے کچھ اور اجزاء بھی ہیں جو بائبل کی کتاب کی پیدائش کے ابواب ۱۲ تا ۲۴ میں موتی کے دانوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً (۱) ختنہ کا عہد جس قوم میں ہوگا وہی خدا کے عہد کی وارث ہوگی (پیدائش ۱۷ آیۃ ۱۴، ۱۵) (۲) اسمٰعیل کے حق میں دعا کی قبولیت یعنی اس سے ایک امتِ عظیمہ (مسلمہ) پیدا ہوگی (پیدائش ۱۷ آیۃ ۲۰)۔ (۳) فرشتہ کا والدۂ اسمٰعیل

یعنی حضرت ہاجرہ سے وعدہ کہ تیرے بیٹے سے ایک عظیم الشان قوم پیدا ہوگی (پیدائش ۲۱ : ۱۸)

بہرحال ان تمام نشانیوں کو پیشِ نظر رکھ کر غور فرمایئے کہ یہ کس طرح جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں پوری اترتی ہے۔ مذکورہ بالا پیشگوئی میں یہ بتایا گیا ہے کہ "تجھے جو برکت دیتے ہیں میں ان کو برکت دوں گا۔" دنیا میں صرف امتِ مسلمہ ہی ایک وہ قوم ہے جو اپنی پنجوقتہ نمازوں میں اور روزانہ درود و وظائف میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کی آل اصحاب کے لئے دعاءِ برکت بھیجتی ہے۔ اور ۲۴ گھنٹوں میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا کہ دنیا کے کسی نہ کسی گوشہ میں درود شریف نہ پڑھی جاتی ہو۔ سورہ احزاب رکوع کی اس آیتہ شریفہ یعنی اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ○ کے صریحی حکم کی بنا پر صلوٰۃ وسلام بھیجنا ہر فردِ امت پر فرض ہے اور نہ بھیجنے پر سخت وعیدیں ہیں۔ مستدرک حاکم میں حضرت کعب بن عجرہؓ سے مروی ہے۔ فرمایا جناب محمد رسول اللہؐ نے محروم و برباد ہو وہ شخص جو رمضان المبارک کا مہینہ پائے پھر بھی اس میں اس کی مغفرت کا فیصلہ نہ ہو۔ تباہ و برباد ہو وہ بدنصیب اور بے توفیق کہ جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور درود نہ بھیجے۔ برباد ہو وہ بدبخت جو اپنے بوڑھے باپ یا ماں یا دونوں کی خدمت کرکے جنت کا مستحق نہ ہو سکے۔" درود شریف کی عظمت و اہمیت کا اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے نیک مقاصد کیلئے دعاؤں کی جگہ صرف درود شریف ہی پڑھا کرے تو اس کے سارے مسائل غیب سے حل ہوں گے۔ جیسا کہ حضرت ابی بن کعبؓ سے مروی ہے (ترمذی) یہ اللہ کا خصوصی کرم ہے کہ وہ اپنے حبیب پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بکثرت درود بھیجنے کا صلہ اس طرح عطا فرمائے کہ اس کے تمام مسائل غیب سے حل کر دے۔ جو اللہ کا بندہ جناب رسول اللہ پر ایک صلوٰۃ بھیجتا ہے تو اللہ کی طرف سے اس پر دس صلوٰۃ بھیجی جاتی ہیں۔ اس کے نامۂ اعمال میں دس نیکیاں درج کی جاتی ہیں۔ دس گناہ مٹا دئے جاتے ہیں۔

دعا اس کا مرتبہ دس درجہ بلند کر دیا جاتا ہے۔

تو پھر جس بندہ کا یہ حال ہو کہ وہ اپنی ذاتی دعاؤں کی جگہ بھی صرف آنحضور کیلئے صلوۃ کی استدعا کرے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے صلوٰۃ و سلام، رحمتوں اور عنایتوں کی کیسی موسلادھار بارش ہوگی جس کا لازمی اثر و انجام یہ ہوگا کہ اللہ کی رحمت بلا مانگے اس کی ضرورتوں کو پورا کر دے۔ اللہ تعالیٰ ان حقائق کا یقین و عمل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

اس پیشینگوئی کی تائید حضرت داؤد علیہ السلام نے زبور میں کی کہ "اس کے (آنحضرتؐ کے) حق میں سدا دعا ہوگی اور ہر روز اس کی مبارک باد کہی جائے گی۔ (ملاحظہ ہو زبور ۷۲: ۱۵) وید بھی اس کے مؤید ہیں۔ یہود و نصاریٰ کے یہاں کوئی روزانہ دعا ایسی نہیں ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی دعاء برکت کے مضمون پر مشتمل ہو۔ اس کے برکت دینے والی قوم سے مراد صرف امتِ مسلمہ ہے، جو صحیح معنی میں دینِ حنیف کی پیرو ہے۔

پیشینگوئی کا دوسرا جز، کہ "دنیا کے سب گھرانے تجھ سے برکت پائیں گے" صرف اُمتِ مسلمہ سے مخصوص ہے کیونکہ یہودی مذہب میں تبلیغ کرنے سے ممنوع ہے اگر ان کی طویل تاریخ میں سے دو واقعات کو خارج کر دیا جائے ایک یہ کہ بعثتِ محمدی سے کئی صدی قبل یمن میں ایک قابلِ ذکر تعداد نے یہودی مذہب قبول کر لیا اور دوسرا یہ واقعہ کہ روس کے حدود میں تاتاری الاصل ریاست خزار کے باشندوں نے یہودی مذہب کو قبول کیا تو پھر یہودیوں کے پاس ان کی زندگی کے کسی دور میں کوئی عالمی پیغام نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودی خون و نسل، روحانی پاکیزگی و صلاحیت نیز قربِ خداوندی کو صرف اپنی حد تک محدود رکھتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ عالمی پیغام کی روح اور اسپرٹ کے قطعی منافی ہے۔ روئے زمین کی دوسری اقوام اور پوری انسانیت کو اپنے دعوت و پیغام میں شریک کرنا اور انھیں عملِ صالح اور اخلاقِ فاضلہ میں برابر کا حصہ دار سمجھنا ان کے مذہبی عقائد و مزاج کے خلاف ہے۔ دنیا کی تمام اقوام ان کی نظر میں جمادات و حیوانات سے زیادہ قیمت نہیں رکھتیں۔ اللہ نے

ان کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ نعوذ باللہ اس کی لاڈلی اولاد یعنی برہمنوں کی خدمت کرتے رہیں۔ یہ نظریہ اور عقیدہ ہندوستان کے ان برہمنوں اور آریوں کے ان جاہلوں کے عقیدہ سے بہت ملتا جلتا ہے جو رگ ویدک کال کے بعد ہوئے اور جس پر آج ہندو مذہب کے طبقاتی نظام اور عدم مساوات کی بنیاد ہے اور باوجود اصلاحی کوششوں کے اب بھی سماج میں رائج ہے، اور اس پر بدستور عمل ہو رہا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی کل دنیا کی رہنمائی کے لئے تشریف نہیں لائے تھے۔ (متی ۱۵: ۲۴)۔

غرض کہ کل انبیاء عالم میں آنحضرت ہی ایک ایسے نبی ہیں جو دنیا کے تمام گھرانوں کے لئے برکت لائے۔ قرآن پاک نے اس بشارت ابراہیمی کی ان الفاظ میں تائید کی: قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (سورۂ اعراف آیۃ ۱۵۸) یعنی کہو! اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ میرے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرو کالے گورے بھی، عربی بھی اور عجمی بھی، تم میں کسی کو کسی پر رنگ ونسل اور قوم و وطن کی وجہ سے فوقیت نہیں البتہ تم میں اشرف و اعلیٰ وہ ہے جو نیک ہے، متقی و پرہیزگار ہے اور اللہ والا ہے۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ آنحضور نے کس طرح عالمی پیغام کی نہ صرف تبلیغ کی بلکہ اس پر عمل کر کے دنیا کے سامنے نمونہ پیش کیا اس کو جاننے اور سمجھنے کے لئے اس ناچیز کی تالیف "علم اعظم" کا بالاستیعاب مطالعہ کیجئے۔

(۵) جناب یعقوبؑ کی پیشینگوئی:۔

عصر حاضر کے علماء محققین اس امر پر متفق ہیں کہ قرآن عزیز کے علاوہ تمام الہامی کتب میں تحریف ہے لیکن یہ کتنے حیرت کی بات ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ان میں جو بشارتیں اور پیشینگوئیاں محفوظ رکھی ہیں اسی لئے بنو اسرائیل جناب مسیح کے بعد بھی اس "آنیوالے نبی" کے منتظر تھے جن کی نشاندہی جناب ابراہیم کے بعد بھی برابر کی جاتی رہی۔ جناب یعقوب علیہ السلام حضرت ابراہیم کے پوتے اور جناب اسحٰق علیہ السلام کے بیٹے ہیں انھوں نے اپنے بستر وصال پر اپنے سب بیٹوں کو جو تعداد میں بارہ تھے طلب کیا

اور ہر ایک کو اس کی عادت اور فضیلت کے مطابق دعا دی۔ سب سے بڑے بیٹے یہوداہ کو مخاطب کر کے دعا دی، فرمایا "یہوداہ سے ریاست کا عصا جُدا نہ ہوگا اور نہ اس کی نسل سے حکومت کا عصا موقوف ہوگا جب تک کہ شیلوہ نہ آجائے اور قومیں اس کے پاس اکٹھی ہوں گی" (پیدائش باب ۴۹ آیۃ ۱۰) یوسف علیہ السلام کے لئے برکت چاہی اور کہا کہ خدا جس کے سامنے میرے دادا ابراہیمؑ اور باپ اسحٰق چلے ...... ان کو برکت دیوے" (کتاب پیدائش باب ۴۸، آیۃ ۱۵)۔ ان بشارات سے ظاہر ہے کہ یعقوبؑ کی اولاد میں حکومت کا عصا اگر یہوداہ اور اس کی اولاد کو دیا گیا تو برکاتِ نبوت کا وارث یوسفؑ اور اولادِ یوسفؑ کو قرار دیا گیا لیکن اس وقت تک کے لئے جب تک کہ شیلوہ نہ آجائے۔ اس لئے اس لفظ کی تشریح ضروری ہے تورات کے مختلف نسخوں میں لفظ کہیں شیلوہ ہے اور کسی جگہ شلوہ، بعض میں شیلیم شلو اور شیلو ہے۔ قرأت کے اس اختلاف کے باوجود عام طور سے اس کے معنی "صلح کرانیوالا" یا "سلامتی کا شہزادہ" سمجھے گئے ہیں۔ یہود اس شیلوہ کی آمد کے بڑی بے چینی کے ساتھ منتظر تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ اولادِ یوسف یا قبیلۂ یوسف میں مبعوث ہوگا لیکن یوسف علیہ السلام کے دونوں بیٹوں افرائیم و منسی کی اولاد جب رحبعام بن سلیمانؑ کے دورِ حکومت میں مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملی تو وہ مایوس ہو گئے لیکن جناب موسیٰ علیہ السلام کی اس بشارت کی بنا پر کہ "خداوند تمہارا خدا تمہارے لئے تمہارے ہی بیچ سے تمہارے بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اس کی سننا" (استثنا باب ۱۸ آیات ۱۵، ۱۸) اس کا یقین رکھتے تھے کہ وہ (شیلوہ) انھیں کے بھائیوں (بنی اسرائیل) میں سے ہوگا۔ اس بشارت میں "تمہارے بھائیوں" کی اصلیت نہ سمجھنے کی بنا پر یہود آج تک مغالطے میں مبتلا ہیں۔ اگلی سطور میں اس کی وضاحت کی جائے گی۔ فی الحال لفظ (شیلوہ) پر غور کیجیے اور یعقوبؑ کی بشارت کس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی مصدق ہے سمجھنے کی کوشش کیجیے۔

کل تک بہت سی حقیقتیں جو مستور تھیں آج کھل کر سامنے آرہی ہیں جن کو دیکھ کر انسان

صداقت اسلام پر ایمان لانے کے لئے مجبور ہو جائیں یہ دوسری بات ہے کہ ان کی ہٹ دھرمی انہیں اس سے باز رکھے اور وہ راہِ راست پر نہ آسکے۔ کیا اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ غیب کی وہ خبریں جو آج آثارِ قدیمہ بابل اور فلسطین سے ظاہر ہو رہی ہیں جنہوں نے عیسائی و یہودی مذہب کے پیروؤں میں ہلچل مچا دی ہے وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو ظاہر کر رہی ہیں۔ مذکورہ بالا سطور میں بشارتِ یعقوبی کا لفظ شیلوہ اب تک متنازعہ فیہ تھا۔ اس لفظ کی مختلف قرائتیں بائبل کے مختلف نسخوں میں موجود ہیں۔ دوسری طرف روایات میں یوسفؑ کے آنے کی خبر یہودیوں میں اتنی عام ہے کہ عیسائی اس کو جناب مسیح پر چسپاں کرنے کے لیے ان کے شجرۂ نسب پر ز دارنے سے بھی نہیں چوکتے اور جناب مسیح کو زبردستی ابن یوسف بنا دیتے ہیں۔ آج تحقیقاتِ فلسطین کے واقعات نے اصلیت کو آشکارا کر دیا کہ یہ لفظ "شیلوہ" کی بجائے "شیلون" ہے اور شیلون عربی زبان میں یوسف کا نام ہے (ملاحظہ ہو بائبل ریسرچ فلسطین صـ۸۰ تا صـ۹۵)۔ کتاب پیدائش کے عربی ترجمہ میں بھی اس کا تلفظ "شیلون" ہے (تکوین باب ۴۹) اب یہ بات آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتی ہے کہ جناب یعقوب علیہ السلام نے بشارت میں یوسف کے عربی نام سے خوشخبری سنائی کہ شیلون آئے گا جس کا تعلق عرب سے ہوگا۔ یوسفؑ اگر عبری نبی ہیں تو وہ یوسف (شیلون) عربی نبی ہوگا جو مثیل یوسف ہے نہ کہ عیسائی خیال کے مطابق ابن یوسف۔ آنحضور مثیل یوسف ہیں اس لئے انہیں شیلون کے نام سے یاد کیا گیا۔ اس کے متعلق کچھ عرض کرنا بیکار ہے اس لئے کہ دونوں کی سوانح حیات میں بہت کچھ مماثلت ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو بشری صـ۲۵ تا صـ۲۹ نیز میثاق النبیین صـ۱۴۴ تا صـ۱۴۶)۔

اس سلسلہ میں اتنا اور عرض کرنا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی مذکورہ بالا بشارت کی تشریح جناب حزقی ایل نے اس طرح کی خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ اے مجروح شدید شاہ اسرائیل تو کلاہ دور کر اور تاج اتار۔ یہ ایسا نہ رہے گا۔ پست کو بلند کر اور جو بلند

ہے اسے پست کر۔ میں ہی اُسے اُلٹ، الٹ، الٹ دوں گا۔ پر یوں بھی نہ رہے گا اور وہ آئیگا جس کا حق ہے اور میں اُسے دوں گا" حزقی ایل باب ۲۱ آیات ۲۶، ۲۷)۔

حزقی ایل کی عبادت کے آخری عبرانی الفاظ "اشر لو ہمیشپاط" کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے ترجمہ میں دو مبہم باتیں ہیں:

(۱) کون آئیگا؟ (۲) کیا دوں گا؟

اشر کے صحیح معنی ہیں "وہ جو کہ ہے"۔ "ہمیشپاط کے دو معنی ہیں "صاحب عصا" یا شریعت والا"۔ اس طرح آخری جملہ کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "میں اس کو برسرِ اقتدار کروں گا جو صاحب حکومت و شریعت ہے"۔ یعنی بنو اسرائیل سے حکومت چھین لی جائے گی اور ان کی شریعت منسوخ ہو جائے گی۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اس بشارت میں شیلوہ (شیلون) سے مراد نہ حضرت موسیٰ ہیں اور نہ جناب عیسیٰ اس لئے کہ دونوں کے عہد میں ایک ہی شریعت پر عمل ہوتا رہا البتہ قرآن عزیز نے شریعتِ موسوی کو منسوخ کر کے بنی نوع انسان کے لئے ایک نئی شریعت پیش کی۔ علاوہ بریں صاحب عصا ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں۔ جناب مسیحؑ نے بالاعلان کہا "میری بادشاہت اس دنیا کی نہیں بلکہ آسمانی ہے" (یوحنا ۱۸: ۳۶) اس کے برخلاف جناب محمد رسول اللہ کو شریعت کے ساتھ ساتھ مادی و روحانی دونوں بادشاہتیں بھی ملیں اس لئے جناب یعقوب علیہ السلام کی پیشینگوئی بہ تمام و کمال آنحضورؐ پر صادق آتی ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)

(۶) جناب موسیٰ علیہ السلام کی بشارتیں:-

(۱) جناب یعقوب علیہ السلام کی طرح جناب موسیٰ علیہ السلام نے بھی کھلے الفاظ میں بشارت دی ہے۔ فرمایا "خداوند تمہارا خدا تمہارے لئے تمہارے ہی بیچ سے یعنی تمہارے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اس کی سننا" آگے اور وضاحت فرمائی "خداوند نے مجھ سے کہا میں تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام

ے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب ان سے لوں گا (استثناء باب ۱۸ آیات ۱۵ تا ۱۹) اس بشارت کے مطابق مثیلِ موسیٰ صرف آنحضورؐ ہیں جو بنی اسرائیل کے بھائی بنی اسمٰعیل میں مبعوث ہوئے۔ بنو اسرائیل میں استثناء باب ۳۴ آیات ۱۰ تا ۱۲ کے مطابق مثیلِ موسیٰ کوئی نبی پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اصل عبارت ملاحظہ ہو "اور اس وقت سے (یعنی موسیٰ کے بعد سے) اب تک بنی اسرائیل میں کوئی نبی موسیٰ کے مانند جس سے خدا نے روبرو باتیں کیں نہیں اٹھا"۔ اس ترجمہ میں لفظ "اب تک" عبرانی نسخہ کا غلط ترجمہ ہے۔ عبرانی عبارت "دِلُوقَامَ نَابِی عُودِ بِیَسرَ ائیلَ کَمُوشِہ" اس میں لفظ عود کے معنی "اب تک" کے بجائے "ہمیشہ" ہونا چاہیے۔ اسی طرح "دِلُوقَامَ" کے معنی بجائے ماضی کے فعل مستقبل میں ہونا چاہیے اس لئے کہ ازروئے گرامر "د" کی خاصیت یہ ہے کہ وہ فعل ماضی کے ساتھ آکر اس کو فعل مستقبل بنا دیتا ہے اس لئے صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "نہ قائم ہوگا کبھی (ہمیشہ ابداً) بنی اسرائیل میں کوئی نبی موسیٰ کی طرح (موسیٰ کی مانند یا جیسا)۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ توریت مقدس کی گمشدگی کے بعد جناب عزرا علیہ السلام نے لوگوں کی روایات کو لے کر اُسے دوبارہ تالیف کیا گویا بنو اسرائیل جناب موسیٰؑ کے ایک ہزار سال بعد بھی اپنے بھائیوں میں سے ایک ایسے نبی کی آمد کے منتظر تھے جو (۱) بنو اسرائیل میں سے ہوگا (۲) مثیلِ موسیٰ ہوگا۔ ان دونوں باتوں کی تردید جناب عزراؑ نے کی پھر بھی انھیں یقین نہیں آیا اور وہ "اس نبی" کی آمد کے منتظر رہے اور جناب عزراؑ (عزیرؑ) کے ۴۰۰ سال بعد یعنی جناب موسیٰؑ کے ۱۴۰۰ سال بعد جب یہودیوں نے جناب مسیحؑ کے ہمعصر ایک دوسرے نبی جناب یوحنا (یعنی یحییٰ علیہ السلام) سے دریافت کیا کہ کیا تو وہ نبی ہے؟ جس کی بشارت جناب موسیٰؑ نے دی ہے اس کا جواب انھوں نے نفی میں دیا (ملاحظہ ہو یوحنا باب ۱ آیۃ ۲۱)

جناب مسیحؑ کے بعد بھی حواریانِ مسیح میں "اس نبی" کا انتظار موجود تھا جیسا کہ پطرس حواری کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ پطرس نے جناب مسیحؑ کے ۳۳ سال بعد عیسائیوں کو مخاطب کر کے کہا۔

پس توبہ کرو اور متوجہ ہو کہ تمہارے گناہ مٹائے جائیں تاکہ خداوند کے حضور سے تازگی بخش ایام آویں اور وہ اس یسوع مسیح کو پھر بھیجے جو تمہارے واسطے مقرر ہوا ہے۔ ضرور ہے کہ وہ آسمان میں اس وقت تک رہے جب تک کہ وہ سب چیزیں بحال نہ کی جائیں جن کا ذکر خدا نے اپنے پاک نبیوں کی زبانی کیا ہے جو دنیا کے شروع سے ہوتے آئے ہیں۔ چنانچہ موسیٰؑ نے کہا کہ خداوند خدا تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لئے مجھ جیسا ایک نبی پیدا کرے گا جو کچھ وہ تم سے کہے اس کی سننا اور یوں ہوگا کہ جو شخص اس نبی کی نہ سنے گا وہ نیست و نابود کر دیا جائے گا بلکہ سموئیل سے لیکر پچھلوں تک جتنے نبیوں نے کلام کیا اُن سب نے ان دونوں کی خبر دی ہے (ملاحظہ ہو اعمال باب ۳ آیات ۱۹ تا ۲۴)۔

بنی اسرائیل جناب موسیٰ کی بشارت کے ان الفاظ سے کہ "خدا تمہارے بھائیوں میں سے مجھ جیسا ایک نبی پیدا کرے گا" آخر وقت تک مغالطہ میں گرفتار رہے (اور اب بھی ہیں) وہ یہ سمجھتے رہے کہ وہ آخری نبی بنو اسرائیل ہی میں سے ہوگا۔ اُن کا ذہن ادھر نہیں منتقل ہوسکا کہ آخر بنو اسمٰعیل بھی تو ان کے بھائی ہیں۔ توریت سے یہ ثابت ہے کہ حضرت اسحٰق کے بیٹے اور حضرت یعقوبؑ کے بھائی جناب عیسو نے حضرت اسمٰعیل (اپنے چچا) کی بیٹی مہلت سے شادی کی (پیدائش باب ۲۸: ۹ اور باب ۳۶ آیۃ ۳)۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ ان کو اپنا بھائی سمجھتے تھے۔ عربی کا "اخ" عبری میں "اح" یعنی بھائی چھ لحاظ سے استعمال ہوتا ہے:-

(۱) حقیقی بھائی کے لئے ماں باپ دونوں کی طرف سے یا صرف ایک جانب سے۔

(۲) قریبی رشتہ دار کے لئے (پیدائش باب ۴۲: ۱۳)۔

(۳) طبعی و وطنی بھائی کے لئے (ایضاً باب ۱۹: ۷)۔

(۴) نسل اور پیشہ کے لحاظ سے (نامہ کلسیون ۱: ۲)۔

(۵) مماثلت کے لحاظ سے ہم پیشہ و ہم مشرب کے لئے اور

وہ منہ بولے بھائی بہن کے لیے۔

لہذا یہ سمجھنا کہ عبرانی "اح" صرف حقیقی بھائیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے [illegible]
ہے۔ ایک دوسری جگہ توریت کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائی کون ہیں
جناب ہاجرہ کو خدا کا فرشتہ خطاب کرتا ہے: میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ
کثرت سے گنی نہ جائے .... تو حاملہ ہے اور ایک بیٹا جنے گی۔ اس کا نام اسمٰعیل رکھنا.....
بادیہ نشین عرب ہوگا۔ اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے۔ اور وہ
اپنے سب بھائیوں (بنو اسرائیل و بنو قطورہ) کے سامنے بود و باش کرے گا۔ (ملاحظہ ہو پیدائش
باب ۱۶ آیت ۱۲)۔

(ب) کاش کہ ہمارے یہودی بھائی توریت و انجیل نیز جناب پطرس کے وعظ کی روشنی میں حقیقت
پر غور کرتے تو لازماً اسی نتیجہ پر پہنچتے کہ وہ آخری نبی بجز جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اگر استثنا کی اس بشارت کو ملحوظ رکھتے
جس میں دعائے خیر دیتے وقت جناب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا "خداوند سینا سے آیا
اور وہ چمکے گا سعیر سے اور بہت شدت سے متجلی ہوگا کوہ فاران سے اور دس ہزار قدسیوں
کے ساتھ آئے گا اس کے داہنے ہاتھ میں آتشی شریعت ہوگی (استثنا باب ۳۳ آیۃ ۱، ۲) تو وہ
ہرگز مغالطہ میں نہ رہتے کیونکہ ظاہر ہے کہ وہ سینا پر جناب موسیٰ کو پیغمبری عطا ہوئی تھی سعیر پہ
جو بیت المقدس کے ایک پہاڑ کا عبرانی نام ہے۔ جناب عیسیٰؑ کا ظہور ہونے والا تھا اور فاران
از روئے بائبل باب پیدائش ۲۱ آیۃ ۲۱ حجاز کا مشہور میدان وادی غیر ذی زرع ہے جہاں
آنحضورؐ جلوہ گر ہوئے اور دس ہزار قدسیوں کی جماعت کے ساتھ مکہ کو فتح کیا۔ وہ ایسی شریعت
لے کر آئے جو عدل و انصاف کی ضامن ہے اور جس نے تمام گذشتہ شریعتوں کو منسوخ کر دیا
اتنی کھلی اور واضح نشانیوں کے بعد اگر یہودی بھائی آنحضورؐ پر ایمان نہیں لاتے تو اس کے
علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اللہ جس کو ہدایت دے اسی کو ہدایت ملتی ہے۔ المختصر توریت

مقدس میں کم و بیش ۲۰ نشانیاں اس قسم کی موجود ہیں جن سے آنحضورؐ کی افضلیت پر روشنی پڑتی ہے۔ انجیل میں بھی بے شمار نشانیاں ہیں جو نہ صرف توریت کی نشانیوں کی تصدیق کرتی ہیں بلکہ اور زیادہ کھلے الفاظ میں اللہ کے حبیب جناب محمد رسول اللہؐ کے متعلق بتاتی ہیں کہ وہ اور صرف وہی آخری نبی ایسے ہیں جن کی شریعت آخری شریعت ہے اور وہ تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے کسی خاص گروہ اور قبیلہ تک محدود نہیں اور وہی دنیا میں شانتی و امن کی ضامن ہے۔

جناب موسیٰ علیہ السلام کی پیشینگوئی میں اس بات کا بھی ذکر ہے کہ "وہ نبی" موسیٰ کی مانند یا موسیٰ کی طرح ہوگا۔ آنحضورؐ کی مماثلت جناب موسیٰ علیہ السلام سے اظہر من الشمس ہے۔ ذرا سی تاریخی نظر رکھنے والا انسان اسے اچھی طرح پہچانتا ہے کہ:

(۱) دونوں انبیاء کرام کو دشمنوں سے مجبور ہو کر ہجرت کرنا پڑی۔

(۲) آنحضور کی مدینہ منورہ میں مدت قیام ۱۰ سال ہے۔ جناب موسیٰ بھی دس سال یثرب (مدینہ) میں رہے (ملاحظہ ہو میثاق النبیین جلد اول ص۱۶۶ تا ۱۷۰)۔

(۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب مفصل دی گئی مگر آنحضرتؐ کو اکمل شریعت دیے جانے کے علاوہ اس کو بقائے دوام بھی بخشا گیا۔

(۴) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو استبداد فرعون سے نجات دلائی مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فراعنہ مصر کو دست بدست جنگ میں شکست دیکر ان کی اولاد کو مسلمان بنایا۔

(۵) یہودیوں اور مسلمانوں میں سال کا پہلا مہینہ تاریخ ہجرت سے شروع ہوتا ہے۔ مصر کو چھوڑتے وقت خداوند نے موسیٰ و ہارون سے کہا "یہ مہینہ تمہارے لئے مہینوں کا شروع ہوگا اور یہ تمہارے سال کا پہلا سال ہوگا (ملاحظہ ہو خروج ۱۲ : ۱)۔

(۶) دونوں کو اللہ سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہے۔

(۷) دونوں کو کفار سے جہاد کرنیکا حکم دیا گیا۔

(۸) حضرت موسیٰ کا مقصدِ جنگ سرزمینِ کنعان کو حاصل کرنا تھا جو آپ کے خلیفہ یوشع بن نون کے زمانے میں سر کی گئی۔ ملک کنعان کو آنحضور کے خلیفہ نے فتح کیا۔

(۹) حضرت موسیٰ اپنی قوم کے حکم (جج) تھے آنحضور مسلمانوں اور یہود دونوں کے جج تھے۔ اور دونوں کے مقدمات فیصل فرماتے تھے۔

(۱۰) حضرت موسیٰ کو فرعونیوں کے قریب پہونچ جانے پر پانی کی لہر نے بحکم خدا بچایا جبکہ غار ثور میں دشمن کے پہونچ جانے پر آنحضرت کے لئے تارِ عنکبوت نے فولادی قلعہ کا کام دیا۔

(۱۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے دشمن کو قریب دیکھ کر انا المدرکون کہا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تسلی دیتے ہوئے کہا "کلا ان معی ربی سیھدین" ایسا نہ ہوگا میرا رب میرے ساتھ ہے وہ مجھے کامیاب کرے گا۔ (۲۶: ۶۱، ۶۲)۔ آنحضرت نے بھی غارِ ثور میں دشمن کو قریب دیکھ کر فرمایا "لا تحزن ان اللہ معنا" اے میرے رفیق (ابوبکرؓ) غمگین مت ہو اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہے (۹: ۴۰)۔

اس طرح اور بھی نکات ہیں جو آنحضور کو جناب موسیٰ جیسا ثابت کرتے ہیں انہیں نظر انداز کرتے ہوئے بشارت کے آخری حصہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے داہنے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہوگی، عربی و عبرانی دونوں زبانوں میں "یمین" (داہنے ہاتھ) کا محاورہ برکت، بندگی، حکومت اور طاقت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے مسیحی دوست "داہنے ہاتھ میں آتشیں شریعت" کا مطلب شریعت باعث اطاعت و بندگی یا باعث عدل و انصاف ہوگی کے بجائے یہ نکالتے ہیں کہ جہاد اور مذہبی جنگ ہوگی۔ اور وہ ظاہر ہے کہ کشت و خون کا باعث ہوگی۔ اس مفہوم کا رد انبیاء کے صحف نے کبھی تو [illegible] اس (بنی موعود) کی کمان بدلی سے باہر نہ ہوگی" یعنی اس کی جنگ رحمت کی بدلی میں یا رحم [illegible] ہوگی (ملاحظہ ہو بشارت نوح)۔ اور کبھی یوں جواب دیا کہ "وہ جب ۱۰ ہزار قدوسیوں کے [illegible]

دیگا: یعنی اس کی فتح خونریزی سے نہ ہوگی، امن و [illegible] ہوگی (دیدہ ملاحظہ ہوں) اور جس جہاد کے اعتراض کی تردید یہ کہہ کر کی کہ اس کا [illegible] وعدل کا حکم ہوگا کسی پر ظلم نہ ہوگا۔ پیشینگوئی حضرت موسیٰؑ) تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ ایسا ہی ہوا فتح [illegible] وقت لاتثریب علیکم الیوم فرماکر عام معافی کا اعلان کر دیا گیا۔ تمام غزوات وسریات میں مجموعی طور سے اتنا بھی جانی نقصان نہیں ہوا کہ جتنا آج نیویارک وغیرہ بڑے شہروں میں ایک دن کے اندر حادثات کی وجہ سے ہوا کرتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد:۔

ہمارے یہودی بھائی حضرت موسیٰؑ کے بعد کسی کو پیغمبر نہیں تسلیم کرتے البتہ اس نبیؐ کے اب تک منتظر ہیں جو جناب موسیٰؑ کی پیشینگوئی کے بموجب آچکا اور دنیا کو شمع ہدایت کے نور سے نہ صرف منور کر چکا بلکہ منور کرتا رہے گا علماء کا بنیاد بنی اسرائیل کی شہادت اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت عیسیٰؑ تک ۱۴۰۰ سال کے اندر بہت سے انبیاء کرام بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے انھیں میں سے کچھ کا ذکر قرآن عزیز میں کیا گیا ہے اور کچھ کا پتہ احادیث شریف سے چلتا ہے۔ حضرت یوشعؑ، حضرت حزقیلؑ، حضرت الیاسؑ، حضرت الیسعؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت یونسؑ، حضرت ذوالکفلؑ، حضرت عزیرؑ (عزرا) حضرت ذکریاؑ حضرت یحییٰؑ (یوحنا)، وغیرہم علیہم الصلوٰۃ والتسلیم اپنے اپنے وقت پر تشریف لائے لیکن یہودیوں نے سب کو جھٹلایا جس کا عذاب انھیں سہنا پڑا۔ اس لئے آنحضورؐ کیلئے مزید شہادتیں پیش کرنے سے پہلے یہود کی تباہی وبربادی پر اجمالی تبصرہ ناگزیر ہے۔

یہود اور بیت المقدس کی تباہی:۔

حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے تفصیلی واقعات کو مطالعہ کرنے سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس قوم کے اندر ایک عجیب طرح کا تلون پایا جاتا ہے سرکشی، احسان فراموشی

فساد انگیزی، بغض و حسد، کج بحثی، ضد اور ہٹ ان کے قومی مزاج کا پایہ [illegible]
نہایت ضبط و صبر کے ساتھ ان کی ہر بیہودگی کو برداشت کرتے اور رشد و ہدایت کے کام
میں منہمک نظر آتے ہیں۔ پھر بھی قوم نصیحت نہیں پکڑتی۔ عبور قلزم کے بعد بت پرستی کی خواہش،
من و سلویٰ پر ناسپاسی، گئو پرستی میں انہماک، قبولِ توریت سے انکار، ارضِ [illegible]
داخلہ سے انکار، ذبحِ بقرہ کے سلسلہ میں حیل و حجت، غرض ہر فرض کی ادائیگی میں [illegible]
اور ہر معاملہ میں حضرت موسیٰؑ کے ساتھ جاہلانہ رد و کد کا ایک طویل سلسلہ ہے جو بنی اسرائیل کی
زندگی کا جز نظر آتا ہے۔ انھوں نے بالآخر انعام و اکرام خداوندی اور [illegible]
فراوانی کے باوجود خدا کے قہر و غضب کو سرمایۂ نازش بنا کر ہمیشہ کے لئے دنیا و آخرت [illegible]
سے محرومی کا داغ لگالیا۔ حضرت یرمیاہؑ، حضرت حزقیلؑ اور حضرت [illegible]
میں یہود کی سرکشی کی وجہ سے ان کی تباہی و بربادی کے متعلق [illegible]
نے سورۂ بنی اسرائیل میں ان کی تصدیق کی ہے۔

یہود کی پہلی شرارت اور اس کی پاداش کا معاملہ [illegible]
بابل کے بادشاہ بخت نصر نے بیت المقدس پر حملہ کیا اور اس کی اینٹ [illegible]
و ہیکل کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ یہود کو غلام بنا کر بابل لے گیا۔ حضرت [illegible]
ان کے ہمراہ تھے البتہ حضرت یرمیاہؑ کو چھوڑ دیا گیا اور وہ [illegible]
رہے۔ حضرت یسعیاہؑ نبی نے ۱۶۰ برس پہلے یہود کے بادشاہ [illegible]
سے آگاہ کر دیا تھا جبکہ بابل میں مردوک نامی بادشاہ [illegible]
آیۃ ۳ تا ۷) اسی طرح یرمیاہ نبیؑ نے بھی ۶۰ برس پہلے سے بیت المقدس [illegible]
پیشینگوئی کی تھی۔ ان دونوں پیشینگوئیوں کے ظہور سے قبل حضرت دانیالؑ [illegible]
دکھایا کہ جس میں شاہ فارس کو دو سینگ والے مینڈھے کی شکل میں دکھایا [illegible]
جبرئیل علیہ السلام نے یہ بتائی کہ وہ بادشاہ (تورین [illegible]) یا اور فارس دونوں [illegible]

اس مکاشفہ میں یہ بھی دیکھا کہ ایک سینگ والے بکرے نے مینڈھے کو مغلوب کر دیا ہے اس کی تعبیر یہ تھی کہ ایک زبردست بادشاہ (سکندر رومی) ایران کی بادشاہی کا خاتمہ کر کے اس پر قبضہ کرے گا۔ یرمیاہ نبیؑ کی یہ بھی پیشنگوئی تھی کہ یہود ستر برس تک بابل کے بادشاہ کی غلامی کریں گے (یرمیاہ باب ۲۵ آیات ۱۱۔۱۲) ان کا نجات دہندہ خورس ہوگا۔ وہ خدا کا چرواہا اور بنی اسرائیل کا نجات دہندہ ہوگا (یسعیاہ باب ۴۴ آیات ۲۶۔۲۸)۔

۶۲۵ قبل مسیح ایران میں قبائلی طرز حکومت تھا۔ ایران دو حصوں میں تقسیم تھا۔ شمالی مغربی میڈیا اور جنوبی حصہ پارس کہلاتا تھا۔ یہ دونوں ریاستیں نینویٰ کے زیر اثر تھیں ۶۱۲ ق م میں نینویٰ برباد ہو گیا اس کی جگہ بابل کی حکومت کو فروغ ہوا جس نے بیت المقدس کو مسمار کر دیا۔ ۵۵۹ ق م میڈیا اور پارس کی متحدہ ریاست کا مالک خورس ہوا۔ خورس عبرانی فارسی میں ارش (گورش) یونانی میں سائرس اور عربی میں کیخسرو کے نام سے مشہور بادشاہ ہے یہودی و یونانی خوب واقف ہیں کیونکہ ان قوموں پر اس کی حکومت کے اثرات بہت نمایاں ہیں اس نے بخت نصر کے جانشین نابونی دس اور اس کو [illegible] کو شکست دے کر بابل پر قبضہ کر لیا۔ اس نے بنی اسرائیل کو قید غلامی سے رہائی دی اور بیت المقدس کو دوبارہ آباد کرنے کی اجازت دی۔ اس کام میں حکومت نے پوری مدد دی۔ خورس کے بعد اس کے بیٹے کیقباد (کمبوجیہ) نے آباد کاری کا کام جاری رکھا [illegible] سال کے بعد خورس کا چچا زاد بھائی دارا اول جانشین ہوا اس کے عہد میں یہ کام [illegible] بنی اسرائیل میں اس کام کی نگرانی حجی، زکریا، دانیال اور عزیر علیہم الصلوٰۃ والسلام [illegible] بیت المقدس پھر آباد ہو گیا اور توریت کو حضرت عزیرؑ نے روایات اور اپنی یادداشت سے مدد لے کر دوبارہ قلمبند کر دیا۔ اس طرح پہلا دور ختم ہو گیا۔

یہود دوبارہ بیت المقدس میں آباد ہونے کے بعد عیش و عشرت میں پڑ گئے، اللہ بھول گئے اور ان میں وہی پرانی سرکشی پھر عود کر آئی۔ ان کو اللہ کے نبیوں نے ہر چند منع

کیا لیکن وہ باز نہیں آئے، ان کی تکذیب کرتے رہے۔ یہی نہیں بلکہ اپنی خواہشات ہی کو بذریعہ تاویل دین سمجھتے رہے۔ خدا معلوم کتنے انبیاء وصلحاء کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کئے آخر میں حضرت یحییٰ (یوحنا) اور زکریا کو قتل کر دیا اور حضرت مسیح کو بھی قتل کرنے کا عزم ارادہ کر لیا۔ اس پر غیرتِ حق کو حرکت ہوئی اور انھیں پھر ذلیل ہونا پڑا۔ وہ اس طرح کہ ان میں آپس میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ یہ واقعہ رفع عیسیٰ کے ستر سال بعد شروع ہوا۔ دو مدعیانِ حق یوحنان اور شمعون کے درمیان معرکہ جنگ وجدال برپا ہوا۔ یہ دو فریق قریشی اور صدوقی تھے۔ یہودیوں کے بادشاہ نے یوحنا کا ساتھ دیا۔ فریقِ مخالف کو بلا امتیاز مرد و عورت، بوڑھے بچے ایک طرف سے تہ تیغ کیا اس پر بادشاہ روم اسنبانوس سے مدد مانگی گئی۔ بادشاہ نے اپنے بیٹے طیطوس (ٹیٹس) کو فوجِ جرار کے ساتھ ارضِ مقدس بھیجا۔ اس نے امن وامان قائم کرنے کے لیے پیامِ صلح ایک قاصد نیقانوس کو دیکر بیت المقدس بھیجا، جس کو قتل کر دیا گیا۔ ٹیٹس نے طیش میں آکر یہودیوں کے قتلِ عام کا حکم دیا۔ بیت المقدس کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا۔ ہزارہا یہودی مارے گئے اور جو بچے وہ اپنی جان لے کر ادھر ادھر بھاگ گئے۔ غرض یہ وہ شکست تھی کہ یہودی پھر پنپ نہیں سکے۔

(باقی آئندہ)

اسلامی شریعت میں چند زوجگی کی اباحت

تنقید وجواب ـ مضرت ومنفعت

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

چند زوجیت کے قانون پر تنقید کے محرکات

عرصۂ دراز سے شریعت اسلامی کے جن قوانین پر طرح طرح کے اشکالات بلکہ اعتراضات کئے جا رہے ہیں غیروں ہی کی طرف سے نہیں کچھ "اپنوں" کی جانب سے بھی۔ ان میں غالباً یہ مسئلہ سر فہرست ہے۔ اس سلسلہ میں اکثر تو جذباتی باتوں اور فرضی افسانوں کا سہارا لے کر تنقید کی جاتی ہے اور بعض مرتبہ شریعتِ اسلامی کے ـ پر مصلحت اور فطرتِ انسانی کے عین مطابق اس قانون سے ناجائز فائدہ اٹھانیوالوں اور بعض اسلام کے نام لیواؤں کی شخصی غلطی بھی۔ نفس قانون پر اعتراض کرنے اور اغیار کو طعنہ زنی کا موقعہ فراہم کر دیتی ہے۔ حالانکہ بہتر سے بہتر قانون کے عمل درآمد کے بعد جزوی قسم کے نامناسب اثرات کا ظاہر ہونا۔ ایسی واضح اور پیش آمدہ حقیقت ہے کہ اس سے انکار کی مجال مشکل ہے۔ اس لئے اس طرح کی چھوٹی موٹی صورتوں کے پیش آجانے سے کسی عقلمند کے نزدیک اس قانون کی افادیت ختم نہیں ہو جاتی ہے لیکن جب "مقصد تنقید برائے تنقید" ہی ہو، یا پورے قانون کا بنظر غائر مطالعہ نہ کیا ہو تو ایسی معمولی چیزیں بھی پہاڑ نظر آنے لگتی ہیں اور ہر خوبی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے، جس کے نتیجہ میں ذہن صرف اعتراضات کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ بدقسمتی سے یہی وجہیں تعدد ازدواج پر اعتراضات کرنے کی محرک ہیں۔

پہلا طرزِ فکر:۔ کہ جن کا مقصد محض تنقید ہے اور کچھ نہیں۔ کے سامنے کسی بھی طریقہ سے

صورت حال پیش کرنا غیر مفید اور لا حاصل ہے۔ ہاں وہ لوگ کریں کی تنفید کا اصل سبب یہ ہے کہ انھوں نے مسئلہ کو پوری طور پر تمام گوشوں سے سمجھا نہیں ہے۔ آئندہ سطریں ان کو شاید کسی صحیح راہ تک پہونچانے کا ذریعہ بن جائے۔ واللہ الموفق للسداد۔

عقدِ ثانی کے لئے شرعی پابندیاں :۔

اوّل تو عام طور پر۔ تنقیدی حلقوں میں ۔ یہ سمجھا جاتا ہے۔ یا ایسا تاثر دیا جاتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس سمجھنے کا باعث کسی خدا ترس مسلمان یا کچھ مسلمانوں کا طرزِ عمل ہی ہو ۔ کہ چند بیویاں رکھنے کی اجازت بغیر کسی خاص پابندی کے ہے۔ حالانکہ اسلامی قانون کا معمولی طالبِ علم بھی جانتا ہے کہ جس آیت سے چند بیویاں رکھنے کا جواز نکلتا ہے اسی میں جواز کے ساتھ یہ بھی موجود ہے فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ لَا تَعُوْلُوْا[1] پس اگر تم کو غالب احتمال ہو کہ (اگر کئی بیبیاں کر کے) عدل نہ رکھوگے (بلکہ کسی بی بی کے حقوق واجبہ ضائع ہوں گے) تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو۔

(بیان القرآن ۹۳/۲ج)

چنانچہ علماء امت نے نکاح ثانی (ما بعد) کے بارے میں بالخصوص اور ہر نکاح کے سلسلہ میں بالعموم حقوقِ زوجیت (ایک ہی ہے تو اسی ایک کے اور چند ہیں تو ان سب کے) ادا کرنے کی اہلیت کو ضروری قرار دیا ہے، ورنہ نکاح گناہ اور عنداللہ قابلِ مواخذہ فعل ہوگا۔ (آخرت پر عقیدہ رکھنے والے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز باز رکھنے والی نہیں ہو سکتی اور اگر آخرت پر عقیدہ نہیں ہے تو دنیاوی سخت سے سخت سزا کا قانون بھی روکنے کا باعث عموماً نہیں ہوا کرتا۔ جیسا کہ آئے دن مشاہدہ ہوتا رہتا ہے)

دیکھئے مشہور مالکی عالم محی الدین ابن عربی نقل فرماتے ہیں :۔

قال علماءنا معناه (فان خفتم ان لا تعدلوا) فی القسم بین الزوجات والتسوية فی حقوق النكاح وهو فرض ..... واخذ الخلق بلغت الى الظاهر

[1] سورۃ النساء آیۃ ۳ ۔

فيجب على الحاكم فاذا افتقر الرجل من ماله ومن بنيته على نكاح اربع فليفعل واذا لم يحتمل ماله ولا بنيته في الباءة فليقتصر على ما يقدر عليه[1]

یہاں پر تعدد ازواج کو بہت محدود صورتوں میں درست سمجھنے والوں یا بالفاظ صحیح تعدد کے مخالفین کے اس مطالبہ کا ذکر، بے محل نہ ہوگا کہ جہاں عدل بین الزوجات میں کوتاہی کا خطرہ ہو، وہاں دوسرا نکاح کرنے پر پہلے ہی سے پابندی لگادی جائے بلکہ بعض تو یہاں تک کہہ گزرے کہ اس نکاح کو سرے سے منعقد ہی نہ مانا جائے۔ اس جگہ یہ سوال کرنا بالکل حق بجانب ہوگا کہ ایسا کون سا پیمانہ یا آلہ ہے کہ جو اس "خطرہ" (اگر اس پیشگی بڑھے ہوئے احساس کو خطرہ کہنا درست ہو) کا قبل از وقت صحیح اندازہ کرکے اطلاع دیدیا کرے کہ یہ شخص دوسری بیوی کے آنے کے بعد بحیثیت ظالم بن جائیگا۔ لیکن وہی پیمانہ یا آلہ عقد اول کے وقت کسی شخص کے آئندہ اپنی منکوحہ پر ظلم کرنیکا پیشگی پتہ نہ چلاسکے، ظاہر ہے کہ نکاح سے قبل دونوں جگہ ہی یہ احتمال ہے کہ یہ شخص ہونیوالی منکوحہ کے ساتھ اچھا سلوک اور "(عاشروھن بالمعروف) کے تقاضے پورے کرے گا کہ نہیں۔؟

اس منطق کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیئے کہ پہلی شادی کے وقت بھی اگر کسی شخص کے بارہ میں یہ خطرہ ہے کہ وہ حقوقِ زوجیت ادا نہیں کرے گا یا نہ کرسکے گا تو اس کے لئے قانوناً نکاح ممنوع ہو، حالانکہ سب جانتے ہیں کہ پہلے نکاح کے وقت یہ سوال کسی حلقہ کی طرف سے نہیں اٹھایا گیا۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ عقدِ ثانی کے وقت ہی اس کا ہوّا کھڑا کیا جائے۔ بس سیدھی بات وہی ہے جو شریعت کے رمز شناسوں نے بیان کی ہے کہ جس شخص کو اپنے بارے میں یہ خطرہ ہو کہ وہ نکاح کے بعد (خواہ اوّل ہو یا ثانی) منکوحہ کے حقوق ادا نہ کرسکے گا اور اس سے ظلم سرزد ہوگا تو اس کے لئے نکاح کرنا ممنوع اور گناہ کی بات ہے۔ اس امر کی متعدد فقہاء نے

[1] احکام القرآن ۱/۱۳۰۔

تصریح کی ہے مثلاً مشہور حنفی عالم محقق ابن ہمام فرماتے ہیں :۔

فان عارضه (خوف الجور) کره .... والذی یخاف الجور یاثم [1]

اسی طرح فقہ حنفی کی شہرۂ آفاق کتاب در مختار اور اس کی شرح رد المحتار میں ایسے نکاح کے بارے میں ہے :۔

(ومکروھا) ای تحریما (لخوف الجور فان تیقنه حرم ذلك) ای تیقن الجور حرم لان النکاح انما شرع لمصلحة تحصین النفس وتحصیل الثواب و بالجور یاثم ویرتکب المحرمات فتنعدم المصالح لرجحان هذه المفاسد [2]

چونکہ اپنے حالات اور رجحان طبع کو ہر شخص خود جس قدر جانتا یا جان سکتا ہے کوئی دوسرا نہیں جان سکتا۔ اس لئے شریعت نے ہر شخص کو عند اللہ مسئول ہونیکا شعور دے کر اس پر ذمہ داری ڈال دی ہے کہ وہ اپنے حالات کے تحت خود فیصلہ کرے، اور اس طرح اپنی طرف سے نکاح پر کوئی قانونی پابندی عائد نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام علماء کے نزدیک نکاح ثانی کے لئے عدل بین الزوجات کا اطمینان ایسی شرط نہیں ہے کہ اس کے پیشگی حاصل کئے بغیر نکاح ہی صحیح نہ ہو بلکہ سب کے نزدیک نکاح ثانی منعقد ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ ابن عربی نے نقل کیا ہے۔

دلیل خطاب هذه الأیة ساقط بالاجماع فان کل من علم انه یقسط للیتیمة جاز له ان یتزوج سواها کما یجوز له اذا خاف ان لا یقسط [3]

عدل نہ کرنیکی صورت میں علیحدگی کا اختیار :۔

ہاں اگر نکاح کے بعد زوجہ پر (خواہ وہ کوئی بھی ہو) ظلم کیا یا حقوق ضروریہ ادا

---

[1] فتح القدیر، ۴/۲ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ۔

[2] در مختار مع رد المحتار ۲/۲۶۱۔

[3] احکام القرآن لابن العربی ۱/۱۳۹۔

نہیں گے یا بیویوں کے درمیان واجب مساوات نہیں برتی تو اس وقت مظلوم بیوی کو یہ حق ہوگا کہ وہ شوہر سے گلو خلاصی کرے، اور قانون شریعت ۔ اگرچہ حنفی فقہ کی رو سے تو نہیں لیکن ایسے موقعوں پر احناف کو بھی مالکیہ کا مذہب اختیار کرلینے کی اجازت جسے دی گئی ہے ۔ میں ضروری اطمینان حاصل کرلینے کے بعد اور بعض مخصوص شرطوں کے پائے جانے کی صورت میں مرد سے علیحدگی کا عدالتی فیصلہ لینے کا، عورت کو حق دیا ہے ۔ ان تمام تفصیلات اور قانونی مراحل کا بیان نہ اس وقت مقصود ہے نہ ضروری اس کے لئے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "الحیلۃ الناجزۃ" دیکھی جائے[1] یہاں پر صرف ایک مختصر عبارت مالکی عالم کی نقل کی جاتی ہے :۔

اذا کانت الاساءۃ من قبل الزوج فرق بینھما[2]

ان تفصیلات کے سامنے آجانے کے بعد یہ مطالبہ بھی بالکل بے معنی ہوجاتا ہے کہ" نکاح ثانی کرنے سے ہی زوجۂ اول کو فسخ کا اختیار دے دیا جائے محض اس وہم کی بنیاد پر کہ ایسا شخص لازماً عدل نہیں کریگا، حالانکہ ذرا سا غور وفکر کیا جائے تو معلوم ہوجائے کہ یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے اس لئے شریعت محض نکاح ثانی کرلینے سے کسی کو مجرم قرار نہیں دیتی ۔ اور قبل جرم سزا دینا کیسے درست ٹھہرایا جاسکتا ہے ۔؟

تعدد کی اباحت کے بارہ میں بعض ناقدین کے اقوال :۔

اس گروہ کے ممتاز افراد جنھیں اپنے بارے میں اسلامی قوانین سے واقفیت کا گمان ہے ۔ ان کی طرف سے یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ تشریع محمدی کا رخ یک زوجگی سے آگے بڑھ کر چند زوجگی کی اباحت کا نہیں بلکہ مروج اباحت مطلقہ کو محدود کرنیکا ہے مگر یہ محض دعویٰ ہے جو دلیل کا محتاج ہے بلکہ شاید یہ کہنا مبالغہ سے خالی نہ ہوگا کہ ٹھیک اس دعوے

---

[1] حیلۂ ناجزہ ص ۸۱-۸۲ ۔ [2] احکام القرآن لابن العربی ۱۰۸/۱

پر شریعتِ اسلامی کے مآخذ سے کوئی صحیح دلیل قائم کرنا مشکل ہے، کیونکہ اس دعویٰ کی تائید نہ قرآن کی آیتِ تعدد اس کے سیاق و سباق سے ہوتی ہے نہ احادیثِ رسول سے اور نہ سابقین امت کے اقوال سے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس کے برخلاف آیتِ قرآنی۔ فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ [1] میں جس انداز سے تعدد کا حکم مذکور ہوا ہے اس سے وسعت اور تعدد کی اباحت کے رجحان ہی کا پتہ چلتا ہے، نہ کہ تنگی اور محدودیت کا جیسا کہ دیگر قرآن فہم حضرات کے علاوہ — عصرِ قریب کے مشہور راسخ نظر مفسر علامہ آلوسی نے بھی محسوس کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

مایشعر بہ السیاق من التوسعۃ .... وجہ اشارۃ مبذ اللہ انہ اطلق قولہ سبحانہ (ماطاب لکم من النساء) ثم جاء (مثنیٰ وثلاث و رباع) کانہ بیان لما وقع اطلاقہ علی نوع من التقیید .... ولکان المراد التضییق لکان التقیید من الاول اوقع فیہ وامس بہ [2]

یہاں پر اس واقعہ کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ — موجودہ مغرب زدگی کے دور سے قبل۔ جمہور اہلِ حق علماء و فقہاء کے علاوہ دیگر بعض "عالموں" اور "فقیہوں" سے ازواج کی تعداد کو چار میں منحصر ہونے کے خلاف آیت سے استدلال کیا۔ چنانچہ کسی نے

---

[1] سورۃ النساء۔ آیۃ ۳ -

[2] روح المعانی حاشیہ ۴/ ۹۵ ، مطبوعہ دیوبند -

ع۔ اس بارہ میں ابوداؤد و دارقطنی وغیرہا میں تخریج کردہ غیلان ثقفی کی روایت اور ان کے متعلقہ سے استدلال بھی غیر مفید ہے کیونکہ اس واقعہ سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ چار سے زیادہ بیویوں کا رکھنا ممنوع ہے، سو جو یہ چاہتے ہیں ...

۹، کسی نے ۱۸، اور کسی نے بلا قید ہر تعداد کی اباحت کو آیت سے مستنبط کر لیا ہے۔ کیونکہ آیت سے فی الجملہ وسعت کا رجحان معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ بات عربی زبان کی مہارت رکھنے والوں پر مخفی نہیں ہے۔ اس بنا پر جمہور علماء نے اپنے مسلک کے اثبات کے لئے اجماع پر زیادہ بھروسہ کیا ہے اور یہی سب سے زیادہ قوی دلیل ہے۔ اس بارے میں بحث کی گئی ہے۔ علامہ آلوسی نے اس مبحث کو خاصی تفصیل سے کئی صفحہ میں بیان کیا ہے (از ص ۱۹۱ تا ص ۱۹۳) اور اپنا یقین جمہور علماء کا مسلک ثابت کرتے ہوئے آخر میں فرمایا ہے :۔

اقول الامرین المعتمد علیہما فی الحصر الاجماع فانہ قد وقع وانقضیٰ عصر المجمعین قبل ظہور الاختلاف [1]

علاوہ ازیں یہ کہ بر سبیل تنزل اگر بلا دلیل (بلکہ خلاف دلیل) یہ بات مان بھی لی جائے کہ نزول آیت کا سبب یا شریعت کا منشا مروج اباحت مطلقہ کو محدود کرنا ہو، تب بھی یک زوجگی پر مجبور کرنے اور تعدد پر قانونی پابندی لگانے کا کسی طرح جواز نہیں نکلتا کیونکہ یہ امر عند العلماء مسلم ہے کہ مشروعیتِ حکم کے وقت کسی خصوصی سبب کے وجود کے معنیٰ لازماً یہ نہیں ہوتے کہ وہ حکم اسی خاص سبب تک محدود ہے۔

(العبرۃ لعموم المعانی لا لخصوص الموارد [2]) یہی بات شیخ ابوبکر الجصاص الرازی نے بھی ایک موقعہ پر ارشاد فرمائی ہے :۔ لو نزلت علی سبب خاص لم یوجب ذلک تخصیص عموم اللفظ بل الحکم للعموم دون السبب عندنا فنزولہا علی سبب ونزولہا مبتدأۃ من غیر سبب سواء [3] غرض کہ دونوں گروہ افراط اور تفریط میں مبتلا ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو جمہور علماء نے اختیار کی کہ چار سے زیادہ کا

---

[1] روح المعانی مع حاشیہ ۴/۹۵ مطبوعہ دیوبند۔

[2] نور الانوار ملا احمد جیون۔ [3] احکام القرآن جصاص ۲/۷۰۔

جواز نہیں اور ایک سے زیادہ چار تک ممنوع نہیں۔

اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز اور عجیب تر اور قرآن فہمی سے بعید کا ایک دوسرا قول یہ قول ہے کہ "آیت میں صرف یتیم بچیوں کے ساتھ نکاح میں تعدد کی اباحت کا جواز ہے اور وہ ان کی سرپرستی کا ایک حل ہے، نہ کہ دوسری عورتوں سے تعدد کے جواز کا حکم"۔

حالانکہ خود صاحبِ وحی صلی اللہ علیہ وسلم کہ جن پر قرآن مجید نازل ہوا ہے اور جن کا اصل منصب قرآن مجید کی آیات کی تشریح و تفسیر ہے، (لتبین للناس ما نزل الیہم[1]) ان سے براہِ راست مستفید ہونے والے بتاتے ہیں (جو صحیح سندوں کے ساتھ معتبر ترین کتابوں میں منقول و موجود ہے) اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہے کہ دراصل یتیم بچیوں کے ساتھ نکاح کرکے ہی ان بچیوں پر ظلم کیا جاتا تھا، اس طرح پر کہ مال کی حرص و آز کا شکار افراد یتیم مالدار بچیوں سے نکاح محض ان کے مال و جائداد پر قبضہ کرلینے کی غرض سے کر لیا کرتے تھے اور حقوق زوجیت ادا کرنا نہ ان کے پیش نظر ہوتا تھا اور نہ انہیں ایسی بے یار و مددگار بیویوں کی طرف سے حقوق طلبی کے دعویٰ کا کسی جانب سے ڈر ہوتا تھا۔ اس لئے ایسی خودغرضانہ شادیوں کہ جن بس یتیم بچیاں کنگال بنا کر چھوڑ دی جائیں ـــــ سے روکا گیا ہے اور کہا گیا کہ ان بچیوں کے علاوہ سارے عالم میں بہت عورتیں موجود ہیں ان سے حسب پسند نکاح کرو ایک چھوڑ چار سے کرسکتے ہو۔ یہاں حدیث کی سب سے زیادہ صحیح اور مقبول کتاب "بخاری" سے صرف ایک حدیث نقل کی جاتی ہے:۔

عن ابن شہاب قال اخبرنی عروۃ بن الزبیر انہ سأل عائشۃ عن قول اللہ تعالیٰ وان خفتم الا تقسطوا فی الیتٰمیٰ فقال یا ابن اختی ھذہ الیتیمۃ

---

[1] سورۃ نحل۔

تکون فی حجر ولیہا تشرکہ فی مالہ ویعجبہ مالہا وجمالہا فیرید ولیہا ان یتزوجہا بغیر ان یقسط فی صداقہا فیعطیہا مثل ما یعطیہا غیرہ فنہوا عن ان ینکحوھن الا ان یقسطوا لھن ویبلغوا لھن اعلی سنتھن فی الصداق فامروا ان ینکحوا ما طاب لھم من النساء سواھن [1]

اور یہ بات تقریباً تمام معتبر مفسرین نے نقل کی ہے [2]

صرف ان احادیث سے ہی نہیں قرآن مجید کے سیاق سے بھی یہی مطلب نکلتا ہے اس کے علاوہ اور کچھ نکلنا تکلف سے خالی نہیں. کیونکہ اس سے پہلی آیت میں یتیموں کا مال ان ہی کو سپرد کر دینے کا حکم مذکور ہے۔ (وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ الخ) پھر اپنے مال اور ان کے مال کو (از راہِ فریب) گڈمڈ کر کے استعمال کرنے سے منع کیا گیا اور اس کو بہت بڑا گناہ بتایا گیا ہے (وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ إِنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا) اس کے بعد پھر وہ آیت ہے جس میں تعددِ ازواج کا حکم مذکور ہے. یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ کلام اللہ تعالیٰ کا مفہوم اگر وہی ہوتا جو مذکورہ لوگوں نے بیان کیا ہے تو آیت میں فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ کے بجائے "منھن" یا اس جیسا کوئی اور کلمہ ہوتا جیسا کہ اس کے بعد والی آیتوں میں یتیموں کے اموال کے سلسلہ میں ایسا یعنی (اسم ظاہر کے بجائے اسم ضمیر) موجود ہے مثلاً وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ کے بعد ہے — فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا، کیونکہ یہاں پر دونوں جگہ ایک ہی قسم یعنی یتیم ہی مراد ہیں اس لئے ایک جگہ اسم ظاہر آیا اور دوسری جگہ اسم ضمیر، عربیت کا تقاضا یہی ہے. اسی طرح آیتِ اباحتِ تعدد میں بھی اگر وہی یتیم

---

[1] بخاری، ۲/ ۶۵۸ - مطبوعہ رحیمیہ دیوبند -

[2] تفصیل کے لئے دیکھیے تفسیر ابن کثیر ص ۵/ ۴۹۹ ج ۱، در منثور ص ۱۱۸، ۱۱۹ ج ۲، تفسیر مظہری ص ۲۶۵ ج ۲، تفسیر کبیر ص ۱۳۲ تا ۱۳۹ ج ۹، احکام القرآن للجصاص ص ۵۰ تا ۵۴ ج ۲، احکام القرآن لابن العربی ص ۱۲۹ ج ۱ -

بچیاں مراد ہوں جن کے بارہ میں فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی کہا گیا ہے ...
نہ ہوتا جو اس وقت ہے، بلکہ ایسا ہوتا جیسا اوپر کی سطروں میں ذکر ہوا اس بنا پر ...
مفسرین نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے یہ بات بصراحت کہی ہے کہ ان یتیم ...
دوسری عورتوں سے نکاح کرو[1] اور حدیث مذکور میں بھی من النساء کے بعد سوا من
موجود ہے۔

تعدد ازواج کی حکمتیں :-

ویسے تو خدائی احکام کے تمام مصالح اور ان کی سب حکمتوں کا ادراک انسان کی دسترس سے باہر ہے اسی وجہ سے وہ اس کا مکلف نہیں کیا گیا با ایں ہمہ انسان کی معمولی عقل اور تھوڑی سی سمجھ میں جو کچھ آجاتا یا آسکتا ہے (اگرچہ ضروری نہیں کہ اس پر حکم کا مدار ہو اور نہ ایسا خیال ہی کرنا چاہیئے کہ بس یہی حکمت وسبب ہے) اسے پیش کر دینے میں چنداں مضائقہ نہیں۔ (کہ پہلے بھی بہت سے محتاط لوگوں تک نے بھی ایسا کیا ہے بالخصوص) اس غرض سے کہ اس حکم میں سراسر برائی دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے کچھ خوبیاں بھی آجائیں۔

تعدد ازواج کی ذیل میں وہ مصلحتیں اور حکمتیں پیش کی جارہی ہیں جو معمولی غور و فکر سے ہی سامنے آجاتی ہیں۔ ان میں سے بعض عارضی اور وقتی نوعیت کی ہیں اور بعض مستقل اور ابدی حیثیت کی حامل۔

(۱) مردوں سے عورتوں کا تناسب بڑھ جانے کی صورت کا مناسب حل یہی ہے، ورنہ

---

[1] حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمۂ قرآن مجید کے اندر ہی اس بات کی رعایت کر دی ہے۔ فرماتے ہیں:۔ اور اگر ڈرو کہ انصاف نہ کر سکو گے یتیم لڑکیوں کے حق میں تو نکاح کر لو جو اور عورتیں تم کو خوش آئیں دو دو تین تین چار چار۔ اسی طرح حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنے تشریحی نوٹ میں اسی بات کو خوب واضح کر دیا ہے۔ یاد دیکھئے فوائد مولانا رحمۃ اللہ موصوف نساء

والی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ہے (قیامت کے قریب عورتوں کی اکثریت ہوجانے کی (احادیث میں پیشینگوئی بھی کی گئی ہے اور اب حالات دیکھئے نیز مختلف ممالک کے اندر مرد وزن کی تعداد کے تناسب سے یہ پیشینگوئی جلد ہی صادق ہوتی نظر آرہی ہے۔

(۲) بیوہ اور مطلقہ عورتوں کی بآسانی شادی ہوجانے کی امید، کیونکہ عقدِ ثانی کے وقت عموماً وہ شرطیں نہیں لگائی جاتیں جو عقدِ اول کے وقت مرد لگایا کرتے ہیں اور اس وقت ان کی پسند کا معیار بھی نسبتاً پست ہوجاتا ہے۔ اس صورت حال کو سامنے رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ اچانک طلاق ہوجانے کی وجہ سے بسا اوقات جو مہیب تنگیاں وجود میں آجاتی ہیں۔ کہ عورت دیکھتے دیکھتے بے یار و مددگار بن جاتی ہے۔ اس دشواری کا بھی ایک حد تک حل، اباحتِ تعدد میں ملتا نظر آتا ہے۔

(۳) بدصورت، نادار اور اسی طرح وہ عورتیں جن کا عقد موجودہ زمانہ میں مشکل ہوتا ہے۔ ان کی شادی ایسے مردوں سے ہوجانا نسبتاً آسان ہے جن کے یہاں پہلے سے بیوی موجود ہے۔ اور کسی ضرورت سے وہ عقدِ ثانی کے خواہشمند ہیں۔ اس طور پر اس ایک اہم مشکل کا حل بھی اس میں ہے۔

(۴) جنگ یا ایسے ہی کسی دوسرے ہنگامی زمانہ میں بیوہ یا بے سہارا ہوجانیوالی شریف عورتوں کو بے راہ روی سے بچانے اور ان کی کفالت کا سامان۔

(۵) خوشحال، تندرست اور خوش خوراک مردوں کی جنسی خواہش کی تکمیل عموماً ایک بیوی سے ہوجانا ممکن نہیں۔ اس لئے ایسے لوگ بے راہ روی کا شکار ہوجاتے یا ہوسکتے ہیں۔ ان کے لئے نکاح ثانی گویا ان کی ضرورت کا سامان اور صحیح راستہ۔

(۶) مستقل بیمار یا عقیم عورتوں کے شوہران کی جائز بلکہ ضروری اور فطری خواہش پورا کرنے کی صحیح راہ اور شدید ضرورت، جس کا لحاظ نہ کرنا ان پر ظلم۔ یہ اور ان کے علاوہ اور بہت سی مصلحتیں ہیں جن کا احاطہ مشکل ہے بایں ہمہ اس بات کے امکان کا انکار نہیں کہ اس اباحت کے کچھ مضر پہلو بھی

وقت ہی فیصلہ کیا جائے، معمولی صورتوں میں نہیں۔

یہ پہلے گزر چکا ہے کہ عدل نہ کرنے اور حقوقِ زوجیت پورے ادا نہ کرنے کی صورت میں فسخ کا موقع حاصل ہو جائے گا۔

مرد و زن کی مساوات کا نعرہ :-

بعض گوشوں سے تعدد ازواج کے خلاف "دلائل" کی فہرست میں اضافہ کے طور پر اقوامِ متحدہ کے چارٹر۔ کہ جس میں مرد و زن کی مساوات تسلیم کی گئی ہے۔ کی دہائی بھی سنائی دیتی ہے لیکن ذرا ان لوگوں سے کوئی پوچھے کہ کیا یہی معنی مساوات کے ہیں کہ بلا استثناء ہر موقع پر۔ ان کے صنفی اور خلقی فرق کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی۔ مرد و زن کے درمیان یکساں معاملہ کیا جائے! اگر جواب اثبات میں ملے تو دوسرا سوال یہ ہو کہ بتاؤ! تم نے ایسی مساوات کہاں برتی؟ اور اعداد و شمار کی روشنی میں جواب طلب کیا جائے کہ تمہارے یہاں یعنی (یورپ میں) اعلیٰ عہدہ پر فائز ہونیوالوں میں مردوں اور عورتوں کا کیا تناسب ہے؟ کتنی عورتیں اب تک وزیرِ اعظم بنائی گئیں؟ کتنی فوج کی اعلیٰ عہدیدار؟ کتنی کمانڈر انچیف؟ کتنی پائلیٹ؟ اور جانے دیجیے، صرف یہی بتا دیجیے کہ فوج کے اندر کتنے بڑے عہدوں پر نہیں، معمولی ہی عہدوں پر کتنی عورتیں فائز کی گئی ہیں؟ یقین رکھنا چاہئیے! جواب دیا تو یہی ہوگا کہ ——— ایک بھی نہیں !!! —

اسی بنا پر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مرد و عورت کے خلقی تفاوت صنفی فرق اور بہت سے امور میں مکمل اختلاف کو سامنے رکھتے ہوئے بھی دونوں کے درمیان ہمہ جہتی مساوات کا نعرہ لگانا بے دانشی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اس موقعہ پر حضرت الاستاذ علامہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ کی نہایت جچی تلی اور پر مغز بات یاد آتی ہے۔ جو موصوف نے ایک دن سبق کے درمیان "اسلام میں مساوات" کا مطلب بتاتے ہوئے بیان فرمائی کہ:۔

اسلام میں مساوات کے معنی:۔

مساوات کے معنی نفس قانون میں مساوات کے نہیں، بلکہ نفاذ قانون میں مساوات برتنا ہیں۔ علامہ موصوف کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کے فطری فرق اور ناگزیر جنسی اختلاف کے پیش نظر یہ تو ممکن ہی نہیں کہ ہر قانون دونوں کے لئے یکساں ہو۔ بلکہ واقعی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے بعض قوانین میں اختلاف ناگزیر ہے لیکن نفاذ کے وقت کسی کو محض جنسی فرق کی بنیاد پر اولیت و تقدم حاصل نہ ہوگا اور نہ ان میں سے کسی کو صرف اس بنا پر نظر انداز کیا جائے گا ـــ اس بصیرت افروز قول کی روشنی میں بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اقوام متحدہ کے چارٹر ـــ (اگر وہ عقلاء نے بنایا ہے)۔ میں جس جنسی فرق کی بنیاد پر مرد و زن میں اختلاف نہ کرنے پر زور دیا گیا ہے اور دونوں کے درمیان مساوات تسلیم کی گئی ہے اس کا مطلب بھی تھوڑے فرق کے ساتھ ـــ ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ وہ نہیں ہو سکتا یا نہ ہونا چاہیئے جو ترقی پسند عام طور پر کہتے اور ذہنوں میں بٹھانا چاہتے ہیں کیونکہ نہ وہ عقل صحیح کا تقاضا ہے نہ واقعات ہی کے مطابق۔ مثلاً دنیا کے قابل ذکر ممالک میں یہ قانون موجود و معمول ہے کہ بیوی کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہے مگر ایسا کہیں نہیں ہے کہ شوہر کا نفقہ بیوی کے ذمہ ہے (بعض استثناء اور مجبوری کی حالتوں کو چھوڑ کر) ظاہر ہے کہ یہ فرق اصلاً جنسی اختلاف ہی کی بنا پر ہے۔ کسی اور وجہ سے نہیں ہے۔

تو کیا یہ ممالک اقوام متحدہ کے چارٹر کی خلاف ورزی کے مرتکب ٹھہرائے گئے یا ٹھہرائے جائیں گے؟

مرد و زن کے درمیان مساوات میں اسلام کا نقطہ نظر:۔

ان امور کی روشنی میں ہم اس امر کے اظہار میں کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتے اور نہ جھجکتے ہیں کہ اسلام نے واضح طور پر عورت و مرد کے درمیان بعض امور میں فرق ملحوظ رکھا ہے اور اس کا اظہار قرآن مجید کی آیات میں بھی کیا گیا ہے اور احادیث نبوی میں بھی اور انھیں

بنیادوں پر تمام علماء امت کے اقوال میں بھی اس کا برملا اعتراف موجود ہے جس کی تفصیل موجب طوالت ہوگی۔ یہاں صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے:۔

قرآن وحدیث کا بیان:۔

قرآن مجید کی آیات سے دونوں کے فرقِ مراتب کا ثبوت:۔

۱۔ للرجال علیهن درجة [۱] ۲۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ [۲]۔

احادیثِ رسول سے صنفین میں خلقی وطبعی تفاوت کا ذکر:

۱۔ ما رأیت من ناقصات عقل ودین اذهب للب الرجل الحازم [۳]۔

۲۔ استوصوا بالنساء خیرا فان المراة خلقت من ضلع وان اعوج لشئ فی الضلع اعلاه فان ذهبت تقیمه کسرته وان ترکته لم یزل اعوج [۴]۔

علماء امت کے اقوال:۔

علماء امت کے اقوال کا احاطہ بہت مشکل ہے۔ یہاں صرف دو ممتاز عالموں کے فرمودات نقل کئے جاتے ہیں:۔

مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں (آیت الرجال قوامون علی النساء کی تفسیر کرتے ہوئے)۔ القوام ابلغ وهو القائم بالمصالح والتدبیر والتادیب وعلل ذلك بامرین وهبی وکسبی بما فضل الله .... علی النساء فی اصل الخلقة بکمال العقل وحسن التدبیر وبسطة فی العلم والجسم ومزید القوة فی الاعمال وعلو الاستعداد ولذلك خصوا بالنبوة .... وزیادة السهم فی الارث ومالکیة

۱۔ سورۂ بقرہ آیت ۲۲۸۔ ۲۔ سورۂ نساء آیت ۳۴۔

۳۔ بخاری ومسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص ۱۲/۱۳۔ ۴۔ بخاری جلد اول ص ۴۶۹

النکاح وتعدد المنکوحات والاستبداد بالطلاق ... وھذا امر وھمی ...
وبما انفقوا من اموالھم فی نکاحھن من المھور والنفقات الراتبۃ وھذا امر کسبی۔ [۱]

۲ حافظ ابن قیم جوزی رقمطراز ہیں :۔

وھو سبحانہ امر باشھاد امرأتین لتوکید الحفظ لان عقل المرأتین وحفظھا یقوم مقام رجل وحفظہ ولذا جعلت علی النصف من الرجل فی المیراث والدیۃ والعقیقۃ والعتق، فعتق امرأتین یقوم مقام عتق رجل کما صح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم [۲]

ٹھنڈے دل سے ان امور پر غور کرنے کے بعد تعدد ازواج کا مسئلہ ان شاء اللہ سمجھنا آسان ہو جائے گا اور اس کی "بھیانک" صورت کے بجائے متوازن حیثیت سامنے آئیگی۔

فہرست مآخذ

۱۔ قرآن مجید
۲۔ بخاری : للامام ابی عبداللہ محمد بن اسمٰعیل
۳۔ مسلم : للامام مسلم بن الحجاج القشیری
۴۔ ابوداؤد: للامام ابی داؤد سلیمان الاشعث السجستانی
۵۔ دارقطنی: للامام ابی الحسن علی بن عمر الدارقطنی
۶۔ مشکوٰۃ: للعلامۃ ابی محمد الحسین بن مسعود البغوی والشیخ ولی الدین البغدادی
۷۔ زاد المعاد : للحافظ ابن قیم الجوزی
۸۔ احکام القرآن: لابی بکر الجصاص الرازی
۹۔ احکام القرآن: لمحی الدین ابن العربی
۱۰۔ تفسیر کبیر : للامام ابی بکر الرازی
۱۱۔ تفسیر القرآن : للحافظ عماد الدین ابن کثیر
۱۲۔ درمنثور : للشیخ جلال الدین السیوطی
۱۳۔ روح المعانی : للعلامۃ الآلوسی
۱۴۔ تفسیر مظہری : للقاضی ثناء اللہ پانی پتی
۱۵۔ بیان القرآن : حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی
۱۶۔ فوائد قرآن مجید : حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی
۱۷۔ اعلام الموقعین : للحافظ ابن القیم الجوزی
۱۸۔ فتح القدیر : لکمال الدین ابن الہمام
۱۹۔ درالمختار : لعلاء الدین الحصکفی
۲۰۔ ردالمحتار : لابن عابدین الشامی
۲۱۔ الموافقات : للامام الشاطبی
۲۲۔ نورالانوار : للشیخ ملا احمد جیون
۲۳۔ حیلۂ ناجزہ : حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی

---
[۱] تفسیر مظہری ۲/۵۴۷۔ [۲] اعلام الموقعین ۱/۱۱۱

مرزا غالب اور مدرسۂ عالیہ کلکتہ

پروفیسر ابو محفوظ الکریم معصومی مدرسۂ عالیہ، کلکتہ۔

مرزا غالب کی سوانح زندگی میں مشاعرۂ کلکتہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ فروری ۱۸۲۸ء میں مرزا واردِ کلکتہ ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۱ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ بہرحال کم و بیش دو سال مرزا کلکتہ میں مقیم رہے اور نومبر ۱۸۲۹ء کے آخر تک دلی واپس پہنچے۔

قیامِ کلکتہ کے دوران بہ ظاہر کئی ایک مشاعروں میں مرزا کی شرکت سے جان پڑ گئی ہوگی لیکن ان میں سے صرف ایک مشاعرہ کا انھوں نے بار بار ذکر کیا ہے۔ اور ان اعتراضات کی تفصیل جستہ جستہ سنائی ہے۔ جو سرِ بزم ان کے بعض اشعار پر کئے گئے تھے۔ مشاعرہ کی یہ مجلس جس ادارہ میں منعقد ہوئی تھی اس کے متعلق اصحابِ قلم کا ایک طبقہ خاموش نظر آتا ہے اور ایک طبقہ جو "غالب شناسی" کے ممتاز اراکین پر مشتمل ہے۔ بہ صراحت لکھتا ہے کہ مدرسۂ عالیہ کلکتہ جو ۱۷۸۱ء میں قائم ہوا اور ۱۸۲۷ء تک اپنی موجودہ عمارت واقع ویلزلی اسکوائر (موجودہ حاجی محمد محسن اسکوائر) میں منتقل ہو چکا تھا۔ مدرسہ کی اسی عمارت میں مشاعرہ منعقد ہوا اور وہ ہنگامہ برپا ہوا جس نے غالب کی سرگزشتِ حیات میں ایک مستقل باب کا اضافہ کیا۔

اس ہنگامہ خیز مشاعرہ کی مفصل روداد کسی قدیم ماخذ میں یکجا نہیں ملتی۔ خود مرزا غالب نے اس کا ذکر متفرق طور پر کیا ہے۔ مرزا کے ہم معاصر وزیر علی عبرتی عظیم آبادی نے فارسی شعراء اور نثر نگاروں پر الگ الگ دو تذکرے مرتب کئے تھے، معراج الخیال اور ریاض الافکار۔ عبرتی نے دونوں تذکروں میں مرزا غالب کا ذکر بڑے اچھے انداز میں کیا ہے اور مشاعرہ

یہ ہنگامہ برپا کرنیوالوں کی مذمت کی ہے۔ لیکن جگہ کے تعین کا مسئلہ ان تذکروں سے بھی حل نہیں ہوتا۔

میرا خیال یہ ہے کہ خود مرزا کے بیان کا از سرِ نو جائزہ لینا چاہیئے۔ اور ان کے بیان میں جو اشارات ملتے ہیں ان پر اور کسی ایک دوسرے خارجی دلائل و قرآئن پر اچھی طرح غور کر لینے کے بعد مشاعرہ کی جگہ کا تعین کرنا چاہیئے۔ یہ مضمون خاص اسی مقصد سے سپردِ قلم کیا گیا ہے:

(الف) مرزا غالب کا ایک فارسی مکتوب اس مشاعرہ کے سلسلہ میں بنیادی معلومات فراہم کرتا ہے۔ مکتوب الیہ مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ ہیں۔ اس کا اقتباس درج ذیل ہے۔

"از نوادر حالات ایں کہ سخن وران و نکتہ رسان ایں بقعہ، پس از ورود خاکسار بزم سخنے آراستہ بودند۔ در ہر ماہ شمسی انگریزی، روز یکشنبہ نخستین، سخن گویان در مدرسہ سرکار کمپنی فراہم شدندے، و غزلہائے ہندی و فارسی خواندندے۔ ناگاہ گراں مایہ مردے کہ از ہرات بہ سفارت رسیدہ است، در آں انجمن می رسد و اشعار مرا شنودہ، بہ بانگ بلندی ستاید و بر کلام نادرہ گویان ایں قلمرو، تبسم ہائے زیرلبی می فرماید۔ چوں طبائع بالذات مفتون خود نمائی است، ہمگنان حسد می برند و کلانان انجمن و فرزانگان فن بر دو بیت من اعتراض نادرست برآوردہ، آں را شہرت می دہند۔ و بے آنکہ زبان بپاسخ آشنا شود۔ از دانشوران کہ مخدومی لازمی نواب علی اکبر خاں و کری و مطائی مولوی محمد محسن از آنانند، جوابہائی یابند"

(کلیات نثر فارسی ص ، حالی: یادگار غالب ص ۳۶۲-۳۶۳)

غالب کے کلکتہ پہنچنے کے بعد بہ قول مولانا مہر غالب کے اعزاز میں ایک خاص مشاعرہ منعقد کیا گیا" (غالب ص ۱۲۵) راقم الحروف کو اس اعزاز کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملا۔ غالباً وہ ہے

[illegible] کیا جا سکتا ہے کہ مشاعرہ کا یہ سلسلہ غالب کے کلکتہ پہنچنے کے بعد شروع [illegible]
[illegible] کلام اس بارہ میں بھی قطعی نہیں ہے۔ بہر حال منقولہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱۔ مشاعرہ ہر انگریزی مہینے پہلے اتوار کو منعقد کیا جاتا تھا۔

۲۔ نشست مدرسہ کارپینٹی میں ہوتی تھی۔

۳۔ مشاعرہ میں اردو اور فارسی غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔

۴۔ جس مجلس میں غالب شریک ہوئے اس میں اچانک سفیر ہرات بھی پہنچ گئے تھے۔

۵۔ سفیر ہرات نے غالب کے کلام کی تعریف کی اور ان کو جی کھول کر داد دی۔

۶۔ مقامی شعراء کے کلام پر سفیر زیر لب مسکراتے رہے۔

۷۔ مقامی شعراء کو جو خفت اٹھانی پڑی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غالب ہدف اعتراض بنائے گئے۔

۸۔ اعتراض غالب کے دو شعر پر کئے گئے۔

۹۔ غالب کی حمایت میں نواب علی اکبر خاں اور مولوی محمد محسن نے جوابات دیئے (مولانا مہر نے ثانی الذکر کا نام محمد حسن لکھا ہے دیکھئے: غالب ص۱۱۶، ص۱۱۵، ص۱۱۳، ص۱۱۴۔)

(ب) چودھری عبدالغفور سرور کے نام خط میں صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں:۔
"یہ مثنوی جس میں یہ مصرعہ ہے ع حاش للہ کہ بدیتی گویم کلکتہ میں میں نے لکھی ہے۔ پانچ ہزار آدمی فراہم تھے اور جو اعتراضات مجھ پر کئے گئے تھے ان میں سے ایک اعتراض یہ ہے کہ (ہمہ عالم) غلط ہے۔ یعنی (ہمہ) کا لفظ (عالم) کے ساتھ ربط نہیں پا سکتا قتیل کا حکم یوں ہے۔ عرض کیا گیا کہ حافظ کہتا ہے ع ہمہ عالم گواہ عصمت اوست۔ سعدی کہتا ہے ع عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم از وست۔

۱؎ مرزا غالب اور مولوی محمد محسن کے مزید تعلقات کے لئے دیکھیے: کلیات نثر، ص۱۳۴، ص[illegible]

غرض کہ اس تحریر سے یہ ہے کہ مثنوی وہاں لکھی گئی اور ایک ایک نقل مولوی کرم حسین بلگرامی اور مولوی عبدالقادر رامپوری اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور ان کے امثال و نظائر کے پاس بھیجی گئی۔ اگر یہ لوگ جگہ پاتے تو میری کھال ادھیڑ ڈالتے۔" (عود ہندی ص ۱۰۱، مطبوعہ مفید عام ایضاً ص ۱ علی گڑھ)

اس بیان سے معلوم ہوا کہ مشاعرہ میں پانچ ہزار کا مجمع تھا۔ معترضین نے (ہمہ عالم) کی ترکیب پر اعتراض کیا تھا۔ کلکتہ کے سربرآوردہ ادبا میں کرم حسین بلگرامی، عبدالقادر رامپوری اور نعمت علی عظیم آبادی اس پایہ کے لوگ تھے کہ مثنوی "بادِ مخالف" کے نسخے مرزا غالب نے ان کی خدمت میں بھیجے تھے۔ معترضین کی صف میں ان کے شامل ہونے کی صراحت نہیں ملتی ہے۔ لیکن اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ موقع ملنے پر ان میں سے ایک بھی چوکنے والا نہیں تھا جیسا کہ خود مرزا نے واضح کر دیا ہے۔

بظاہر اسی عبارت کی بنیاد پر شیخ اکرام نے غالب کے معترضین میں ان تینوں کو شمار کیا ہے۔ اگرچہ مولانا مہر نے غالب نامہ کے حوالہ سے ان کے نام نقل فرما کر اخیر میں لکھا ہے کہ مجھے اس بیان کا ماخذ معلوم نہیں ہو سکا۔ (غالب ص ۱۲۲ حاشیہ ۱)

مولوی کرم حسین بلگرامی وہی بزرگ معلوم ہوتے ہیں جن کی فرمائش پر غالب نے برجستہ قطعہ "چکنی ڈلی" پر کہا تھا۔ ان کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ برہان قاطع، تصحیح کے آخری مرحلہ سے انہی کے ہاتھوں گزری تھی۔ فارسی دیباچہ میں خود لکھتے ہیں "۔۔۔ و این حقیر ۔۔۔۔ بحسب اشارہ فیض بشارہ جناب مستغنی الالقاب، تنقیح الفاظ متن عبارات و لغات در ضمن تصحیح پروف اخیر از آغاز تا انجام التزام داشتم۔" (برہان قاطع، دیباچہ ص ۲) اس کے بعد ٹامس روبک (Thomas Roebuck) کی باری آتی تھی۔ برہان قاطع کے انگریزی دیباچہ میں روبک نے ان کی تعریف و تعارف کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ کرم حسین بلگرامی فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ عربی و فارسی میں سکنڈ منشی کے عہدہ پر کالج کے شروع

[illegible] ہی سے فائز تھے اور تامس روبک سے پہلے (N. B. Edmonstone) [illegible]
[illegible] ماتحتی میں معتمد خدمت کامیابی سے انجام دے چکے تھے۔ غالب کے ورودِ کلکتہ تک وہ غالباً
فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ عربی و فارسی میں میر منشی کے عہدہ پر سرفراز ہو چکے تھے۔ منت
زبان دانی میں خاطر خواہ دستگاہ رکھتے تھے۔ برہانِ دکنی سے ان کو بھی کچھ عقیدت ہوگی وہ
ظاہر ہے، ایسی شکل میں غالب کا ان کی طرف سے خائف ہونا کچھ بیجا نہ تھا۔ کرم حسین ۱۸۳۱ء
تک یقینی طور پر بقیدِ حیات رہے۔ صراح کے ضمیمہ لطیفہ (مطبوعہ ۱۲۴۷ھ ۱۸۳۱ء) کے خاتمہ
میں حکیم عبدالمجید مرتب ضمیمہ نے جن اصحابِ علم و فضل کے نام (اسلامی مددگاران) کے زیرِ عنوان
گنائے ہیں۔ ان میں مولوی کرم حسین میر منشی کالج کا نام شامل ہے (ص۱۶۱)

دوسرے صاحب مولوی عبدالقادر رامپوری کے بارہ میں کوئی خاص بات مجھے معلوم
نہیں ہو سکی۔ شوق نے تذکرہ کاملانِ رامپور میں مفتی عبدالقادر غمگین کا ذکر کیا ہے جو مرادآباد
رہتے تھے۔ ۱۸۰۹ء میں کمپنی کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ اور اجمیر، راجستھان، جبلپور، ناگپور
میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ کمپنی نے خطاب خان بہادری اور خلعت دیا تھا۔
۱۸۳۵ء میں ملازمت ترک کر کے دہلی گئے اور شاہ ظفر کے پاس چھ مہینے رہے۔ بہ قول شوق
اسی زمانہ میں ایک موقع پر غالب کے کلام سے ظرافت کی تھی (کاملانِ رامپور: ص۲۲۴) قرینہ
سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے قیامِ کلکتہ کے دوران یہ بھی کلکتہ میں مقیم رہے ہوں گے۔

نعمت علی عظیم آبادی کے بارہ میں ہماری معلومات درجۂ صفر میں ہیں۔

(ج) غالب کا تیسرا بیان مولوی مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام ایک رقعہ میں یوں
ملتا ہے: "اللہ اللہ جو کلکتہ میں شورِ نشور اٹھا تھا، میرا یہ شعر:

جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موئے کہ بتاں راز کمر برخیزد

تحسینہ جراحتہائے اعتراض ہوا ہے۔ منشاء اعتراض یہ ہے کہ (عالم) مفرد ہے اس کا ربط

(ہمہ) کے ساتھ بسبب اجتماعِ ثقیل ممنوع ہے۔ قضارا اس زمانہ میں شاہزادہ کامران ہراتی کا سفیر گورنمنٹ میں آیا تھا، کفایت خاں اس کا نام تھا اس تک یہ قصہ پہنچا اس نے اساتذہ کے اشعار پانچ سات ایسے پڑھے جس میں (ہمہ عالم)، (ہمہ روز) و (ہمہ جا) مرقوم تھا۔ اور وہ اشعار قاطع برہان میں مندرج ہیں۔ (عودِ ہندی: ص ۱۹، ایضاً ص ۱، آگرہ)۔

اس عبارت میں جس کفایت خاں کا نام آیا ہے، غالباً اس سے سفیرِ ہرات ہی مراد ہے۔ جس کے نام کی صراحت کلیاتِ نثر فارسی میں نہیں کی گئی ہے۔ لیکن عودِ ہندی کی عبارت غماز ہے کہ کفایت خاں خود مجلسِ مشاعرہ میں حاضر نہیں ہوئے جبکہ کلیاتِ نثر فارسی سے معلوم ہوتا ہے کہ سفیرِ ہرات ناگاہ مجلسِ مشاعرہ میں وارد ہو گئے تھے۔

عبارتِ منقولہ بالا میں گرچہ اسی ایک اعتراض کا اعادہ کیا گیا ہے جس کا ذکر عبدالغفور سرور کے خط میں آچکا ہے۔ تاہم اس شعر کو (خستۂ جراحتہائے اعتراض) کہہ کر غالب نے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ اس شعر پر کچھ اور اعتراضات بھی کئے گئے تھے۔ جن کی تفصیل ہمیں مثنوی "بادِ مخالف" میں ملتی ہے۔

(د) مثنوی "بادِ مخالف" جو اس ہنگامہ کے بعد نواب علی اکبر خاں اور مولوی محمد محسن کے اشارہ پر لکھی گئی، اس کے مندرجۂ ذیل ابیات مجلسِ مشاعرہ کے تمام اعتراضات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

زلف گرفتار را کہ درہم کرد — بزمِ اشعار را کہ برہم کرد
(ہمہ عالم) غلط کہ گفت نخست — پارۂ زیں نمط کہ گفت نخست
(بیش) را بیشتر کہ گفت بمن — بد ز من پیشتر کہ گفت بہ من
موئے را بر کمر کہ گفت غلط — شعر را سربسر کہ گفت غلط

اس مصرعہ سے ع بزمِ اشعار را کہ برہم کرد، صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہنگامہ بزمِ مشاعرہ ہی میں برپا ہوا تھا اور کم از کم (ہمہ عالم) کی ترکیب پر (بشرطیکہ غالب کا

بیان ہو چکا ہے کہ مشاعرہ ہی میں اعتراض کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا مہر صاحب کا یہ بیان محتاجِ تحقیق ہے کہ اسی مشاعرہ میں یا کسی دوسری مجلس میں اعتراض کیا گیا کہ (بہ عالم) کی ترکیب درست نہیں" (غالب، ص۱۱۶)۔

کلیاتِ نثرِ فارسی کی عبارت سے معلوم ہو چکا ہے کہ ہدفِ اعتراض غالب کے دو شعر تھے۔ دوسرا شعر بہ ظاہر اس غزل کا تھا جس کی ردیف تھی (زدہ) کسرہ کے ساتھ، مخالفین کا ایک اعتراض اسی کسرہ پر تھا جس کو مندرجۂ ذیل ابیات ظاہر کرتے ہیں:

وائے با آنکہ شعرِ من صاف است — (زدہ) رامی زند چہ الفاف است

(زدہ) راکسرہ از ظرافت نیست — یائے وحدت بود اضافت نیست

واضع طرزِ ایں زمیں نہ منم — درخورِ سرزنش ہمیں نہ منم

دیگراں نیز گفتہ اند چنیں — گوہر راز سفتہ اند چنیں

وہ شعر جس میں (زدہ) کسرہ کے ساتھ آتا ہے حسب ذیل ہے:

"شور اشکے بہ فشار بن مژگاں دارم
طعنۂ بے سروسامانی طوفاں زدہ"

(کلیاتِ فارسی ص۴۸۳ نول کشور ۱۹۲۵ء)

غالب نامہ کے حوالہ سے اس شعر کو نقل کرنے کے بعد مولانا مہر فرماتے ہیں: "مجھے غالب کے کلام میں یہ شعر نہیں مل سکا۔ اس زمین میں غالب کی ایک غزل موجود ہے لیکن اس میں منقولہ شعر موجود نہیں۔" (غالب، ص۱۱۶ حاشیہ ۲)۔

نسخۂ کلیات سے غالباً مہر صاحب نے سرسری طور پر رجوع فرمایا ہوگا۔ ورنہ اس زمین میں غالب کی دو غزلیں ملتی ہیں۔ ردیف ہائے ہوز کی پہلی غزل میں یہ شعر موجود ہے دوسری غزل ہائے ہوز کے اواخر میں ثبت ہے جو یقیناً مولانا مہر کی نظر سے گزری ہوگی۔ منقولۂ بالا شعر اس غزل کا نہیں ہے لیکن طوفان زدہ کی ترکیب اس میں بھی ملتی ہے۔

نہ نوشتم شکوۂ بیداد تو انشا کردن قلم از خوش رقم شد خس طوفاں زدہ

(کلیاتِ فارسی، غالب: ص ۲۹۵)

مذکورۂ بالا اقتباسات سے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں اُن میں سے چند چیزیں خاص طور پر توجہ طلب ہیں، مدرسہ سرکار کمپنی، پانچہزار کا مجمع، اور ہر انگریزی مہینے، پہلے اتوار کو بزمِ مشاعرہ کا منعقد ہونا۔

غالب کے بعد میرے علم میں وزیر علی عبرتی کا بیان اس مشاعرہ کے سلسلہ میں قدیم تر ماخذ ہے جو ہماری دست رس میں ہے۔ عبرتی نے فارسی شعرا کا تذکرہ معراج الخیال ۱۸۶۴ء تک مرتب کیا اس سے پہلے ۱۲۶۹ھ ۔ ۱۸۵۳ء میں انھوں نے نثر نگاروں کا تذکرہ ریاض الافکار مرتب کیا تھا گویا دونوں تذکرے مرزا غالب کے دورانِ حیات میں لکھے گئے۔ موخر الذکر تذکرہ میں عبرتی نے اپنا ماخذ میر ذوالفقار علی کی بیاض کو قرار دیا ہے اور یہ سلسلہ مشاعرہ مرزا غالب کے ایک معترض کا نام امان علی خاں بتایا ہے۔ تذکرہ معراج الخیال میں ان کا ماخذ ایک بیاض کے علاوہ خواجہ حیدر خاں (کذا) شائق[1] شاگرد غالب کا بیان ہے۔ مواد کے اعتبار سے دونوں

---

(۱) شائق کا نام رحمٰن علی طپش نے تواریخ ڈھاکہ میں، خواجہ حیدر جہاں لکھا ہے۔ خواجہ خلیل کے لڑکے تھے اور نواب سر عبد الغنی کے قرابت مندوں میں تھے۔ بہ قول طپش، مرزا اسد اللہ خاں غالب سے بذریعہ خط و کتابت کے اپنے کلام کی اصلاح لیا کرتے تھے۔ شائق کا ایک مختصر دیوان خواجہ محمد افضل کے کتب خانہ میں طپش کو ملا تھا۔ دو شعر نمونے کے یہاں بھی درج ہیں:-

جیں کی ٹھوکر سے جی اٹھے مردے اس کی رفتار نے ہمیں مارا

خونِ دل پیتے ہیں، غم کھاتے ہیں دل لگانے کا مزا پاتے ہیں

دیکھیے تواریخ ڈھاکہ (ص ۳۲۵-۳۲۶، مطبوعہ آرہ ۱۹۱۰ء) و فا راشدی: بنگال میں اردو ص ۳۔ عبرتی کے الفاظ سے مترشح ہے کہ شائق کی ملاقات غالب سے کبھی ضرور ہوئی۔ بہ ظاہر اس کا موقع

(اگلے صفحہ پر)

تذکرے ایک جیسے ہیں اور یہ کہ معراج الخیال میں مرزا امان علی خاں کا نام بہ صراحت نہیں آیا۔ عبرتی بہرحال معترضین سے ناخوش نظر آتے ہیں لیکن وہ مرزا غالب کو قتیل پر ترجیح دینا روا نہیں رکھتے۔ متعلقہ عبارت ملاحظہ فرمائیں :-

"سخن فہمانِ کلکتہ پئے ہمہ دانی آں سیف لسانی نبردہ ، حریفانہ آویزشے یاد کردند ۔ چوں آں مغتنمِ روزگار خیلے سخن رس و ماہر ایں فن بود ، کسے را از آں جماعۃ برخود دستے نداد ۔ بلکہ ہمہ را مہرِ سکوت برلب بیان نہاد چنانچہ مختصر مثنوی کہ در مناظرۂ اہلِ کلکتہ بنظم در آوردہ ، شاہد ایں مقال است ۔ مگر بعضے سخن شناساں کہ بر مرزا قتیل آں عالی افکار را ترجیح می دہند ، خالی از تکلف نمی نماید "

(معراج الخیال ورق ۱۵ ر ب ۔ زیر شمارہ ۶۵۵ کرزن)

عبرتی کے دونوں تذکروں کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) غالب کا مولد دار السلطنت دہلی ہے (یہ بیان صحیح نہیں ۔ غالب متفقہ طور پر اکبرآباد میں پیدا ہوئے) ۔

(۲) معترضین بدمذاق اور حاسد تھے (راقم کے خیال میں تفاوت سن و سال اور مرزا کے بلند آہنگ دعووں کو بھی ہنگامہ برپا کرنے میں بنیادی اسباب کی حیثیت رہی ہے) ۔

غالب کے قیامِ کلکتہ کے دوران آیا ہوگا ۔ شائق سے عبرتی کی ملاقات جہانگیر نگر (ڈھاکہ) میں ہوئی تھی عبرتی نے بہ سلسلۂ غالب ، شائق کا حوالہ اس طرح دیا ہے :" از زبان خواجہ حیدر خاں (؟) متخلص بشائق کہ از شاگردانِ آں عالی گفتار باشد شنودیم کہ خیلے وارستہ مزاج و آزادانہ طبیعت زیست ۔ فرمودے ہر بزمے کہ تشریف دادے پردۂ گوش اہلِ بزم از رنگین مقالی خویش رو کش فصل بہاراں ساختے " (معراج الخیال ورق ۱۵ ر ب) شائق کو شیخ محمد وجیہ الدین عشقی سے بھی تلمذ تھا جو اصلاً عظیم آبادی تھے ۔ ڈھاکہ میں وفات پائی (معراج الخیال ۔ ورق ۹۴ ر ب) ۔

(۳) اعتراض کرنیوالوں میں مرزا امان علی خاں پیش پیش تھے (ریاض الافکار۔ برگ ۱۴۱۔ رقم ۹۲ فارسی بوہار)۔

(۴) امان علی خاں کو غالب سے کوئی نسبت نہیں تھی (ریاض الافکار)۔

(۵) قتیل پر غالب کو ترجیح دینا خالی از تکلف نہیں (معراج الخیال)۔

میرے علم میں عبرتی کی ریاض الافکار سے سب سے پہلے جناب حمید احمد خاں نے استفادہ کیا ان کا مضمون (غالب کا کلکتہ) ماہ نو شمارہ فروری ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ راقم کو اسی مضمون سے عبرتی اور ان کی ریاض الافکار کا علم ہوا اور اسی زمانہ میں نسخۂ بوہار کے مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔

خاں صاحب، امان علی خاں کے متعلق رقم طراز ہیں کہ معترضین میں سب سے زیادہ بلند آہنگ ایک صاحب بنام نواب مرزا امان علی خاں تھے۔ یہ بھی غالب تخلص کرتے تھے۔ عظیم آباد کے رہنے والے تھے اور کچھ عرصہ پہلے کلکتہ میں آرہے تھے (ماہ نو: ص۲۷، شمارہ فروری ۱۹۵۰ء)

معلوم نہیں ریاض الافکار کی عاجلانہ مراجعت نے خان صاحب کو اس غلط فہمی کا شکار بنایا، یا کسی دوسرے ماخذ کی بنا پر انھوں نے امان علی خاں کو غالب کا ہم تخلص لکھدیا ہے۔ بہرحال اس کی نشاندہی نہ ان کے مقالہ میں ملتی ہے نہ کسی اور ذریعہ سے اس کی توثیق ہوتی ہے۔ عظیم آباد کے مرزا امان علی خاں ذبیح تخلص کرتے تھے۔ مرزا ابراہیم خان اصفہانی کے لڑکے تھے۔ یعنی غالب اگر سلجوقی ترک ہو کر تیغ اصفہانی کے گھائل ہو سکتے تھے تو یہ بھی اصلاً اصفہانی تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ غالب کی طرح ان کا مولد اکبر آباد ہی تھا۔ البتہ نشوونما عظیم آباد میں ہوئی تھی۔ غزل ریختہ میں قادر الکلام ہونے کے علاوہ فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے عبرتی نے ان کو خاص دوستوں میں لکھا ہے، اور بڑے اچھے الفاظ میں ان کا ذکر دونوں تذکروں میں کیا ہے۔ ریاض الافکار کی تالیف کے زمانہ میں یقیناً عظیم آباد ہی میں مقیم تھے۔ (بالفعل بخوشدلی تمام بہزار قناعت بعظیم آبادمی گذارد۔ ریاض الافکار) عبرتی نے

ان کی آزادہ وضعی و خانہ بدوشی کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا ہے لہٰذا ممکن ہے کلکتے میں بھی کچھ زمانہ بسر کیا ہو۔ تاہم حیرت ہوتی ہے کہ عرشی نے مرزا قتیل کے تذکرہ میں غالب سے ان کی آویزش کی جانب اشارہ کرنا تو ایک طرف کبھی کلکتہ پہنچنے کا ذکر تک نہیں کیا۔ علاوہ بریں غالب کے ذکر میں ایسا فقرہ لکھنا گوارہ کیا (خصوصاً مرزا امان علی خان کہ اصلاً باآن مستعد روزگار جادو بیان نسبتے ندارد — ریاض الافکار)۔ بہرحال یہ احتمال اپنی جگہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ عظیم آباد کے یہی امان علی خاں اعتراض کرنیوالوں میں سب سے زیادہ بلند آہنگ رہے ہوں گے۔ لیکن ان کا تخلص ذبیح تھا نہ کہ غالب۔ ان کے نام کے ساتھ نواب کا لقب بھی مجھ کو کہیں نظر نہیں آیا۔ نوروز علی خاں یکتا کے والد امان علی خاں کی شخصیت بھی ذبیح عظیم آبادی سے شاید الگ نہیں تھی (دیکھئے: ریاض الافکار، ذکر یکتا، معراج الخیال ۸۲/ط)۔

یادگار غالب میں مولانا حالی نے غالب کے قیام کلکتہ کی سرگزشت میں اس ہنگامہ کی جو تفصیل پیش کی ہے وہ مدرسۂ عالیہ کے ذکر سے خالی ہے۔ (یادگار غالب: ص ۱۸-۲۰ علی گڑھ) محمد حسین آزاد کو بھی اس سے سروکار نہیں کہ مشاعرہ کس ادارہ میں منعقد ہوا تھا۔

آزاد اور حالی کے بعد معلوم نہیں کس طرح غالب کے تذکرہ نگاروں نے اس مشاعرہ کی جگہ مدرسۂ عالیہ کو قرار دینا شروع کیا۔ شیخ اکرام نے حیات غالب میں بہ ظاہر کلیات نثر فارسی کی مذکورۂ بالا عبارت کی بنیاد پر لکھا ہے — "کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو مدرسہ جاری کیا تھا اس سے متعلق انہی دنوں وہاں ایک بزم سخن قائم ہوئی تھی۔ جہاں ہر مہینے پہلے اتوار کو مشاعرہ ہوتا اور اردو فارسی غزلیں پڑھی جاتیں۔ مرزا نے بھی اس میں غزلیں پڑھیں۔" (حیات غالب: ص ۵۰ دہلی) بر موقع حاشیہ پر مدرسے کے قیام کی مختصر تاریخ بتا کر شیخ صاحب نے متعین کر دیا ہے کہ ان کے نزدیک "مدرسہ سرکار کمپنی" سے مدرسۂ عالیہ مراد ہے جس کو گورنر جنرل وارن ہسٹنگز نے قائم کیا (حیات غالب: ص ۵۰ حاشیہ ۱)۔

مہر صاحب نے مدرسۂ سرکار کمپنی کو مدرسۂ کلکتہ لکھا ہے۔ اس سے ان کی مراد مدرسہ عالیہ واقع ویلزلی اسکوائر سے ہوگی اور اس میں شک نہیں کہ آج تک مدرسۂ عالیہ کے کاغذات میں کلکتہ مدرسہ لکھنے کا دستور ہے۔ اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا خود مرزا غالب اس مدرسہ کو (مدرسۂ کلکتہ) کے نام سے جانتے تھے۔

حمید احمد خاں نے اپنے مضمون (غالب کا کلکتہ) میں مدرسۂ کلکتہ سے ہمارے اسی مدرسہ کو مراد لیا ہے اور اسی ذیل میں لکھا ہے:۔

"۱۹۳۸ء میں جب میں کلکتہ میں تھا مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک مجلس میں مجھ سے کہا کہ مدرسہ اپنی موجودہ عمارت میں ۱۸۲۶ء یا ۱۸۲۸ء کے قریب منتقل ہوا۔ غالب کو مثنوی بادِ مخالف والا ہنگامہ مدرسہ کی پہلی عمارت میں پیش آیا جو سیالدہ میں بیٹھک خانہ روڈ پر تھی۔" (ماہِ نو: ص۲۷ فروری ۱۹۵۵ء)۔

خان صاحب نے اس کے بعد پرنسپل مولانا محمد موسیٰ (مرحوم) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جو مشاعرے ۲۹-۱۸۲۸ء میں ہوئے ان کا ذکر مدرسہ کے پرانے کاغذات میں نہیں ملتا ہے۔ اس باقاعدہ اطلاع کے باوجود خان صاحب کو مولانا آزاد کے بیان میں کسی شبہ کی گنجائش نظر نہیں آئی اور انھوں نے مولانا کے بیان کو صرف اس ترمیم کے ساتھ کہ مشاعرہ پہلی عمارت میں نہیں ہوا تسلیم کر لیا ہے۔

ذکرِ غالب میں جناب مالک رام یوں رقمطراز ہیں:۔

"ان دنوں کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مدرسۂ عالیہ کے زیرِ اہتمام ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو ایک بزمِ سخن منعقد ہوتی تھی۔" (ذکرِ غالب: ص۶۱ جامعہ ۱۹۵۵ء)

برموقع حاشیہ پر یہ عبارت بھی ملتی ہے "یہ مشاعرہ مدرسہ عالیہ کی موجودہ ویلزلی اسٹریٹ والی عمارت میں ہوا تھا اس سے پہلے مدرسہ بیٹھک خانہ میں تھا۔ ویلزلی اسٹریٹ والی عمارت کا سنگِ بنیاد ۱۵ر جولائی ۱۸۲۴ء کو رکھا گیا، پوری عمارت تین سال کی

مدت میں تیار ہوئی. اور غالب کے کلکتہ پہنچنے سے صرف چند ماہ پہلے اگست [illegible] میں جماعتیں اس نئی جگہ میں منتقل ہوئی تھیں. مشاعرہ میں نشست کا انتظام یوں تھا کہ شعرائے کرام اندر کے مغربی برآمدے میں تشریف فرماتے تھے. حاضرین کی بڑی تعداد باہر کھلے صحن میں فرش پر بیٹھی تھی. (ذکر غالب: ص ۶۳ حاشیہ ۱) ۔

مالک رام صاحب نے اصل میں گویا غالب کے "مدرسہ سرکار کمپنی" کا ترجمہ کر دیا ہے۔ پھر حاشیہ میں اس کی توضیح کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں لکھا ہے کہ مشاعرہ مدرسہ عالیہ ویلزلی اسٹریٹ میں منعقد ہوا تھا۔ انھوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ شعراء کی نشست تک کی تصویر کشی اس انداز سے کی ہے جیسے خود چشم دید گواہ ہوں۔ مگر حیرت ہے کہ مالک رام صاحب نے کسی ماخذ کی نشاندہی نہیں کی۔ مجھے کافی تلاش کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ مولانا آزاد (مرحوم) کا بیان جناب حمید احمد خاں کے حوالہ سے گذر چکا ہے کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مولانا مرحوم ہی کا بیان مالک رام صاحب کے معلومات کا سرچشمہ ہو مدرسہ عالیہ کلکتہ جو بعض اوقات محمڈن کالج اور سرکاری کاغذات میں عام طور پر "کلکتہ مدرسہ" کہلاتا ہے اس کی روایات میں کسی مشاعرہ کا ذکر سنا نہیں گیا اور کم از کم حالی کی "یادگارِ غالب" تک یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس مشاعرہ کے سلسلہ میں کلکتہ کے مدرسہ عالیہ کا تصور بھی نہیں کیا گیا تھا۔

ہمارے استاذ مولانا عبدالستار صاحب جن سے بڑھ کر مدرسہ عالیہ کے پرانے کاغذات اور قدیم وثائق کا مطالعہ کسی اور نے شاید ہی کیا ہو گا۔ وہ بھی اپنی کتاب تاریخ مدرسہ عالیہ میں کسی مشاعرہ کا ذکر نہیں کرتے۔ صرف آغا احمد علی کے تذکرہ میں ان کے یہ الفاظ ملتے ہیں: "۱۸۶۲ء میں مسٹر کوڈیل کی سفارش سے کرنل ناسو لیز پرنسپل مدرسۂ عالیہ نے مدرسہ کے فارسی مدرس کی جگہ پر آپ کو (آغا احمد علی) مقرر کر دیا۔ یہی زمانہ ہے کہ مرزا غالب کلکتہ آئے ہوئے تھے اور مسلم انسٹی ٹیوٹ میں ایک مجلس تھی۔ اس مجلس میں آغا صاحب

بھی موجود تھے۔ ان دونوں میں کسی علمی مسئلہ پر اختلاف پیدا ہوگیا تھا جب مرزا غالب نے اپنی کتاب قاطع برہان شائع کی جس میں برہان قاطع اور اس کے مصنف پر سخت اعتراضات کیے گئے تھے، تو آغا صاحب، مرزا غالب کے مقابلہ اور برہان قاطع کی تائید میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور مرزا غالب کے خلاف ۱۸۶۵ء میں مؤید برہان لکھا الخ (تاریخ مدرسہ عالیہ ۱۸۵۱،۱۷۸۰۔ حصہ دوم۔ ڈھاکہ ۱۹۵۹ء)۔

مذکورۂ بالا بیان کا سرسری جائزہ لینا ضروری ہے:-

۱- غالب کے سلسلہ میں مسلم انسٹی ٹیوٹ کا ذکر کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کا قیام ۱۹۰۲ء میں عمل میں آیا۔ اس سے پہلے کلکتہ میں دو انجمنیں قائم ہو چکی تھیں، انجمن مذاکرہ علمیہ یا (Mohammadan library society) جو اپریل ۱۸۶۳ء میں نواب عبداللطیف مرحوم کی سعی سے قائم ہوئی اور (Society for the mutual Improvement of young men) ان دونوں کی جگہ بعد میں مسلم انسٹی ٹیوٹ نے پُر کر دی۔

۲- غالب سے آغا احمد علی کی بالمشافہہ ملاقات محتاج ثبوت ہے۔ اس قدر یقینی ہے کہ جس زمانہ میں غالب کلکتہ میں مقیم تھے آغا احمد علی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ آغا کی پیدائش جہانگیر نگر (ڈھاکہ) میں ۱۲۵۵ء مطابق ۱۸۴۰ء ہوئی یعنی کلکتہ سے غالب کی واپسی کے دس گیارہ سال بعد۔

کچھ اسی قسم کا وہم بعض لوگوں کو سید محمود آزاد کے سلسلہ میں بھی ہوا ہے۔ ڈاکٹر شادانی تحریر کرتے ہیں: "جس زمانہ میں مرزا غالب اپنے مقدمہ کے سلسلہ میں کلکتہ آئے ہوئے تھے، آزاد بھی ان سے ملنے کلکتہ گئے تھے۔" (وفا راشدی: بنگال میں اردو ص۴۹)۔ محمود آزاد کا سن ولادت ۱۸۴۳ء ہے اور مرزا کا سفر کلکتہ لگ بھگ پندرہ سال پہلے کا واقعہ ہے۔

۳- آغا احمد علی اور غالب کی قلمی معرکہ آرائی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ لیکن یہ معرکہ جس وقت شروع ہوا اس وقت تک غالب کے سفر کلکتہ پر ۳۱ سال بیت چکے تھے۔ غالب

نے ۱۸۶۱ء میں قاطع برہان کا مسودہ مکمل کیا اور ۱۸۶۲ء میں اس کی طباعت واشاعت کے ذریعہ نبرد آزماؤں کو دعوتِ مبارزت دی۔

منشی حبیب اللہ خاں کے نام ایک رقعہ میں لکھتے ہیں: "کلکتہ سے مجھے اطلاع دی کہ مولوی احمد علی مدرس مدرسہ کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا ہے، نام اس کا مؤید برہان ہے۔ اس رسالہ میں رفع کیے ہیں تیرے وہ اعتراض جو تو نے دکنی پر کیے ہیں اور تیری تحریر پر کچھ اعتراضات وارد کیے ہیں۔ اور اہلِ مدرسہ اور شعرائے کلکتہ نے تقریظیں اور تاریخیں بڑی دھوم کی لکھی ہیں (اردوئے معلیٰ ص۱۳۱ الہ آباد ۱۹۲۷ء) رقعہ کی تاریخ ۱۲ شعبان ۱۲۸۳ھ ہے یعنی دسمبر ۱۸۶۶ء۔

یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ یہاں مرزا نے مدرسہ کلکتہ لکھا ہے۔ "مدرسہ سرکار کمپنی" نہیں لکھا۔

مولانا مہر نے مشاعرہ میں ہنگامہ برپا کرنے والوں میں احمد علی گوپامئو مدرس مدرسہ عالیہ اور وجاہت علی کو شمار کیا ہے۔ ان کا ماخذ مولانا آزاد کا ایک بیان ہے (غالب: ص۱۲۱، ۱۲۲ حاشیہ ۲) اس فہرست میں احمد علی مدرس مدرسہ عالیہ (یعنی آغا احمد علی) کا ذکر جیسا کہ ذکر کیا گیا درست نہیں۔

مدرسہ سرکار کمپنی، مدرسہ عالیہ یا مدرسہ عالی کا اطلاق صرف موجودہ مدرسہ عالیہ یا محمڈن کالج پر نہیں ہوتا تھا۔ یہ قصہ جس وقت پیش آیا اس وقت بیٹھک خانہ روڈ یا ویلزلی اسکوائر کے مدرسہ عالیہ کے علاوہ فورٹ ولیم کالج پر بھی اردو، فارسی کے اہلِ قلم انہی الفاظ کا اطلاق کرتے تھے۔ اس دعوی کے ثبوت میں فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات اور باقی ماندہ مخطوطات پر ایک سرسری نگاہ ڈالنا کافی ہوگا۔ (باقی آئندہ)


بھارت کے
دفاع و ترقی
میں شرکت کیجئے
7 1/4 %
3 سالہ کھاتے
1 سالہ کھاتے 6%

مکمل لغات القرآن

(چھ جلدوں میں)

قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اس کے معانی و مطالب کے حل کرنے اور سمجھنے کے لئے اردو میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اس عظیم الشان کتاب میں الفاظ قرآن کی مکمل اور دلپذیر تشریح کے ساتھ تمام متعلقہ بحثوں کی تفصیل بھی ہے۔ ایک مدرس اس کتاب کو پڑھ کر قرآن مجید کا درس دے سکتا ہے اور ایک عام اردو خواں اس کے مطالعہ سے نہ صرف قرآن شریف کا ترجمہ بہت اچھی طرح کر سکتا ہے بلکہ اس کے مضامین کو بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے اور اہل علم و تحقیق کے لئے اس کے علمی مباحث لائق مطالعہ ہیں "لغات قرآن" کے ساتھ الفاظ قرآن کی مکمل اور آسان فہرست بھی دی گئی ہے جس سے ایک لفظ کو دیکھ کر تمام لفظوں کے حوالے بڑی سہولت سے نکالے جا سکتے ہیں۔ "مکمل لغات قرآن" اپنے انداز کی لاجواب کتاب ہے جس کے بعد اس موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

جلد اول	صفحات	٣٣٤	بڑی تقطیع	غیر مجلد	پانچ روپے	مجلد	چھ روپے
جلد دوم	〃	٣٣٦	〃	〃	پانچ روپے	〃	چھ روپے
جلد سوم	〃	٣٣٢	〃	〃	پانچ روپے	〃	چھ روپے
جلد چہارم	〃	٣٨٦	〃	〃	چھ روپے	〃	سات روپے
جلد پنجم	〃	٥٠٠	〃	〃	آٹھ روپے	〃	نو روپے
جلد ششم	〃	٣٢٤	〃	〃	پانچ روپے	〃	چھ روپے

(پوری کتاب کے مجموعی صفحات ٢٢١٢)

مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

ندوۃ المصنفین دہلی

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبر آبادی

برہان دہلی

جلد: ٦٩	ماہ شوال المکرم ۱۳۹۲ھ مطابق نومبر ۱۹۷۲ء	شمارہ ۵

۱۔ نظرات	سعید احمد اکبر آبادی	۲۹۰
مقالات		
۲۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	سعید احمد اکبر آبادی	۲۹۴
۳۔ رسول شاہد و مشہود	جناب قاری بشیر الدین صاحب (پنڈت) ایم۔ اے، نیشنل ایوارڈی شاہجہانپور	۳۰۸
۴۔ امام دارمی اور ان کی سنن	جناب مولوی محمد عبید اللہ صاحب رفیق ندوۃ المصنفین	۳۲۴
۵۔ مرزا غالب اور مدرسہ سرکار کمپنی	جناب پروفیسر ابو محفوظ الکریم معصومی مدرسہ عالیہ کلکتہ	۳۳۶
۶۔ غالب اور معراج الخیال	ڈاکٹر شریف حسین صاحب قاسمی ایم اے شعبۂ فارسی۔ دہلی یونیورسٹی۔	۳۴۴
۷۔ ادبیات "انسان" غزل	جناب ڈاکٹر اسماء سعیدی۔ ایم۔ اے بی۔ ایڈ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ دہلی۔	۳۴۸
۸۔ تبصرے	س۔ ع	۳۵۴

نظرات

گذشتہ ماہ کے نظرات پڑھ کر کلکتہ سے ایک دوست نے ایک عجیب وغریب خط لکھا ہے، ان کے دماغ میں جو سوال پیدا ہوا ہے، ممکن ہے کسی اور صاحب کو بھی اسی قسم کا کوئی وسوسہ ہو اس لیے موصوف کا اصل خط اور اس کا جواب برہان میں شائع کیا جاتا ہے خط کا مضمون بعینہٖ یہ ہے۔

" برہان اکتوبر کا پرچہ دیکھا ماشاء اللہ آپ کے زور قلم کا کیا کہنا، نظرات پڑھکر ایک سوال دل میں آیا وہ بلا کم وکاست آپ کی خدمت میں ارسال ہے، امید ہے کہ قاری عبدالمنان صاحب امام مسجد کولوٹولا اسٹریٹ کلکتہ کی معرفت مطمئن کر دیں گے، سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے وہ صحابہ جنہوں نے آپ کی طرح یورپ کا سفر نہیں کیا تھا ان کو فتویٰ دینے کا حق حاصل تھا یا نہیں اور دور کیوں جائیے آپ کے زمانہ میں، مفتی محمد کفایت اللہ، مولانا عزیز الرحمن صاحب دیوبندی، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا حسین احمد مدنی جو اپنے زمانہ کے مسلم الثبوت علماء تھے، چونکہ ان میں سے کوئی بھی یورپ نہیں گیا تھا اور قاضی ابو یوسف کی ہدایت پر عمل نہیں کیا تھا، کیا ان کو فتوے دینے کا حق پہونچتا تھا؟ مہربانی فرماکر جواب عنایت فرمائیے، شکر گذار ہوں گے"

جواباً گذارش یہ ہے کہ نظرات کے شذرہ متعلقہ کی بنیاد دو چیزیں تھیں، ایک امام ابو یوسف کا مقولہ اور دوسرا مولانا عبداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد، آپ نے ان دونوں [illegible] کر دیا ہے

حالانکہ دونوں کی حیثیت الگ الگ ہے، امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ فتوے کا تعلق جن مسائل سے ہوتا ہے وہ دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ مسائل جن کی حیثیت اصولی اور کلیاتی ہوتی ہے ۔ مثلاً عبادات کے ارکان و شرائط ، ان کے فرائض اور واجبات، ان کے منہیات و مباحات اور اسی طرح نکاح و طلاق وغیرہ کے اصولی مسائل ۔ اور دوسرے وہ مسائل جن میں افراد و اشخاص متعلقہ کے اور اگر مسائل زیادہ عمومی حیثیت رکھتے ہوں تو صرف افراد و اشخاص نہیں بلکہ اقوام و ملل کے احوال و ظروف کا پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے اور چونکہ ایک مفتی کو سابقہ دونوں قسم کے معاملات سے ہوتا ہے اس بنا پر امام ابویوسف نے فرمایا کہ ایک صاحبِ افتا کو اس منصب کا حق ادا کرنے کے لیے جہاں اور بہت سے اوصاف و کمالات سے متصف ہونا چاہئے ان میں ایک شرط معرفت احوال زمانہ کی بھی ہے"۔

اور چونکہ احوال زمانہ متغیر و متبدل ہوتے ہیں اور ان احوال کا اثر اقوام و ملل اور افراد و اشخاص کے حالات پر ہوتا ہے اس بنا پر ہر عہد کے مفتی کے لیے ضروری ہے کہ اس کو اپنے عہد کے حالات کا علم ہو، یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے مسائل میں ایک عہد اور ایک زمانہ کے مجتہدین کے احکام مجتہد فیہا دوسرے اور اس سے مختلف زمانہ کے لوگوں کے لیے حجت تو ہو سکتے ہیں واجب العمل نہیں ہو سکتے امام ابویوسفؒ نے اپنے مقولہ میں اسی امر کی طرف توجہ دلائی ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ ایک بہت اہم اور ضروری حقیقت کا انکشاف کیا ہے !

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے اور چونکہ علامہ اقبال کے لفظوں میں " جہانگیری کے لیے جہاں بینی شرطِ اوّل ہے"، اس بنا پر قرآن میں مختلف قوموں کے قصص بیان کئے گئے ہیں، کائنات ارض و سماء میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے، عہد نبوی میں روم کی شہنشاہیت اور ایرانی سلطنت دنیا کی دو عظیم طاقتیں تھیں، سیرت نبوی اور صحابہ کرامؓ کے حالات کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کس طرح ان دونوں حکومتوں اور ان کے ملک اور قوم کے حالات سے پوری طرح باخبر رہتے تھے، آپ کے ہاں باقاعدہ جاسوس تھے۔ پرچہ نویس تھے اور اطلاعات و خبر رسانی کا باضابطہ انتظام تھا۔ اس موضوع پر مندرجہ ذیل کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ (۱) التراتیب الاداریہ از کتانی (عربی) (۲) اسلامی حکومت کا نظم ونسق، ڈاکٹر حمید اللہ (انگریزی) (۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست، از مسٹر افضل اقبال (انگریزی) (۴) حدیث دفاع از میجر محمد اکبر (اردو) علاوہ ازیں احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران وروم ہی نہیں جن سے عربوں کا سابقہ براہ راست تھا، آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم دوسری قوموں (جن کو آپ نے اعاجم فرمایا ہے) کے حالات سے بھی باخبر تھے۔ چنانچہ ان لوگوں میں جو اچھی باتیں تھیں ان کو آپ نے سراہا ہے اور جو بری باتیں تھیں ان کی مذمت فرمائی ہے۔ ظاہر ہے جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ حال تھا تو صحابہ کرام کی جہاں بینی کا عالم کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ دشوار نہیں ہے۔ مسلمانوں کے فنِ تاریخ پر عربی اور انگریزی اور فرانسیسی میں دسیوں اہم اور بلند پایہ کتابیں ہیں ان کا مطالعہ کرنا چاہئے، سب حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

اب رہا مولانا عبیداللہ سندھی کا ارشاد! تو چونکہ ہمارے زمانہ میں فکری، سیاسی، علمی اور معاشی و معاشرتی انقلابات جو کچھ بھی ہو رہے ہیں اور دنیا کی ہر قوم پر جن کے اثرات پڑ رہے ہیں ان کا سرچشمہ یورپ ہی ہے اس لیے مولانا کا مطلب یہ ہے کہ جب تک ہم اس سرچشمہ سے واقف نہیں ہوں گے دنیا کے حالات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکیں گے۔ البتہ علم دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک بلاواسطہ اور براہ راست اور دوسرا بالواسطہ جو اخبارات و رسائل اور لٹریچر کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے، مولانا کا منشا یہ ہے کہ اسلام کا تقاضا ہے کہ ایک عالم دین کو ان حالات سے واقف ہونا ضروری ہے، اگر خدا توفیق دے تو براہِ راست ورنہ بالواسطہ ہی سہی، آخر میں یہ جتا دینا بھی ضروری ہے کہ نامہ نویس نے چند علماء کے نام لکھ کر سوال کا رخ دوسری طرف کر دیا ہے، ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں گفتگو ہمیشہ

اصول اور حقائق سے کرتا ہوں۔ افراد و اشخاص سے مجھ کو بحث نہیں ہوتی۔ بہر حال اسلام کو اگر آپ اچھی طرح سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کا علمی مطالعہ کیجئے، محض تبلیغی لٹریچر کا مطالعہ کافی نہیں ہے۔

افسوس ہے گذشتہ مہینہ ہمارے دو مخلص قومی کارکن، ملا جان محمد کلکتہ اور مولانا محمد عاقل الٰہ آباد انتقال کر گئے۔ ملا صاحب کا اصل وطن پشاور تھا، لیکن عرصہ دراز سے کلکتہ میں آبسے تھے اور اب سچ مچ وہی ان کا وطن تھا، نہایت پرجوش، جری اور بیباک انسان تھے۔ گذشتہ نصف صدی میں کوئی قومی اور ملی تحریک ایسی نہیں ہے جس میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر اور ولولہ و عزم کے ساتھ حصہ نہ لیا ہو، ان کی علمی زندگی کا آغاز تحریک خلافت سے ہوا اور اختتام مجلسِ مشاورت پر! کلکتہ میں شاید ہی کوئی مسلم ادارہ (یہاں تک کہ محمڈن اسپورٹنگ کلب بھی) ایسا ہو جس میں ملا صاحب نے نمایاں حصہ نہ لیا ہو۔ اسی وجہ سے وہ کلکتہ کے لوگوں میں بیحد مقبول تھے، بڑے بے غرض بے لوث اور نہایت سادہ اور مخلص مسلمان تھے، ۱۹۶۴ء میں کلکتہ کے فساد میں لوگوں نے ان کو بچوں کی طرح چیختے اور روتے دیکھا ہے، عمر ۸۵ سال کے قریب تھی۔

مولانا محمد عاقل الٰہ آبادی دارالعلوم دیوبند کے باقاعدہ فارغ التحصیل تھے اور استعداد بھی اچھی اور پختہ تھی، کچھ دنوں کسی مدرسہ میں درس کا کام بھی کیا تھا، لیکن طبیعت کا اصل رجحان قومی اور ملی کاموں کی طرف تھا اس لیے جمعیۃ علماء سے وابستہ ہو گئے ان میں تنظیم کی بڑی اچھی صلاحیت تھی اور خاموش کام کرنے کے عادی تھے۔ جمعیۃ کی موجودہ ہیئت و تنظیم سے اختلاف ہوا تو اس سے الگ ہو کر مجلس مشاورت کے سرگرم کارکن بن گئے اور ادھر بھی سرد بازاری دیکھی تو مسلم مجلس میں چلے گئے اور اسی حالت میں چند ماہ بیمار رہ کر داعی اجل کو لبیک کہا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں خادمان ملت کو مغفرت و بخشش کی نعمتوں سے نوازے!

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اسلامیان ہند کا تہذیبی ورثہ

(۵)

از :- سعید احمد اکبر آبادی

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جس چیز کو عرف عام میں مذہبیت کہتے ہیں اس ... محسن الملک کا مقام سرسید سے بلند تر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سکریٹری شپ کے ز... اسلامی تہذیب کے مذہبی نقش و نگار میں زیادہ نکھار پیدا ہوا، وہ اپنی تقریروں ... دیتے تھے اور مسلمان طلبا، کو عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے پکے اور سچے ... کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک لکچر میں کس سوز و گداز سے طلبا کو ...

"اگر تمہارے ذہن میں اسلام کی سچائی کا یقین نہ رہے اور تم ... اور جیسے کہ نام اور صورت کے مسلمان ہو تو تمہارے علم سے جہل اچھا، تمہ... بہتر، بلکہ سچ پوچھو تو تمہاری زندگی سے قوم کے لیے تمہاری موت ... اس سے کہ تم عالم بن گئے، حکیم اور فلسفی ہو گئے، دنیا کے تمام علوم ... تحقیقاتوں اور یونان کے پرانے علوم میں استاد ہو گئے، مگر مسلمان نہ رہے ... جب تمہارے دل میں اسلام ہی نہ رہا تو قوم تم پر کیا فخر کرے گی۔ تمہارا نام ... میں دیکھکر کیا خوش ہوں گے۔ تمہارے گلے میں خطابی تمغوں کے ہار پڑے ہو...

کیا کوئی باپ اپنے بیٹے کو گود میں بٹھاتا ہے جب کہ اس کی جان نکل گئی ہو، گو وہ کیسا ہی خوبصورت اور پیارا کیوں نہ ہو، بس اسلامی کردار اس درس گاہ کی اور اسلام تمہاری جان ہے، اس کے بغیر کوئی کیسا ہی عالم و فاضل کیوں نہ ہو جائے وہ ایک مٹی میں دبانے کے قابل، اور ایک نعش ہے زمین میں چھپانے کے لائق ہے۔ ؎

موصوف جیسا دیدہ ور اور بالغ نظر بزرگ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک لیڈر کو قوم کا صرف ماتم گسار اور اس کی عظمتِ گذشتہ کا مرثیہ خواں یا نکتہ چیں و نقاد نہیں ہونا چاہئے، جو ہر وقت قوم کے معائب و مثالب اور اس کی کمزوریوں اور برائیوں کو بیان کر کر کے اس کو مطعون کرتا رہے کہ اس سے قوم احساسِ کمتری کا شکار ہو کر مٹ جاتی ہے اور اس میں ابھرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی بلکہ لیڈر کا فرض یہ بھی ہے کہ قوم میں اگر کوئی جوہر قابل موجود ہے تو اسکو ابھارے [illegible] تعریف کرے تاکہ اس میں حوصلہ و ولولۂ عمل پیدا ہو۔ بہرحال ایک لیڈر [illegible] [illegible] کے ساتھ [illegible] بشیری کا ہونا بھی ضروری ہے، نواب محسن الملک [illegible]

[illegible] میں چنانچہ ۱۸۹۲ء [illegible] لیڈر [illegible]

[illegible] میں چھاپ دیا گیا تھا، اس کی ایک [illegible]

[illegible]

[illegible] دستیاب نہ ہو سکا، اس لیے محسن الملک کے ساتھ میں اگر کوئی [illegible]

[illegible] ہمارے مسلم یونیورسٹی نمبر سے ماخوذ ہے۔

[illegible] سا ہر پایا لیا ہے:۔

سے دیتے ہیں! فرماتے ہیں:۔

"کلا واللہ، کلا واللہ، کلا واللہ، والذی نفسی بیدہ کلہ، ھوالذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمتہ وھو الولی الحمید ہم اگرچہ بیمار ہیں مگر ابھی مرے نہیں، گو ابھی ضعیف ہوگئے ہیں مگر ابھی دم نہیں توڑا۔ دماغوں کی قوت، دلوں کا جوش اور طبیعتوں کا ولولہ بلاشبہ بہت کم ہوگیا ہے، مگر ابھی باقی ہے، وہ دل کو ہلا دینے والی آواز "اللہ اکبر" کی جو ہمارے بزرگوں کے منہ سے نکلی تھی، اگرچہ سست پڑگئی ہے، مگر کانوں میں اب تک گونجتی ہے، وہ خوبصورت تصویر اسلام کی جو ہمارے باپ دادا نے کھینچی تھی اور جس نے ساری دنیا کو اپنا گرویدہ اور فریفتہ کرلیا تھا۔ اگرچہ نقاب میں چھپ گئی ہے، مگر ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئی وہ ابراہیمی خون جو ہماری رگوں میں دوڑتا پھرتا تھا، اگرچہ دھیما پڑگیا ہے مگر ابھی جاری ہے، وہ ہاشمی جوش جو ہمارے سینوں میں بھرا ہوا تھا، اگرچہ سست ہوگیا ہے مگر ابھی باقی ہے، وہ نور اسلام جس سے ہمارے دل روشن تھے، اگرچہ دھندلا ہوگیا ہے مگر ابھی بجھا نہیں، اب بھی اسلام کی حرارت اس قدر باقی ہے کہ اسلام کا نام سن کر وجد میں آجاتے ہیں، مذہب کا جوش اب تک اتنا ہے کہ دین کی آواز سنتے ہی چونک پڑتے ہیں، اور یہی دلیل اس بات کی ہے کہ اسلام ابھی باقی ہے اور مسلمان ہنوز زندہ ہیں، اور جب تک زندگی ہے، ہر طرح کی امید ہے (ص ۱۲، ۱۳)

فرقہ پرستی سے دور رہنے کی تاکید

جس طرح کوتاہ نظر آج یونیورسٹی کو فرقہ پرستی کا الزام دیتے ہیں، اسی طرح محسن الملک کے زمانے میں بھی گاہے بگاہے اس قسم کی آوازیں کالج کے خلاف بلند ہوتی رہتی تھیں اور جیسا کہ

لہ ترجمہ:۔ بخدا نہیں، بخدا نہیں، بخدا نہیں، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس کی قسم تو وہ ہے جو لوگوں کے مایوس ہوجانے کے بعد بارش برساتا ہے اور اپنی رحمت کو پھیلا دیتا ہے کارسازِ مطلق اور لائق حمد ہے۔

آگے چل کر ہم مفصل گفتگو کریں گے، علی گڑھ کالج ہندو فرقہ پرستوں کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکنے لگا تھا اور وہ موقع بموقع اس کا اظہار کرتے رہتے تھے، لیکن اس کے باوجود کالج کا معاملہ کیا تھا! اس کا اندازہ اس ایک خطاب سے ہوگا جو نواب محسن الملک نے ایک مرتبہ طلبا سے کیا تھا، اس میں آپ نے فرمایا:۔

"اے میرے عزیز بچو! کبھی ایسے خیال کو (فرقہ پرستی) تم دل میں نہ لانا، کبھی ایسی بات کو جس سے جھگڑا پیدا ہو نہ سنو، ہندوؤں کو اپنا بھائی سمجھو، ان کے بزرگوں کو عزت اور ادب سے یاد کرو۔ ان کے ساتھ محبت اور اخلاق سے پیش آؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے ساتھ سچا دوستانہ برتاؤ کرو جس سے وہ خود شرمندہ ہوں، وہ تمہارا تحمل اور تمہاری دوستی دیکھ کر تمہاری قدر کریں، وہ تمہارے بزرگوں کو نیکی سے یاد کرنے لگیں اور بجائے بدی کے نیکی کا برتاؤ دیکھ کر وہ خود اپنے طرزِ عمل کو بدلنے پر مجبور ہوں، یہ انصاف کی بات نہیں کہ تم اپنے آپ کو معصوم اور پاک سمجھو اور اختلاف کے سارے گناہ کا الزام ہندوؤں کو دو، تم اسی کالج کے نیک نام طالب علم اور سرسید کے سچے مقلد اور ہمارے پیارے عزیز اسی وقت سمجھے جاؤ گے جب کہ تم اپنے ہم وطنوں اور اپنے بھائیوں کی ناگوار باتوں سے چشم پوشی کرو اور ان کی اچھی باتوں کو دل سے سنو، ان ناقص تعلیم یافتوں کو نہ دیکھو جو اختلاف پیدا کرنے کے خواہاں ہیں، بلکہ ان عالی دماغ ہندوؤں کی باتیں سنو جو اتحاد اور اتفاق بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

غور کیجئے! کیا نواب محسن الملک کی یہ تقریر بعینہٖ قرآن مجید کی حسب ذیل ان آیات کی ترجمان نہیں ہے جن میں فرمایا گیا ہے، جو لوگ تمہارے مخالف ہیں ان کے ساتھ مجادلہ ایک ایسے طریقہ پر کرو جو سب سے بہتر ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہو کہ تمہارا اکٹر دشمن بھی تمہارا پکا دوست بن جائے، اس کے بعد اس پر بھی متنبہ فرما دیا گیا کہ یہ راستہ اختیار کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے، چنانچہ ارشاد ہوا۔ اور ہاں! اس راہ کو وہی لوگ اختیار کر سکتے ہیں جو صبر کے خوگر ہوتے ہیں اور جو لوگ بڑی قسمت والے ہوتے ہیں، اسی کے قریب المفہوم وہ آیت ہے جس میں فرمایا گیا ہے:۔

"ہاں دیکھو کسی قوم کا بغض تم کو عدل و انصاف کے جادہ سے منحرف نہ کر دے، تم بہرحال عدل ہی کرو۔ پرہیزگاری کا قریب ترین راستہ یہی ہے"

ایک اور موقع پر نواب محسن الملک نے طلباء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"دوسروں پر الزام رکھ دینے سے کام نہیں چلتا ہے، یاد رکھو تم ہرگز سرسید کے پیرو نہ سمجھے جاؤ گے اور نہ تم تعلیم یافتہ کہلائے جانے کے مستحق ہوگے اگر تم نے (فرقہ پرستی کے) اس زہریلے مادہ کو اپنے جسم میں سرایت ہونے دیا اور تم نے بھی ہندو مسلم میں فرق سمجھا، اگر تم ایسا کرو گے تو اس کا نقصان نہ صرف تم کو ہوگا، بلکہ تمہاری ساری قوم کو ہوگا اور نہ صرف تم بدنام ہوگے، بلکہ یہ کالج بھی بدنام ہوگا، اور ہم پر اس کا الزام آئے گا۔ مجھے نہایت روحانی تکلیف ہوتی ہے جب میں بعض اخباروں میں پڑھتا ہوں کہ علیگڈھ پارٹی متعصب ہے اور اس کے تعلیم یافتہ نوجوان ہندوؤں کے مخالف ہیں، میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ خیال کہاں تک صحیح ہے، اگر اس کا خیال یا عمل اس پر ہو تو میں پوچھتا ہوں کہ یہ سبق تم کو کس نے سکھایا؟ کیا مرحوم سرسید نے؟ اور کیا ہم نے؟ حاشا و کلا نہ سرسید اور نہ ہم اس کے ملزم ہیں، بلکہ برخلاف اس کے ہم نہایت حقارت و نفرت سے ایسی باتوں کو دیکھتے ہیں"

جس کو ہم "تہذیب" کہتے ہیں وہ دراصل نام ہے زندگی اور کائنات کے متعلق ایک مخصوص نقطۂ نظر اور اس کے مطابق اپنے کردار کو بنالینے کا۔ اس بنا پر اسلامی تہذیب کے معنی ہوتے کہ زندگی اور کائنات کی نسبت وہ عقیدہ اور نقطۂ نظر رکھنا جو اسلام کی تعلیمات پر مبنی ہو اور کہ کے مطابق اپنا کیرکٹر بنانا، محسن الملک نے یہ جو فرمایا قرآن کی تعلیمات کے مطابق تھا۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سرسید اور ان کے جانشین علیگڈھ کالج (اور اب یونیورسٹی) کو جس اسلامی تہذیب کا نمائندہ بنانا چاہتے تھے وہ فرقہ پرستی سے اور ملکی و وطنی معاملات میں ہندو

کے فرق و امتیاز سے کس درجہ نفور اور بلند تھی، سر سید پر فرقہ پرستی کا الزام سب سے پہلے ان کی کانگریس کی مخالفت اور بعض شخصی طور پر ان کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے لگا۔ لیکن ان معاملات میں بھی انہوں نے اپنا دامن فرقہ پرستی کی گندگی سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ ہندوستان کے مشہور مورخ اور کمیونسٹ لیڈر ڈاکٹر محمد اشرف لکھتے ہیں :-

"آپ سر سید کو رجعت پرست کہہ سکتے ہیں، مگر فرقہ پرست کہنے میں حق بجانب نہ ہوں گے" (علیگڈھ تحریک صد ۱۸۰)

اس معاملہ میں جو کیریکٹر سر سید کا تھا وہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ ان کے جانشین کا تھا۔ اگر ان تمام تقریروں کے باوجود وہ فرقہ پرست تھے تو ہم بڑے خوش ہوں گے اگر ہمارے یہ دوست پنڈت مدن موہن مالویہ، ڈاکٹر مونجے، ساورکر یا کسی اور بڑے مہا سبھائی یا جن سنگھی لیڈر کی بھی کوئی ایسی تقریر پیش کر سکیں جس میں صرف ہندو طلبا سے خطاب کرتے وقت مسلمانوں کی نسبت اسی قسم کے جذبات و احساسات کا اظہار کیا گیا ہو۔

پھر وہی ہندی اردو جھگڑا

لیکن ابھی سر سید کے انتقال کو دو برس ہی ہوئے تھے اور نواب محسن الملک ہر چیز سے صرف نظر کر کے کالج کو ترقی دینے اور اس کی گذشتہ کوتاہیوں کی تلافی کرنے کی جد و جہد میں ہمہ تن مصروف تھے کہ انہیں دنوں میں سر انٹونی مکڈانلڈ کی گورنمنٹ نے اتر پردیش میں یہ حکم نافذ کیا کہ حکومت کے تمام سمن اور اعلانات آئندہ اردو اور ناگری حروف میں جاری ہوں گے اور کوئی شخص کسی عہدہ پر اس وقت تک مقرر نہ ہوگا جب تک وہ ان دونوں میں سرعت کے ساتھ بے تکلف لکھنے کی مہارت نہ رکھتا ہو۔ گورنمنٹ کے اس حکم نے مسلمانوں میں سخت بد دلی پیدا کر دی اور اس کے اظہار کے لیے انہوں نے جگہ جگہ جلسے منعقد کیے۔ اخبارات نے پے بہ پے مضامین شائع کیے، علیگڈھ اس وقت مسلمانوں کی قیادت کا مرکز تھا۔ اس کے لیے دامن بچانا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ ۱۳ رمئی سنہ ۱۹۰۰ء کو علیگڈھ میں ایک جلسہ ہوا جس میں بقول مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری

ل مودبان ... کے ایک

بحر پنڈر اسپیچ ناگری کے اجراء کے خلاف کی اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی
نے رزولیوشن اس مضمون کا پیش کیا کہ گورنر سے اس حکم کو واپس لینے کی درخواست
اس کے بعد ۱۸، اور ۱۹ ر اگست کو ایک عظیم الشان جلسہ لکھنؤ میں ہوا۔ اب نواب محسن الملک
تحریک (جو بعد میں انجمن ترقی اردو ہند) کے صدر بھی ہو چکے تھے۔ اس لیے اس حیثیت سے
انہوں نے اس جلسہ میں بھی ناگری کی مخالفت میں بڑی معرکہ آراء تقریر کی۔ حکومت ان کی پہلی تقریر
سے ہی کچھ کم ناراض نہ تھی کہ اب اس دوسری تقریر نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ چنانچہ لفٹنٹ گورنر خود
علیگڈھ آیا۔ کالج کے ٹرسٹیوں سے ملاقات کی اور ان سے کہا کہ "نواب محسن الملک دونوں کام نہیں
کر سکتے یا وہ علیگڈھ کالج کے سکریٹری رہیں یا انجمن اردو کے صدر، نواب محسن الملک کو اس کا علم ہوا
تو انہوں نے فوراً کالج کی سکریٹری شپ سے استعفا دے دیا، حکومت کو اس پر اور ناراضگی ہوئی اور
دوسری جانب ٹرسٹیوں نے بھی بہت اصرار کیا لیکن نواب محسن الملک نے استعفا واپس نہیں لیا۔ البتہ
وقار حیات کے مصنف مولوی محمد اکرام اللہ خاں صاحب ندوی لکھتے ہیں۔ "ابھی یہ مسئلہ (یعنی
استعفا واپس لینے نہ لینے کا) زیر بحث تھا کہ مکڈانلڈ کا دور حکومت ختم ہو گیا اور سر جیمس لاٹوش انکے
جانشین ہوتے۔ ان کو کالج سے اور مسلمانوں کی ترقی سے یک گونہ دلچسپی تھی، ان کے عہد میں بھی یہ
مسئلہ پیش ہوا۔ آخر سر جیمس خود علیگڈھ آئے اور وہاں جب انہوں نے ٹرسٹیوں اور نواب محسن الملک
کو اس بات کا یقین دلایا کہ گورنمنٹ کسی کی آزادی سلب نہیں کرے گی تو نواب صاحب نے استعفا
واپس لے لیا اور پھر کالج کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا، یہ واقعہ نواب صاحب کی
خودداری، عزت نفس اور حق گوئی کی دلیل روشن ہے، اسلامی تہذیب اور اسلامی کردار کے معاملہ
میں بھی ان کے تشدد کا یہ عالم تھا کہ کالج میں بائیبل کی تعلیم کا جو سلسلہ وہاں کے مقامی مشنری نے
شروع کیا تھا، نواب محسن الملک نے اس کو حکماً بند کرا دیا، مشنری خواتین نے اس کی مزاحمت کی
مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

نواب محسن الملک کی زندگی کا عظیم کرائسس | تعلیم اور ڈسپلن کے اعتبار سے کالج

کے یورپین اسٹاف نے جو خدمات انجام دیں ان کا اعتراف نہ کرنا ناسپاسی ہوگا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انتظامی اعتبار سے یہ اسٹاف سانپ کے منہ کا چھچھوندر بن گیا۔ اس سے دامن چھڑاتا آسان تھا اور نہ اسکے ساتھ نباہ کرنا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، سرسید کو زندگی کا سب سے بڑا حادثہ جس نے ان کا کام ہی تمام کر دیا اسی یورپین اسٹاف کے باعث پیش آیا تھا اور اب اس واقعہ کے کم و بیش دس برس کے بعد پھر اسی قسم کا ایک عظیم حادثہ نواب محسن الملک کو پیش آیا۔ وقار حیات کے بیان کے مطابق اس واقعہ کی روئداد یہ ہے کہ ۱۹۰۵ء میں جب بعض وجوہ سے پرنسپل مارلین نے علیگڑھ کو چھوڑنے کا ارادہ کیا اور کالج کے ٹرسٹیوں نے اس کو منظور بھی کر لیا تو اب پرنسپل مارلین نے اپنی قائم مقامی کیلئے خود ایک سینئر پروفیسر مسٹر کارنا کا نام پیش کیا۔ نواب محسن الملک اس انتخاب سے خوش نہ تھے، لیکن بعض مجبوریوں کے باعث انہوں نے اس سفارش کو منظور کر لیا تھا، لیکن کارنا ایک نہایت بد دماغ اور تند خو انگریز تھا۔ مسلمانوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت کی تعطیل جو کالج میں ہوتی تھی اس کو اس نے بند کر دیا تھا، غرض کہ مسٹر کارنا سے متعلق اسی قسم کی باتیں پبلک میں مشہور تھیں۔ اس بنا پر جب مارلین کے بعد اسی شخص کی نامزدگی کا چرچا پبلک میں ہوا تو آگ لگ گئی، اخبارات نے مضامین لکھے، مختلف انجمنوں نے احتجاجی جلسے کئے، اس مخالفت میں نواب وقار الملک نے قائدانہ رول ادا کیا۔ انہوں نے ایک مفصل خط ٹرسٹیوں کے نام لکھا اور اس میں بتایا کہ سرسید کا کالج قائم کرنے سے اصل مقصد کیا تھا اور اب تک ایک سینئر پروفیسر کی حیثیت سے مسٹر کارنا کا جو طرزِ عمل کالج کے طلباء ملازمین اور کالج کی روایات کے ساتھ رہا ہے اس سے سرسید کے مقصد کو کس درجہ عظیم نقصان پہونچا ہے، نواب صاحب نے اس گشتی مراسلہ میں کارنا کے متعلق یہاں تک لکھا ہے کہ اس شخص کی بد دماغی کا یہ عالم ہے کہ ایک مرتبہ بورڈنگ ہاؤس کے ملازموں سے کہا کہ تمہاری عشا اور صبح کے وقت کی اذان سے مجھکو بہت تکلیف ہوتی ہے، اگر تم اس کو بند نہ کرو گے تو میں تمہاری نماز کا چبوترہ اکھاڑ کر پھینکوا دوں گا، اسی شخص نے ایک مرتبہ غصہ میں کہا: "مسلمانوں کے لیے تو انگریزی کی بجائے

نعلیندری کی تعلیم زیادہ مفید ہوگی"، سربرآوردہ اور ممتاز حضرات میں مولانا حالی نواب عماد الملک رائے کے سب سے بڑے مؤید تھے۔ مسٹر کارنل کی نسبت جو باتیں اوپر بیان کی گئی ہیں اگر وہ صحیح تو اب تعجب اس پر ہوتا ہے کہ نواب محسن الملک جیسا مذہبی، خوددار اور غیرتمند ہنگ کا ایسے اسلام دشمن اور مغرور و بددماغ انگریز کو کالج کا پرنسپل بنانے پر کیسے رضامند ہوگیا؟

اس سلسلہ میں امور ذیل کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے:

(۱) اگرچہ نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک دونوں قوم کے نہایت مخلص خادم اور عقیدہ و عمل کے اعتبار سے پکے اور سچے مسلمان تھے، لیکن افتاد طبیعت کے اعتبار سے دونوں میں بون بعید تھا۔ چنانچہ .... نواب محسن الملک کی سکریٹری شپ کے زمانہ میں جب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے کوشش کی کہ نواب وقار الملک بھی نواب محسن الملک کے ساتھ مل کر کام کریں تو اول الذکر نے صاف انکار کردیا اور اس کی وجہ بھی بتائی کہ میں نواب محسن الملک کے ساتھ کام نہیں کرسکتا۔ صاحبزادہ موصوف کو اپنی تجویز پر اصرار اس لیے تھا کہ — جیسا کہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی نے "وقارِ حیات" کے مقدمہ میں نقل کیا ہے (ص) — ان کی رائے تھی "محسن الملک تیل ہی تیل ہیں" وقار الملک لوہا ہی لوہا، جب تک دونوں نہ ملیں کالج کی مشین نہیں چل سکتی"۔ [1]

---

[1] اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اختلاف کہاں نہیں ہوتا۔ لیکن چونکہ اولاً ان دونوں کا اختلاف بعض مسائل میں سرسید کے ساتھ اور پھر ان دونوں کا اختلاف آپس میں جو کچھ بھی تھا خلوص اور نیک نیتی پر مبنی تھا اس بنا پر یہ اختلاف کبھی خلاف نہیں بنا اور ایک دوسرے کے ساتھ ذاتی ادب و احترام کے برتاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا، چنانچہ سرسید اور نواب وقار الملک کے اختلاف کے سلسلہ میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی ایک نہایت حیرت انگیز واقعہ یہ لکھتے ہیں کہ " (نواب وقار الملک کے انتہائی) عروج حیدرآباد کے زمانہ میں ایک مجمعِ اکابر نے یہ سماں دیکھا کہ وقار الملک کی ترکی ٹوپی ان کے ہاتھ میں ہے، گھٹا ہوا سر سرسید کے (باقی اگلے صفحہ پر)

(۴) کالج کے یورپین اسٹاف میں سب لوگ ایک ہی مزاج اور طبیعت کے نہیں تھے اور نہ ہو سکتے تھے۔ لیکن سب سے بڑا اور مشکل مسئلہ یہ تھا کہ اس اسٹاف کے بعض ناپسندیدہ لوگوں کے خلاف اگر کوئی اقدام کیا جائے تو یہ دیکھنا ضروری تھا کہ حکومت پر اس کا اثر کیا ہوگا! حکومت قومی یا جمہوری تو تھی نہیں، آمرانہ تھی، اگر کالج حکومت کا معتوب ہو جائے تو لڑکوں کو

(بقیہ صفحہ ۳۰۲) سامنے جھکا ہے۔ زبان سے کہہ رہے ہیں "یہ سر حاضر ہے جوتیاں ماریئے، مگر عرض یہی کروں گا کہ رائے آپ کی غلط تھی۔ (ص ۱۰) اسی طرح یہ بھی سن لیجئے کہ نواب وقار الملک کے سخت اختلاف کے باوجود جب لیک اخبار کے نامہ نگار نے نواب محسن الملک سے انٹرویو لیتے ہوئے ان سے اس اختلاف کی وجہ پوچھی اور ساتھ ہی اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ نواب وقار الملک سکریٹری شپ کے خواہاں ہوں گے تو نواب محسن الملک نے نہایت صفائی اور بڑی قوت سے فرمایا۔" بمقتضائے بشریت مجھے اس کا رنج ہوا ہے، مگر میں یقین کرتا ہوں کہ جو کچھ انہوں نے لکھا گو کیسا ہی سخت لکھا ہے مگر ذاتی مخالفت یا رنج کی وجہ سے نہیں لکھا۔ بلکہ اپنے نزدیک قوم اور کالج ہی کے فائدہ کی غرض سے لکھا ہوگا۔ اس لیے میں ان کی گالیوں کو بھی ان کی نیک نیت پر خیال کر کے اپنے لیے تنبیہہ اور ہدایت سمجھتا ہوں"، (وقار حیات ص ۷۴۴) رہا یہ خیال کہ وقار الملک خود سکریٹری بننے کے خواہشمند ہیں تو اس کی پرزور تردید کرتے ہوئے نواب محسن الملک نے فرمایا۔ وہ کبھی سکریٹری ہونے کے خواہاں نہیں ہیں، اگر کوئی ایسا وقت آ بھی جائے کہ لوگ ان کے سکریٹری بنانے جانے پر اصرار کریں تو شاید بہت ہی مجبوری اور کالج کی ہمدردی کے خیال سے وہ منظور کریں، ورنہ ان کو سکریٹری شپ کے منظور کرنے میں عذر ہوگا۔ اور یہ محض میرا خیال ہی نہیں ہے۔ بلکہ پچھلے واقعات سے اس کا بیّن ثبوت ملتا ہے۔ مجھے رنج ہوتا ہے جب لوگ ایسی بدگمانی ان کی نسبت مشہور کرتے ہیں۔ (ص ۷۴۴) یہ پڑھتے وقت یہ امر پیش نظر رہے کہ اس زمانہ میں علی گڈھ کالج کا سکریٹری پوری قوم کا سرتاج ہوتا اور ملت اسلامیہ کا نہایت قابل احترام بزرگ سمجھا جاتا تھا، بہرحال آپ نے دیکھا! علیگڈھ جس اسلامی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے اس کے خدوخال کیا ہیں؟ اور جن بندگوں نے اپنے خون جگر سے اس چمن کی آبیاری کی ہے وہ اخلاقی اعتبار سے کس مرتبہ و مقام بلند کے بزرگ تھے۔

سرکاری ملازمت کا ملنا اور مسلمانوں کے لیے ترقی کرنا مشکل ہوجائے گا۔ اسی قسم کے مواقع کی نسبت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ تم میں سے اگر کوئی شخص دو مصیبتوں میں گرفتار ہوجائے تو ان دونوں میں جو آسان مصیبت ہو اسے اختیار کرلے، حضورؐ کا یہ ارشاد اس درجہ اہم ہے کہ ہمارے فقہاء نے استنباط و استخراج احکام کے اصول میں اس کو بھی شامل کرلیا ہے اور اس کی اساس پر متعدد احکام وضع کیے ہیں جو کتب فقہ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

(۳) پرنسپل ماریسن جنہوں نے پروفیسر کارنا کے نام کی سفارش کی تھی انگریزوں کے صدر درجہ معتمد علیہ اور لفٹننٹ گورنر آف یوپی کے خاص دوست تھے اس بنا پر ان کی تجویز کو یکسر نظر انداز کردینا اچھے نتائج کا باعث نہیں ہوسکتا تھا۔

(۴) پروفیسر آرنالڈ جو علیگڈھ چھوڑ کر پنجاب چلے گئے تھے، نہایت شریف اور قابل قدر انگریز تھے، نواب محسن الملک نے اب ان کو پرنسپل کے عہدے پر بلانا چاہا مگر اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔

(۵) کارنا یقیناً مغرور اور بد دماغ انگریز ہوگا۔ لیکن جو باتیں نواب وقار الملک نے اپنے خط میں اس کی طرف منسوب کی ہیں وہ مبالغہ سے خالی نظر نہیں آتیں، خدانخواستہ یہ بات نہیں کہ نواب صاحب نے دروغ بیانی کی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص جماعت میں نیک نام ہو یا بدنام تو کچھ باتیں جو اس کی طرف منسوب ہوتی ہیں، حقیقت ہوتی ہیں اور کچھ یوں ہی غلط سلط اس کے متعلق مشہور ہوجاتی ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے:۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

اور ان کی نسبت کارنا کے وہ الفاظ اور مسلمانوں کی توہین و تذلیل میں اس کا وہ جملہ! طبیعت ہرگز باور نہیں کرتی کہ کوئی شخص علیگڈھ کے اس ماحول میں اس طرح کی بدتمیزی کرے اور پھر اپنا سر سلامت لے جائے، یہ انہونی سی بات ہے، یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے اندازہ

ہوگا کہ نواب وقار الملک کی سخت مخالفت کے باوجود اگر نواب محسن الملک مسٹر ماریسن کی سفارش کو منظور کرنے پر رضامند ہو گئے تھے تو محض بادل نخواستہ اور کالج کے مفاد اور اس کی غرض و غایت کے پیش نظر، ورنہ دل سے پروفیسر کارنا کو وہ بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ نواب وقار الملک بھی اس مصلحت اندیشی سے بے خبر نہیں تھے، چنانچہ وہ ایک خط میں جو انہوں نے اس سلسلہ میں مولانا حالی کو لکھا ہے۔ تحریر کرتے ہیں:۔

"جناب نے جو کچھ کہ ازراہِ دور اندیشی فرمایا ہے وہ ضرور قابلِ غور ہے اور اس کے علاوہ عالی جناب نواب محسن الملک بہادر جو ایک بات فرماتے ہیں وہ بھی توجہ کے قابل ہے، اور وہ یہ کہ اگر یورپین اسٹاف ہم سے بددل ہو جاتے اور انگلستان اور ہندوستان میں اس کا غل مچ جائے کہ علیگڑھ کالج میں کوئی قاعدہ و اصول باقی نہیں ہے اور نشتر حاکموں کی حکومت وہاں برداشت کرنی پڑتی ہے تو پھر آئندہ کسی پروفیسر کا میسر آنا بھی مشکل ہے۔" (وقار حیات ص ۴۲۸-۴۲۹)

لیکن اسی احساس اور نواب محسن الملک کے دل میں جو خطرات تھے ان کی واقعیت کو تسلیم کرنے کے باوجود فرماتے ہیں:۔

"اگر یہ خطرات سب صحیح ہیں تو بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی، ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔" (ص ۴۴۲)

بہر حال نواب وقار الملک کی جدوجہد اور ان کے پرزور اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر ماریسن اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے، اور پروفیسر کارنا کے بجائے مسٹر آرچبولڈ پرنسپل مقرر ہو گئے۔ اس طرح رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

کالج میں اسٹرائک

اس وقت تو خیر یہ معاملہ رفت و گذشت ہو گیا، لیکن اب کالج کا یورپین اسٹاف پہلا سا رہا ہی نہیں تھا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی شوشہ چھوٹتا رہتا تھا۔ مواد اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ آخر ایک دن یہ لاوا پھوٹ پڑا۔ طلباء

۔ جب اپنی شکایات پیش کرنے کے لیے اپنا ایک نمائندہ پرنسپل کی خدمت میں بھیجا تو پرنسپل نے اس کو ہاسٹل سے خارج کر دیا۔ اس سے طلبا میں آگ لگ گئی اور انہوں نے اسٹرائک کر دی، اسٹرائک کے وجوہ و اسباب کی تحقیق کے لیے ایک کمیشن مقرر ہوا۔ جس کے ایک ممبر نواب وقار الملک بھی تھے۔ انھوں نے کمیشن کی رپورٹ کے علاوہ اپنی ایک رپورٹ الگ بھی مرتب کی، اس رپورٹ کا حاصل یہ تھا کہ سکریٹری نے یورپین اسٹاف سے متعلق جو نرم رویہ اختیار کر رکھا ہے، یہ سارا فساد اسی کا ہے۔ چنانچہ اس رپورٹ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"بہت عرصہ سے ہم سنتے چلے آتے ہیں کہ فلاں معاملہ پر اس لیے زور دینا مناسب نہیں کہ کہیں یورپین اسٹاف بد دل ہو کر کالج نہ چھوڑ دے اور اب طلبا کی اس حال کی شورش سے ہمارے لیے ایک تازہ دھمکی یہ پیدا ہوتی ہے کہ کہیں طلبا اسٹرائک نہ کر دیں، اس قسم کے حالات کے لحاظ سے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم کو اپنا انتظام کافی احتیاط اور غور کے ساتھ منصفانہ اور صحیح اصولوں پر قائم کرنا چاہئے .... اور ہر ایک نقصان کو برداشت کرنے کے واسطے جو ڈسپلن قائم رکھنے کی غرض سے عائد ہو، ہم کو تیار رہنا چاہئے"

نواب محسن الملک پر اسٹرائک اور اس سلسلہ میں جو باتیں ان کے انتظام اور ان کی پالیسی سے متعلق کہی گئی تھیں ان سے متاثر ہو کر ۱۱ر مارچ ۱۹۰۷ء کو سکریٹری شپ سے استعفا دے دیا۔

وفات یہ خبر مشہور ہوئی تو ملک میں شور مچ گیا، ہر طرف سے خطوط آنے لگے کہ آپ کالج سے ترک تعلق رکھتے ہیں تو آخر اسے کس پر چھوڑتے ہیں۔ ادھر طلبا کو بھی اس کا سخت ملال ہوا اور انہوں نے استعفا واپس لینے کی درخواست کی۔ نواب صاحب اس پر رضامند تو ہو گئے اور استعفا واپس بھی لے لیا، لیکن اس سلسلہ میں ان کو جو سخت ناگوار باتیں سننی پڑی اور ان کے باعث پیہم صدمات دیکھنے پڑے تھے انھوں نے جانت پیدا کی

رو صحت بیمار ہو گئے۔ صحت کی بحالی کے ارادہ سے شملہ گئے تھے وہیں ستمبر ۱۹۰۷ء کو رگزائے عالم جاودانی ہو گئے ، انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

نواب وقار الملک کا عہد سکریٹری شپ

اس کے بعد کچھ دنوں نواب سر مزمل اللہ خاں قائم مقام سکریٹری رہے، لیکن یہ عارضی اور وقتی انتظام تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ فوراً کوئی مستقل انتظام کیا جائے اور وہ بھی ایک ایسے شخص کا جو ایڈمنسٹریشن کا پختہ اور وسیع تجربہ رکھتا ہو اور جس میں اس امر کی صلاحیت ہو کہ مختلف اسباب ووجوہ کے باعث کالج کی کشتی اس وقت جن ناگوار حالات کے گرداب بلا میں پھنس گئی تھی اس سے وہ اس کو باہر نکال سکے ، ظاہر ہے ، اس وقت ان صفات کا جامہ رنگین نواب وقار الملک کے قامتِ موزوں کے علاوہ اور کس کے راست آسکتا تھا۔ چنانچہ ۱۵ / دسمبر ۱۹۰۷ء کو کالج کے ٹرسٹیوں کا ایک ہنگامی اجلاس ہوا اور اس میں ممدوح متفقہ طور پر حسب ضابطہ دو تین برس کے لیے سکریٹری منتخب ہو گئے۔

رسولؐ شاہد و مشہود

(۳)

(از جناب قاری بشیر الدین صاحب پنڈت - ایم . اے)

یہودیوں کی حجاز میں آمد:- بیت المقدس کی دوبارہ تباہی و بربادی کے بعد بہت سے یہودی قبائل یثرب (حجاز) کی طرف چلے آئے۔ انھوں نے حجاز کی سرزمین کو کیوں پسند کیا کہ جہاں خورو نوش کی قلت، زمین بے آب و گیاہ تھی اور آب و ہوا بھی بمقابلہ عراق و شام اور مصر ناخوشگوار تھی تو اس میں بھی ایک راز ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے توریت پر نظر ... صراحت کی گئی ہے کہ " وہ نبی " جو اللہ تعالیٰ کے عہد کو پھر تازہ کرے گا وہ بنی اسرائیل ... (یعنی بنی اسمٰعیل) میں سے ہوگا۔ یثرب میں آئے گا اور یہ اس کا دار الہجرت بنے گا۔ مدینہ کی آبادی ایسی جگہ واقع ہے کہ اس کے شمال میں جبلِ احد، مغرب میں جبل سلع اور درمیان میں وادی مدینہ ہے توریت کے الفاظ میں :-

" خداوند کے لئے اے لوگو گیت گاؤ ...... بیابان اور قیدار کے گاؤں اپنی آواز بلند کریں۔ سلع کے بسنے والے گیت گائیں - پہاڑوں کی چوٹیوں سے للکاریں ...... خداوند بہادروں کی مانند نکلے گا۔ غیرت دکھلائے گا۔ نعرہ مارے گا۔ وہ دشمنوں پر غالب آئے گا "

(ملاحظہ ہو یسعیاہ باب ۴۲ آیات ۱۰ - ۱۷)

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ حضرتِ موسیٰؑ کے بعد نبی اکرم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسوا کوئی بھی ایسا نہیں آیا جس نے مشرکوں سے جہاد کیا ہو ...

پھر یہ نئی قیدار کون؟ کہاں رہتے ہیں؟ جبل سلع کس جگہ واقع ہے؟ ظاہر ہے کہ ان سب کا تعلق سرزمین حجاز سے ہے اس لیئے آنیوالا پیغمبر بھی حجاز ہی میں مبعوث ہوگا۔ اس نبی منتظر کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ "میں اُن کے لیئے (بنی اسرائیل کے لیے) ان ہی کے بھائیوں میں سے ایک نبی برپا کروں گا" (استثنا باب ۱۸) یہ نہیں کہا کہ "ان ہی (بنی اسرائیل) میں سے برپا کروں گا"۔ افسوس ہے کہ یہودی علمائے عوام کو اس وسوسہ میں گرفتار کردیا کہ اگرچہ اس پیغمبر کی بعثت اور ظہور کا مقام کوہ سلع کے قریب بتایا گیا ہے۔ مگر اس کا ظہور بنی اسرائیل ہی میں ہوگا۔ "بھائیوں کے لفظ سے دھوکے میں پڑ گئے حالانکہ بنی اسمٰعیل کا شمار بھائیوں میں ہے۔ بہرحال یسعیاہ نبی کی پیشینگوئی نے سمجھدار یہود کو توجہ دلائی کہ وہ فلسطین سے ہجرت کرکے جبل سلع کے قریب آبسیں کہ جہاں "موعود نبی" کا ظہور ہوگا چنانچہ مدینہ اور اطراف مدینہ کو انھوں نے اپنا مسکن بنا لیا۔ یہود کو قدرت نے یہ تیسرا موقع دیا تھا کہ وہ آنحضور پر ایمان لاکر دینی و دنیوی سعادتیں حاصل کریں۔ حضور نبی کریمؐ کی بعثت کی خوشخبریاں یہودی علماء اہالیانِ مدینہ کو سنایا کرتے تھے۔ لیکن جب وہ تشریف لائے تو منحرف ہوگئے کیوں؟ اس کی داستان طویل ہے البتہ جنہوں نے پہچاننا چاہا وہ پہچان گئے۔ فرقانِ حمید میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے:- "اَلَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ" یعنی جنھیں ہم نے کتاب عطا فرمائی وہ اس نبی کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے آدمی اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے اور بیشک انھیں ایک گروہ جان بوجھ کر حق کو چھپاتا ہے۔ (پارہ ۲ رکوع ۱)

کتبِ سابقہ میں نبی آخرالزماں حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصافِ حمیدہ ایسے واضح و صاف بیان کیئے گئے ہیں جن سے علماء اہلِ کتاب کو حضورؐ کے خاتم الانبیاء ہونے میں کچھ شک وشبہ باقی نہیں رہ سکتا اور وہ حضورؐ کے اس منصبِ عالی کو اتم یقین کے ساتھ جانتے ہیں۔ احبارِ یہودِ مدینہ میں سے جب ایک مستند و جیّد عالم حضرت عبداللہ بن سلامؓ

مشرف باسلام ہوئے تو سیدنا عمرؓ نے ان سے دریافت کیا کہ آیۃ میں [illegible] بیان کی گئی ہے اس کی کیا شان ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ اے عمرؓ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو بے اشتباہ پہچان لیا اور میرا حضورؐ کو پہچاننا اپنے بیٹوں کے پہچاننے سے بدرجہا زیادہ اتم واکمل ہے حضرت عمرؓ نے پوچھا یہ کیسے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ حضورؐ اللہ کی طرف سے اس کے فرستادہ رسول ہیں ان کے اوصاف اللہ تعالیٰ نے ہماری کتاب توریت میں بیان فرمائے ہیں بیٹے کی طرف سے ایسا یقین کس طرح ہو جبکہ عورتوں کا حال صرف انھیں تک محدود ہے، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا سر چوم لیا۔ (ملاحظہ ہو حاشیہ کنزالایمان ص۲۶)

اللہ تعالیٰ نے قرآن عزیز میں متعدد جگہ تعریض کے طور پر فرمایا ہے کہ علماء توریت وانجیل پر "میثاق النبیین" کے بموجب یہ واجب تھا کہ وہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلالت کرنے والے دلائل کو عوام الناس پر اچھی طرح مشرح و مفصل طور پر واضح کریں اور انھیں سمجھائیں اور ہرگز نہ چھپائیں (ملاحظہ ہو پارہ ۴ رکوع ۱۱ پارہ ۱ رکوع ۵، ۸، ۱۴، ۱۶، پارہ ۲، رکوع ۱۲، ۱۷) لیکن وہ اپنی ذاتی اغراض کی بنا پر اس فریضہ کو انجام نہیں دے سکے تو اب یہ فریضہ علماء امت مسلمہ پر بدرجۂ اتم واجب ہے کہ وہ کتب سابقہ پر بھی عبور حاصل کریں اس لئے کہ وہ تمام کتب سابقہ اپنی ہی ہیں خواہ وہ کسی زبان میں ہوں اور کسی قوم و مذہب کی ہوں کہ جن میں سید عالم نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتیں محفوظ ہیں۔ اس طرف اقوام عالم کو بار بار توجہ دلانے کی ضرورت ہے کہ ہمارا دین اسلام کوئی نیا دین نہیں ہے بلکہ سب دینوں کا نمائندہ ہے اس لئے نہایت قدیم ہے اور اس کا ماننے والا بنی نوع انسان میں بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ" یعنی تمہارے لئے دین

کی ہدایت کی جس کا حکم اس نے (اللہ نے) نوحؑ کو دیا اور جو ہم نے تمہاری طرف وحی کی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا" (پارہ ۲۵ رکوع ۳) مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام سے (جو شریعی انبیاء میں سب سے پہلے نبی ہیں) آپ تک کے سید انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جتنے انبیاء ہوئے سب کے لئے ہم نے دین کی ایک ہی راہ مقرر کی جس میں وہ سب متفق ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا "وَإِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً" (پارہ ۱۸ رکوع ۴) اور بے شک یہ تمہارا دین (دین اسلام) ایک ہی دین (سب دینوں کا نمائندہ) ہے (اسی کو مانو اور اسی کے احکام کی پیروی کرو)۔

بنی اسرائیل کی روایات کا مدار "توریت" اور "نبیم" پر ہے۔ توریت کا اطلاق بالعموم سفر تکوین (پیدائش)، سفر خروج، سفر احبار، سفر عدد، اور سفر استثنا پر ہوتا ہے۔ نبیم میں سفر یوشع، سفر القضاۃ، سفر سموئیل، × × × × سفر ایام، اور سفر ملوک وغیرہ پر مشتمل ہے۔ نبیم میں انبیاء بنی اسرائیل کے مواعظ اور تاریخی واقعات کا ذخیرہ ہے یہ بھی توریت کا حصہ مانا جاتا ہے۔ ان دونوں کی تفسیر آرامی زبان میں ترگوم کے نام سے مشہور ہے۔ مدراش اور تالمود ان کے یہاں حدیث و فقہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ توریت و نبیم کی کچھ شہادتوں کو نقل کیا جا چکا ہے اگر ان کی سب شہادتوں کو ضبط تحریر میں لایا جائے تو نہایت ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ نبیم کی چند شہادتیں توریت کی پیشینگوئیوں کی تائید میں پیش کی جا چکی ہیں۔ اب زبور کی چند شہادتیں ملاحظہ ہوں۔۔

زبور پر ایک نظر از روئے توریت و قرآن عزیز: حضرت داؤدؑ کو خدا نے زبور عطا فرمائی وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَىٰ بَعْضٍ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا اور ہم نے (اللہ نے) بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی اور داؤد کو ہم نے زبور عطا فرمائی (۱۷/۵۵) دوسری جگہ ارشاد فرمایا يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ

(۳۸ : ۲۶) یعنی اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے پس لوگوں کے درمیان راستی سے فیصلہ
انبیاء و رسل میں حضرت آدم کے بعد صرف داؤد علیہ السلام کو خلیفہ کے لقب سے اللہ نے پکارا
ہے۔ یہ بہت بڑا شرف ہے کہ ان میں نبوت و رسالت کے ساتھ حکومت و سلطنت بھی
جمع کر دی گئی ہے اس طرح قرآن عزیز کی مختلف سورتوں میں ۲۰ جگہ ذکر ہے اور نام لے کر
۱۶ جگہ ان کی رشد و ہدایت کا بیان ہے۔ حضرت داؤد اسرائیلی اسباط میں یہودا ہ بن یعقوب
کی نسل سے ہیں اور گیارہویں پشت میں مبعوث ہوئے آپ کی طہارتِ قلب اور نفاستِ
طبع کے لیے فرقانِ حمید گواہ ہے اس کے برخلاف توراۃ میں تضاد بیانی سے کام لیا گیا ہے صحیفہ
سموئیل میں ہے "تب ناتن (نبی) نے بادشاہ (داؤد) سے کہا جا جو کچھ تیرے دل میں ہے
کر کیونکہ خداوند تیرے ساتھ ہے" (باب ۷ آیتہ ۳ تا ۸) گویا داؤد صرف بادشاہ ہیں۔ دوسری
جگہ انھیں نبی بتایا ہے۔ ملاحظہ ہو باب ۲۲ آیات ۱۸ تا ۲۵۔ سموئیل کے بیان کردہ بادشاہ اور نبی کی سیرت
و کردار کا جو گھناؤنا رخ ہے وہ اس قابل نہیں کہ اسے تحریر کیا جائے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو
سموئیل ۲ باب ۱۱ آیات ۲ تا ۲۲)۔ المختصر قرآن عزیز حضرت داؤد کو رسول بھی تسلیم کرتا ہے اور
صاحبِ صولت و شوکت بادشاہ بھی لیکن توریت انھیں صرف ایک عیش پرست بادشاہ تسلیم
کرتی ہے۔ قرآن عزیز نے ان کے صفات بیان کئے ہیں لیکن توریت میں ان کے اوپر الزامات
واتہامات ہیں۔

زبور کا بھی یہی حال ہے۔ افسوس ہے کہ بنی اسرائیل نے اس کی صورت کو بھی مسخ کر دیا،
اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج موجودہ زبور ۱۵۰ مزبور پر مشتمل ہے۔ جو باریک
کتابت کے ۸۷ صفحات (۵۲۹ تا ۶۱۶) پر مشتمل ہے۔ یہ سب مزامیر حضرت داؤد کے نہیں ہیں بعض
پر اگر داؤد کا نام ثبت ہے تو بعض پر مغنیوں کے استاد قورح کا بعض پر آصف کا اور بعض پر گِتّیت
کا۔ بعض مزبور ایسے بھی ہیں جن پر کسی کا نام نہیں ہے اور صدیوں بعد تصنیف کئے گئے مثلاً یہ مزبور
"اے خدا قومیں تیری میراث میں گھس آئی ہیں۔ انھوں نے تیری مقدس ہیکل کو ناپاک کیا

۴۔ انھوں نے یروشلیم کو کھنڈر بنادیا ہے۔" اس مزبور میں بیت المقدس کی تباہی کا ذکر ہے جو بخت نصر کے ہاتھوں ۶۰۴ ق۔م میں وقوع پذیر ہوئی جو حضرت داؤد علیہ السلام کے صدیوں برس بعد ہوئی بخاری کتاب الانبیاءؑ میں ایک روایت منقول ہے کہ حضرت داؤدؑ پوری زبور کو مختصر وقت میں تلاوت کرلیا کرتے تھے جب گھوڑے پر زین کستے تو اس وقت اسے شروع کرتے اور جب زین کس کر فارغ ہوتے تو پوری ختم کر چکے ہوتے تھے۔

بہر حال تحریف کے باوجود اللہ تبارک و تعالیٰ نے زبور میں اُن بشارتوں اور اُن نشانیوں کو محفوظ رکھا جو "نبی موعود" سید عالم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے صرف دو پر غور فرمایئے:۔ پہلی پیشگوئی:۔

"وہ قوم کے مسکینوں کا انصاف کرے گا اور محتاجوں کے فرزندوں کو بچائے گا اور ظالم کو ٹکڑے ٹکڑے کرے گا جب تک کہ سورج اور چاند باقی رہیں گے (لامحدود زمانہ تک) ساری پشتوں کے لوگ تجھ سے ڈرا کریں گے، وہ بارش کی مانند جو کاٹی ہوئی گھاس پر پڑے نازل ہوگا اور موسلا دھار مینہ کی طرح (نازل ہوگا) جو زمین کو سیراب کرتا ہے، اس کے عصر میں صادق پھلیں گے اور سلامتی فراواں ہوگی .... ساری گروہیں اس کی تعظیم کریں گی کیونکہ وہ دہائی دینے والے محتاج کو اور مسکین کو اور ان کو جن کا کوئی مددگار نہ ہو چھڑائے گا۔ وہ جیتا رہے گا اور سبا کا سونا اسے دیا جائیگا، اس کے حق میں سدا دعا ہوگی ہر روز اس کی مبارکبادی جاوے گی ...... اس کا نام ابد تک باقی رہے گا جب تک کہ آفتاب رہے گا۔ اس کے نام کا رواج رہیگا، لوگ اس کے باعث اپنے تئیں مبارک کہیں گے، ساری قومیں اسے مبارکباد دیں گی۔ خداوند خدا اسرائیل کا خدا جو اکیلا ہے عجائب کام کرتا ہے۔"

(ملاحظہ ہو زبور ۷۲: آیات ۴ تا ۷ و ۱۰ تا ۱۹)

اس پیشینگوئی میں حضرت داؤد علیہ السلام نے اُس ایک اور صرف ایک آکر نہ جانے والے "موعود نبی"، جناب محمد رسول اللہ کی پوری سرگزشت بیان کردی ہے۔ بشارت دینے

ہیں کہ (۱) وہ "موعود نبی" آخری نبی ہے کیوں کہ حامد اور محمود کے بعد کوئی نبی نہیں
(یعنی تا قیامِ قیامت) کوئی دوسرا نبی پیدا نہیں ہوگا۔ اسی کی شریعت بحال ہوگا۔ وہ یتیم
اور مسکینوں کا ملجا و ماوی ہے ظالموں کی بیخ کنی کرے گا مگر نیکوں کے لئے رحمت کی بارش
ہوگا اس لئے سلامتی کی فراوانی ہوگی یعنی اسلام سب میں پھیل جائے گا۔ وہ جیتا رہے گا۔
یعنی اس کی نبوت و شریعت کو دوام حاصل ہوگا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ
سبا (یمن) کا سونا آنحضورؐ کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کیا گیا۔ اس کے حق میں سدا دعا کی ہوتی
ہے اور دعا دینے والے (صلواۃ و سلام بھیجنے والے مومن) وَ بَارِکْ عَلٰی آلِ محمد کما اُنھیں
کو بھی مبارکباد دیتے ہیں (اس کی تشریح بشارتِ ابراہیم کے سلسلہ میں کی جاچکی ہے) اور یہ سلسلہ
قیامت تک جاری رہے گا۔ ایمان لانے کے لئے یہی ایک بشارت کافی ہے۔

(ب) جناب داؤد علیہ السلام کی دوسری پیشینگوئی:۔ فرمایا "میں تیری حمد و شکر کروں گا۔
(کیونکہ) تو نے میری سن لی اور میری نجات (کا باعث) ہوا۔ وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا وہی
چوٹی کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند (آقائے نامدارؐ) سے ہوا جو ہماری نظروں میں عجیب ہے ....
مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے (یعنی آئے گا)۔ (بحوالہ زبور ۱۱۸ - ۲۲ تا ۲۶) واضح
ہو جناب داؤد علیہ السلام پر بائبل اور یہود نے جس طرح کے عیب لگائے ہیں وہ اسقدر مکروہ
ہیں کہ ان کی موجودگی میں آپ کی عزت و وقعت ختم ہو جاتی ہے۔ آنحضرتؐ نے تشریف لا کر ان
گنا ہوں اور الزامات سے آپ کو نجات دی اور ان کی تقدیس و تطہیر سے لوگوں کو واقف کار
بنایا لہٰذا آنحضرتؐ اس کے مستحق ہیں کہ جناب داؤد علیہ السلام ان کی حمد و ثنا کے گیت گائیں۔
بشارت میں بطور استعارہ معماروں سے رد کئے ہوئے پتھر کا ذکر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے
کہ حضورؐ اور حضورؐ کی قوم ہی وہ پتھر ہے جسے بنی اسرائیل کے معماروں (علماء و فقہا) نے رد کیا
اور کہا کہ بنی اسمٰعیل میں کوئی خوبی نہیں مگر اسی رد شدہ قوم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
مبعوث ہوئے جنھوں نے بحیثیت چوٹی کا پتھر ہونے کے قصرِ نبوت کی تکمیل کی۔ اگر یہ چوٹی

کا پتھر نہ ہوتا تو نبوت کی ساری عمارت بیکار تھی ۔ چوٹی کا پتھر گنبد کا آخری پتھر ہوتا ہے ۔ جس کو بائبل میں "روش پناہ" کہا گیا ہے یا وہ عمارت جو دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لئے بنائی جاتی ہے اس کے برج کا آخری پتھر "روش پناہ" کہلاتا ہے ۔ پناہ یعنی حفاظت کا برج۔ (بائبل تواریخ ۲ باب ۲۶ آیت ۱۵) اس طرح قصر نبوت کا آخری پتھر یعنی نبی خاتم الرسل اور حافظ نبوت سوائے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نہیں ۔ آپ کی ذات با برکات پر تمام نبوتوں کا خاتمہ ہو گیا ۔ بنی اسرائیل میں کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے یہ دعویٰ کیا ہو یا خدا نے اس کے متعلق کہا ہو کر وہ خاتم النبیین ہے (مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو خاتم النبیین ص ۱۹۲ تا ص ۲۰۱ نیز بشریٰ ص ۵۵ تا ص ۸۹)۔

(۸) حضرت سلیمان علیہ السلام کا محبوب :- حضرت داؤد ؑ کی طرح اللہ رب العزت نے حضرت سلیمان ؑ کو بھی نبوت و حکومت دونوں سے نوازا ۔ قرآن عزیز میں ان کا ذکر ۱۶ جگہ آیا ہے اور بنی اسرائیل کے عائد کردہ الزامات کی تردید کی ہے اور ان کی پیغمبرانہ شان اور دعوت و تبلیغ کی ستائش کی ہے ۔ سورۂ صٓ میں ارشاد فرمایا " اور مسخر کر دئے سلیمان کے لئے شیطان (سرکش جن) ہر قسم کے کام کرنے والے ، عمارت بنانے والے ، دریا میں غوطہ لگانے والے ۔ یہ ہماری عطا و بخشش ہے ، چاہے اسے روکے رکھو یا بخش دو تم سلیمان سے اس کا کوئی مواخذہ نہیں " اللہ اکبر ! اس عظمت و رفعت کا کیا کہنا کہ جب کہ دوسروں سے باز پرس ہو گی لیکن حضرت سلیمان ؑ کو مستثنیٰ کر دیا ان سے کوئی حساب نہیں ہو گا وہ جیسے چاہیں خرچ کریں یا طبیعت چاہے تو روک لیں یہ خصوصی انعام و اکرام ہے اللہ کا حضرت سلیمان ؑ کے لئے ۔ بنی اسرائیل نے سلیمان ؑ کی نبوت و رسالت سے صرف انکار ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ منجملہ دوسرے الزامات کے ایک الزام یہ بھی لگایا ہے کہ وہ جادو کے حامل تھے اور اسی کے زور پر "کنگ سلیمان ؑ" تھے اور جن و انس اور وحوش و طیور کو مسخر کئے ہوئے تھے ۔ قرآن عزیز نے بتایا (ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ رکوع ۱۲)

کہ سلیمان علیہ السلام کا دامن جادو کی نجاست سے پاک ہے۔ جادو سلیمانؑ نے نہیں بلکہ شیاطین (جن وانس) نے سکھایا اور اس کو مدون کیا۔ بنی اسرائیل نے توریت وزبور کو پس پشت ڈال کر اس فن کو سیکھا اور سکھایا اور جب اُن کی جماعت کے اہلِ حق نے ان کو متنبہ کیا کہ یہ سخت گمراہی کا کام ہے۔ اس سے باز آجاؤ تو وہ شیطانوں کے بہکانے میں آکر یہ کہتے تھے کہ یہ تو سلیمان کا سکھایا ہوا علم ہے اسی کے زور سے تو انھوں نے حکمرانی کی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ نے بھی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حمد وثنا کا گیت گایا۔ عہد عتیق (بائبل) میں "غزل الغزلات" کے عنوان سے ان کی کچھ عشقیہ غزلیں درج ہیں جو انھوں نے اپنے محبوب کی شان میں کہی ہیں۔ اُن کا محبوب کون ہے؟ عیسائی حضرات انھیں جناب مسیحؑ پر منطبق کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ جبکہ نعتیہ کلام میں خود جناب سلیمان نے اپنے محبوب کا نام "محمدؐ" بتایا ہے۔ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے لفظ "محمد" میں نہ صرف تحریف کی گئی بلکہ اس کا ترجمہ بجائے "تعریف کیا گیا" کے "سراپا عشق انگیز" کر دیا گیا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میثاق النبیین جلد اوّل ص۲۰۵ تا ص۲۱۳)

جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی نعتیہ غزل ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:- (۱) میرا محبوب سرخ و سفید ہے (۲) وہ دس ہزار میں ممتاز ہے۔ (۳) اس کا سر خالص سونا ہے (۴) اس کی زلفیں پیچ در پیچ کوّے سے کالی ہیں (۵) اس کی آنکھیں ان کبوتروں کی مانند ہیں جو دودھ میں نہا کر لب دریا تمکنت سے بیٹھے ہوں (۶) اس کے رخسار پھولوں کے چمن اور بلسان کی کی اُبھری ہوئی کیاریاں ہیں۔ (۷) اُس کے ہونٹ سوسن ہیں جن سے رقیق مُر ٹپکتا ہے۔ (۸) اس کے ہاتھ زبرجد سے مرصع سونے کے حلقے ہیں۔ (۹) اس کا پیٹ ہاتھی

دانت کا کام ہے۔ جس پر نیلم کے پھول بنے ہوں (۱۰) اس کی ٹانگیں کندن کے پایوں پر سنگ مرمر کے ستون ہیں اور دیکھنے میں لبنان اور خوبی میں رشک سرو ہیں۔
(۱۱) اس کا منہ ازبس شیریں ہے یعنی اسکا کلام شہد سے زیادہ شیریں ہے۔ ہاں یہی ہے میرا محبوب محمدؐ سراپا عشق انگیز، اے یروشلیم کی بیٹیو (غزل الغزلات، باب ۵ - آیات ۱۰ تا ۱۵)

نوٹ: اس نعت میں بزبان عبری آخری جملہ کے اندر

کہہ کر بتایا ہے کہ نہ صرف اس کا کلام شہد اور شیریں ہے بلکہ وہ خود تعریف مجسم یا محمد ہے۔ اس میں ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر نام بتانا تھا تو بجائے محمدیم کے محمد کہا ہوتا۔ محمدیم کیوں کہا اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ عبرانی زبان میں یے اور میم علامت جمع کی ہے جب کسی بلند مرتبت و عظیم شخصیت کا نام لینا مقصود ہوتا ہے تو اس کے اسم کو بھی صیغہ جمع میں استعمال کرتے ہیں جیسے خدا کا نام " الوہ " ہے اس کی جمع " الوھیم " بنائی اسی طرح " بعل " جو ایک بت کا نام تھا اس کو عظیم الشان سمجھتے تھے اس کی جمع " بعلیم " بنائی گئی لہذا حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی اپنے ذی قدر و عظیم الشان محبوب کو صیغہ جمع میں استعمال کیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ محمدؐ سے زیادہ کون شخص محمدیم کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی نعت شریف کے تمام نشانات جناب محمد رسول اللہؐ پر صادق آتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایک روایت میں یہ ذکر ہے کہ جناب محمد رسول اللہ کے وقت میں کچھ یہودی حضرت سلیمانؑ کی اس بشارت سے باخبر ہو کر مسلمان ہو گئے اور انھوں نے اپنے اسلام لانے کی وجہ یہی پیشنگوئی قرار دی۔ اس پر ان لوگوں کے سامنے دوسرے یہودی علماء کو بلا کر پیشنگوئی کے الفاظ پڑھنے کو کہا گیا تو وہ انگلی سے کبھی تو محمدیم کو چھپا لیتے تھے اور کبھی کوئی دوسرا لفظ بنا کر پڑھ دیتے تھے۔

(۹) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت :۔ قرآن عزیز نے نبی اکرمؐ کی مماثلت کے سلسلہ میں جن پاک ہستیوں کے واقعات سے زیادہ بحث کی ہے ان میں حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ، اور حضرت عیسیٰؑ کی مقدس ہستیاں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ تیرہ سورتوں میں ۸۴ جگہ حضرت عیسیٰؑ کا ذکر ہے، ۲۶ جگہ نام عیسیٰؑ '' ۱۱ جگہ مسیحؑ اور ۲۳ جگہ کنیت ابن مریم کے ساتھ۔ تاریخی مواد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی بعثت سے پہلے یہود مشرکانہ رسوم وعقائد کو اپنے مذہب کا جز بنا چکے تھے۔ یہود کی اعتقادی اور عملی زندگی کا مختصر نقشہ شعیا علیہ السلام کی زبانی خود توریت نے اس طرح دکھایا ہے " خداوند فرماتا ہے کہ یہ امت (بنی اسرائیل) زبان سے تو میری عزت کرتی ہے مگر ان کا دل مجھ سے دور ہے۔ یہ بے فائدہ میری پرستش کرتے ہیں کیوں کہ میرے حکموں کو میرے پیچھے ڈال کر آدمیوں کے حکموں کو تعلیم دیتے ہیں "۔ (بحوالہ قصص القرآن جلد چہارم ص۱۹)

یہود کی مذہبی جماعت میں صدوقی سزا وجزا اور حشرونشر کے قائل نہ تھے فریسی واصل الی اللہ ہونے کے لیے ترکِ دنیا کو ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن ترکِ دنیا کے پردہ میں دُنیا کی ہر گندگی میں ملوث تھے۔ تیسری جماعت ہیکل کے خدمت گذاروں اور پجاریوں کی تھی جنھوں نے مذہبی رسوم کی ادائیگی کو تجارتی کاروبار بنالیا تھا۔ بھینٹ اور نذر لینے کی خاطر توریت کے احکام تک بدل ڈالے، یہ کاہنوں کی جماعت تھی۔ چوتھی جماعت ان سب پر حاوی تھی، عوام کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر ان میں یہ عقیدہ پیدا کر دیا کہ وہ مذہب وہ ہے جو یہ کہدیں ان کو اختیار ہے کہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کریں۔ جنت ودوزخ میں بھیجنا ان کا کام ہے۔ یہ " احبار " یا فقیہ " تھے۔ بہر حال اسی تاریکی کو دور کرنے کے لیے حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کا ظہور ہوا۔ اس مقدس ہستی نے قوم کو للکارا۔ احبار کی علمی مجلسوں، راہبوں کے خلوت کدوں، بادشاہ وامراء کے درباروں اور عوام وخواص کی محفلوں میں حتیٰ کہ ہر کوچہ وبازار

میں جا جا کر پیغام حق" سنایا اور سناتے وقت اپنی اصل حقیقت سے بھی آگاہ کر دیا کہ۔ "اے بنی اسرائیل بلا شبہ میں تمہاری جانب اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ تصدیق کرنے والا ہوں تورات کی اور بشارت سنانے والا ہوں ایک پیغمبر کی جو میرے بعد آئیگا اس کا نام احمد ہے" (ملاحظہ ہو سورۂ صف) انجیلی شہادت آگے درج ہے:

حواریین عیسیٰؑ از روئے قرآن و انجیل:۔ حضرت عیسیٰؑ تمام مخالفتوں اور معاندین کی ہرزہ سرائیوں کے باوجود اپنے کام میں سرگرم عمل رہتے تھے۔ بنی اسرائیل کے سرکش اور باغی انسانوں کی اس بھیڑ میں بھی کچھ ایسی سعید روحیں نکل آئی تھیں جنھوں نے دین حق کی سر بلندی و کامیابی کے لئے جان و مال کی بازی لگا دی تھی۔ یہ حواری بیشتر غریب اور مزدور طبقہ میں سے تھے۔ انبیاءِ کرام کی دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں "سنت اللہ" یہی جاری رہی ہے کہ زیر دست ہی فداکاری کا ثبوت دیتے ہیں اور طبقہ کے زبردست اور صاحبِ اقتدار لوگ اپنے تکبر و غرور کی وجہ سے اعلاءِ کلمۃ اللہ کی راہ میں سنگِ گراں بن جاتے ہیں۔

قرآنِ عزیز نے حضرتِ عیسیٰؑ کی منقبت بیان کی ہے کہ مشکل کے وقت حضرت عیسیٰؑ نے پوچھا کہ اللہ کی جانب میرا کون مددگار ہے؟ تو حواریوں نے جواب دیا "نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ" یعنی ہم ہیں اللہ کے دین کے مددگار (ملاحظہ ہو سورۂ آل عمران اور سورۂ صف)۔ سورۂ مائدہ میں بھی ان کے خلوص۔ حق طلبی اور حق کوشی کا تذکرہ ہے۔ یہ سب کچھ اس وقت کا حال ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ ان میں موجود تھے لیکن آپ کے رفع الی السماء کے بعد بھی ان کی استقامت اور فداکارانہ خدمت کا سورۂ الصف میں ذکر ہے آیۃ شریفہ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ عَلٰی عَدُوِّہِمْ فَاَصْبَحُوْا ظَاہِرِیْنَ ؕ کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت شاہ عبد القادرؒ دہلوی نے فرمایا ہے: "حضرتِ عیسیٰؑ کے بعد ان کے حواریوں نے بڑی محنتیں کی ہیں تب ان کا دین نشر ہوا۔ ہمارے آنحضرتؐ کے پیچھے بھی نصیبوں نے اس سے زیادہ کیا ہے" اس کے

انجیل میں بعض مقامات پر اگر مدح سرائی ہے تو دوسرے مقامات پر انھیں منافق، بزدل، بدطینت بتلایا گیا ہے مثلاً (۱) انجیل یوحنا میں حضرت عیسیٰؑ کے معتمد علیہ حواری یہوداہ کے متعلق اس وقت کا حال جبکہ یہودی حضرت عیسیٰؑ کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں اس طرح دیا ہوا ہے "یہ باتیں کہہ کر یسوع اپنے دل میں گھبرایا اور کہا تم میں سے ایک شخص مجھے پکڑوا دے گا..... پوچھا اے خداوند وہ کون ہے؟ یسوع نے جواب دیا جسے میں نوالہ ڈبو کر دیدوں گا وہی ہے۔ پھر اُس نے نوالہ ڈبویا اور لے کر اسکریوتی کے بیٹے یہوداہ کو دیدیا اور اس نوالہ کے بعد شیطان اس میں سما گیا" (ملاحظہ ہو یوحنا باب ۱۳ آیۃ ۲۱-۲۷) انجیل متی میں شمعون پطرس حواری کے متعلق مسطور ہے:۔ "شمعون پطرس نے اس سے پوچھا اے خداوند تو کہاں جاتا ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ میں جہاں جاتا ہوں اب تو میرے پیچھے نہیں آسکتا۔ اس نے کہا اے خداوند میں تیرے پیچھے اب کیوں نہیں آسکتا میں تو تیرے لئے اپنی جان دوں گا۔ یسوع نے جواب دیا تو اور میرے پیچھے جان دے گا! میں تجھ سے سچ کہتا ہوں کہ مرغ بانگ نہ دے گا جب تک کہ تو تین بار میرا انکار نہ کرے گا۔" (ملاحظہ ہو متی باب ۲۷ آیۃ ۴۶)۔ (۳) اسی انجیل میں دوسری جگہ تمام حواریوں کو بزدل بتایا گیا ہے کہ وہ امتحان کے وقت حضرت یسوع کو بے یار و مددگار چھوڑ کر فرار ہو گئے (ملاحظہ ہو متی کی انجیل باب ۲۶ آیۃ ۵۶)

موجود اناجیل کی حقیقت:۔ بات دراصل یہ ہے کہ آجکل عیسائیت وہ عیسائیت نہیں جس کی تلقین حضرت عیسیٰؑ نے توریت موسوی کو بنیاد مان کر انجیل کے ذریعہ کی ہے۔ انجیل دراصل توراۃ کا تکملہ ہے۔ موجودہ چاروں اناجیل حضرت مسیحؑ کے بعد کی تصانیف ہیں، انھیں سے کوئی بھی انجیل حضرت مسیحؑ کی انجیل نہیں ہے (۱) متی کی انجیل ۳۹ء میں بزبان عبرانی بیت المقدس میں لکھی گئی۔ اصل غائب ہو گئی۔ اس کا یونانی ترجمہ بہت کچھ ردّو بدل کے بعد باقی ہے، اس کے نہ مترجم کا نام معلوم ہے اور نہ یہ معلوم کہ کس زمانہ میں ترجمہ ہوا (۲) انجیل مرقس کو پطرس کے ایک مرید مرقس نے رومی عیسائیوں

کے آخر پہلی صدی میں مرتب دیا۔ وہ مسیح کی الوہیت کا منکر تھا (۳) لوقا کی انجیل۔ لوقا نے حضرت مسیح کا زمانہ نہیں پایا۔ اس نے مسیحیت کو پولوس (سینٹ پال) سے سیکھا یا تھا جس نے بربنائے تعصب تقیہ کا لباس اوڑھ کر دین عیسوی کی صداقتوں کو مٹا کر بدعتوں (الوہیت مسیح۔ کفارہ۔ تثلیث) کا مجموعہ بنا دیا۔ اس انجیل کو عیسائی عالم الہامی نہیں مانتے (۴) یوحنا کی انجیل۔ اس انجیل کے بارے میں بہت اختلاف ہے کچھ علماء نصاریٰ اس کو یوحنا کی تصنیف بتلاتے ہیں لیکن سنہ تصنیف میں اختلاف رائے ہے بعض ۶۵ء، ۹۵ء، ۹۸ء اور پروفیسر لین کیتھولک ہیرالڈ جلد ۷ میں دوسری صدی عیسوی تجویز کرتے ہیں اور مصنف، اسکندریہ کے ایک طالب علم کو بتلاتے ہیں۔ اس انجیل میں بھی الوہیت مسیح کو شامل کر دیا ہے تاکہ عقیدہ کی اصلاح کے لیے جو آواز کبھی کبھی مسیحی دنیا میں اٹھتی تھی اس کو دبا دیا جائے۔

عیسائیت کی مذہبی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ پہلی صدی عیسوی سے چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک عیسائیوں میں اکیس انجیلیں الہامی خیال کی جاتی تھیں اور یوں تو ان کی تعداد سو سے زائد تھی۔ ۳۲۵ء میں نائسیا کی کونسل نے نظر اندازی کر کے صرف چار مذکورۂ بالا انجیلوں کو باقی رکھا۔ ان متروک انجیلوں میں انجیل اگنٹس اور برناباس (برنابا) کا پتہ لگ چکا ہے بلکہ برنابا تو شائع بھی ہو چکی ہے۔ سولھویں صدی عیسوی میں پوپ سکٹس کے کتب خانے سے اس کے ایک مقرب لاٹ پادری فرامرینو نے اس کو پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ یہ انجیل دوسری اناجیل کے مقابلہ میں قرآن عزیز سے زیادہ قریب ہے (البشریٰ صـ۲ تا صـ۶) اس انجیل کے منسوخ ہونے کا پتہ پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں اس تاریخی منشور رد کلمتا سے چلتا ہے جو پوپ گلیسوس کی جانب سے کلیساؤں کے نام بھیجا گیا تھا جس میں ان اناجیل کا نام درج ہے، جن کا پڑھنا حرام کیا گیا تھا ان میں برنابا بھی شامل تھی۔ بہرحال اس کا نسخہ سینا "جرمنی کے ایک مشہور ڈاکٹر نے کوہ طور کی ایک مشہور عیسوی خانقاہ سے ۱۵ سال کی کوشش کے بعد حاصل

کرکے روس کے شاہی کتب خانہ میں داخل کردیا تھا۔ روس نے اس نسخہ کو ایک لاکھ پونڈ کی قیمت پر حکومت انگلستان کے ہاتھ فروخت کردیا تھا اور اب یہ نسخہ وہاں کی میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس نسخہ میں آنحضورؐ کو عبرانی زبان میں لفظ احمدؐ سے یاد کیا گیا ہے جس کو یونانی میں ترجمہ کرتے وقت "پیریکلوطوس" کے مترادف سمجھا گیا جو بعد میں بگڑ کر "پاراکلی طوس" اور "پار اکلوس" ہوگیا۔ "پیرطوس" کے معنی بھی احمد و محمد کے ہیں۔ "فارقلیط" اس کا معرب ہے جس کا ۱۸۳۱ء و ۱۸۳۳ء میں اردو اناجیل میں ترجمہ "روح القدس" کردیا گیا اس کے بعد پھر ترمیم ہوئی اب صرف "روح حق" ہے۔

صلیبی جنگوں سے قبل تمام دنیا کے عیسائی "فارقلیط" سے مراد ایک ایسا شخص لیتے تھے جو جناب مسیح کے بعد پیغمبر ہو کر دنیا میں آئے گا۔ اسی وجہ سے جناب مسیح کے بعد ایک عرصہ دراز تک جھوٹے فارقلیط پیدا ہوتے رہے چنانچہ ۱۷۰ء میں مونٹانیس نامی ایک شخص نے فارقلیط ہونے کا دعویٰ کیا تھا (ملاحظہ ہو تواریخ کلیسا مطبوعہ لندن ۱۸۵۲ء صفحہ ۲۰۵)

اسی طرح مینیس بھی فارقلیط ہونے کا دعویدار تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب سے سلطان صلاح الدین کے ہاتھوں یورپین اقوام نے زک اٹھائی ہے تب سے یورپ کے پادری مقدس انجیل میں تحریفات کے مرتکب ہوئے جو آج تک جاری ہے اسی وجہ سے عیسائی مذہب میں بہت سے فرقے ہوگئے۔ مائی تیرن اور لیونی ٹیرن وغیرہ فرقے ان انجیلوں کو نہیں مانتے جن کو اور فرقے مانتے ہیں۔ رومن کیتھلک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے کی انجیلوں کو نہیں مانتے۔

مسٹر وارڈ اپنی کتاب "غلطنامہ" میں لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر مل نے بائبل کے مختلف نسخے ملائے تو تیس ہزار اختلاف پائے۔ ڈاکٹر گریسباخ نے ۳۵۵ نسخوں کا مقابلہ کیا تو

ڈیڈھ لاکھ اختلاف ہے ۔ بہر صورت اگر "فارقلیط" کے لفظ یا معنی میں تحریف ہوئی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے ۔ بحمداللہ بعض پادری ایسے اب بھی موجود ہیں جو دعویٰ کے ساتھ کہتے ہیں کہ آئندہ آنیوالے کی بابت جناب مسیح علیہ السلام نے جو پیشگوئی کی ہے وہ فارقلیط بمعنی احمدؐ و محمدؐ ہے (ملاحظہ ہو تفسیر انجیل از پادری جی مرے میچل مطبوعہ لندن ۱۸۶۹ء صفحہ ۲۰۶) اسی طرح گاڈفری ہگیس اور بشپ مارشس نے لمبی چوڑی بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ جناب مسیح علیہ السلام نے جو پیشگوئی کی ہے اس میں لفظ فارقلیط بولا ہے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو خطبات احمدیہ صفحہ ۶۳۹ تا صفحہ ۶۵۳)

امام دارمی اور اُن کی سنن

از مولوی محمد عبد اللہ صاحب رفیق ندوۃ المصنفین

زیر ترتیب کتاب "الترغیب والترھیب" جس کا ترجمہ ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہو رہا ہے اس کے مقدمہ میں تذکرہ محدثین کے ذیل میں امام دارمی اور ان کی سنن کا مختصر سا تذکرہ آیا ہے۔ زیر نظر مضمون میں امام دارمی اور ان کی سنن پر بہ تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

(برہان)

نام و نسب | کنیت ابو محمد نام عبد اللہ سلسلہ نسب عبد اللہ بن عبد الرحمن بن الفضل بن بہرام بن عبد الصمد التمیمی الدارمی السمرقندی[1]

دارمی بکسر راء دارم بن مالک بن حنظلۃ بن زید مناۃ بن تمیم کی طرف نسبت ہے جو قبیلہ بنو تمیم کی ایک بڑی شاخ ہے[2]۔

اور سمرقند میں چونکہ رہائش تھی اس لیے اس کی طرف بھی نسبت ہے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ للذھبی ج ۲ ص ۱۰۵ و تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۴،

[2] مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح ج ۱ ص ۲۳ و تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹

پیدائش | مشہور امامِ حدیث عبداللہ بن مبارک کا سن وفات ان کا سال پیدائش ہے یعنی سن ایک سو اکیاسی ہجری (۱۸۱ھ)

تعلیم، اساتذہ اور تلامذہ | دارمی نے نضر بن شمیل، یزید بن ہارون، جعفر بن عون ابو النضر ہاشم بن القاسم، مروان بن محمد الطاطری، اشہل بن حاتم، حبان بن ہلال، محمد بن یوسف الفریابی، اسود بن عامر، وہب بن جریر اور ابو عاصم وغیرہم سے علم حاصل کیا۔[۱]

تحصیل علم کے لئے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، خراسان، شام، عراق اور مصر کا سفر کیا۔ آپ کے شاگردوں کی فہرست میں امام مسلم صاحب صحیح، امام ابوداؤد، امام ترمذی، الحسن بن الصباح البزار، بندار، الذہلی، ابوزرعہ، ابوحاتم، بقی بن مخلد، جعفر بن محمد، الفریابی اور حافظ عیسیٰ بن عمر بن العباس السمرقندی جیسے فن حدیث کے آفتاب و ماہتاب شامل ہیں جن میں سے ذہلی تک کے شاگردوں کے متعلق حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ عمر میں دارمی سے بڑے تھے[۲]

امام مسلم نے دارمی سے تہتر[۳] حدیثیں لی ہیں[۴]۔ حافظ ذھبی کہتے ہیں کہ سنن کے علاوہ دوسری کتابوں میں امام نسائی نے بھی دارمی سے روایت کی ہے[۵]۔ ابن عدی نے "الکامل" میں ایک حدیث امام نسائی سے نقل کی ہے جسے وہ امام دارمی سے روایت کرتے تھے[۶]۔ اور امام اہل الدنیا فی الحدیث حضرت امام بخاری نے بھی اپنی صحیح بخاری کے علاوہ آپ سے روایت کی ہے[۷]۔ امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے عبداللہ بھی دارمی کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہیں۔

محدثین کی نظر میں دارمی کا مقام | خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ دارمی کا شمار حفاظ

---

[۱] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹، تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۶ [۲] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵
[۴] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۶ [۵] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۵ [۶] تہذیب ج ۵ ص ۲۹۶ [۷] ایضاً ج ۵ ص ۲۹۵

حدیث میں سے آپ طلب علم کیلئے کثرت سے سفر کیا کرتے تھے، ثقہ متقی و زاہد تھے۔ بادشاہ وقت نے آپ کو سمرقند کا قاضی بنانا چاہا تو آپ نے انکار کر دیا سلطان نے اصرار کرکے زبردستی قاضی بنا دیا لیکن صرف ایک مقدمہ کا فیصلہ کرکے مستعفی ہو گئے۔ نیز فرماتے ہیں کہ عقلمندی اور فضل میں انتہائی کمال رکھتے تھے۔ دیانتداری، بردباری، جدوجہد اور عبادت میں ضرب المثل تھے۔[1]

امام احمد بن حنبل کے سامنے دارمی کا ذکر آیا تو امام صاحب نے فرمایا کہ میرے سامنے کفر پیش ہوا تھا میں نے رد کر دیا اور دارمی کے سامنے دنیا پیش کی گئی تھی انھوں نے اسے ٹھکرا دیا۔[2]

اسحٰق بن داؤد سمرقندی کہتے ہیں کہ میرے ایک ملنے والے نے بیان کیا کہ میں امام احمد بن حنبل کے پاس گیا اور ان کے سامنے ابن المنذر کی تعریف کرنے لگا تو امام احمد نے فرمایا کہ میں ان کو کچھ نہیں جانتا۔ ہمارے دوستوں کو ہم سے بچھڑے زمانہ ہو گیا ہے، تمہیں عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی کے متعلق بھی کچھ خبر ہے؟ تم اس سردار کو دیکھو، تم اس سردار کو دیکھو، تم اس سردار کو دیکھو (تین بار فرمایا)

رجاء بن جابر مرجی کہتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل کو دیکھا شاذ کونی کو دیکھا اسحٰق بن راہویہ کو دیکھا اور ابن المدینی کو دیکھا لیکن قوتِ حافظہ میں کسی کو بھی عبداللہ دارمی کا ہمسر نہیں پایا۔

ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ میرے والد نے فرمایا کہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن (دارمی) اپنے ہم عصروں کے امام تھے۔[3] محمد بن عبداللہ بن نمیر کہتے ہیں کہ دارمی حفظ و تقوی میں ہم پر غالب آگئے حافظ ذہبی نے ان کے نام کے ساتھ الامام الحافظ شیخ الاسلام کے الفاظ لکھے ہیں۔ علامہ سیوطی نے تدریب الراوی میں نقل کیا ہے کہ امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے عبداللہ نے اپنے والد سے سوال کیا کہ ابا جان! حفاظ کون کون ہیں؟

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹، تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۵، [2] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۱ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۶، [3] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۱۳۰

حضرت امام نے فرمایا عزیز من! خراسان کے چند نوجوان تھے جو اب منتشر ہو چکے ہیں۔ صاحبزادے نے پھر سوال کیا کہ ابا جان! وہ ہیں کون کون؟ امام احمد بن حنبل نے جواب دیا۔ کہ ۱: محمد بن اسماعیل بخاریؒ (۲) عبداللہ بن عبدالکریم الرازیؒ (۳) عبداللہ بن عبدالرحمٰن سمرقندی (الدارمی) (۴) الحسن بن الشجاع البلخیؒ [1]

بندارؒ فرماتے ہیں کہ دنیا میں (اس وقت) چار حافظ حدیث ہیں۔ (۱) ابوزرعہ "رَی" میں (۲) مسلم بن الحجاج "نیشاپور" میں۔ (۳) عبداللہ بن عبدالرحمٰن (دارمی) سمرقند میں۔ (۴) اور محمد بن اسماعیل "بخارا" میں [2] شیخ محی الدین النووی نے شرح مسلم میں کہا ہے کہ دارمی اپنے زمانہ میں مسلمانوں کے حفاظ حدیث میں سے ایک تھے۔ علم و فضل میں بہت کم کوئی ان کی برابری کرسکتا تھا [3]۔ محمد بن عبداللہ بن المبارک المخرمی نے اہل خراسان کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اے اہل خراسان، جب تک تمہارے درمیان عبداللہ بن عبدالرحمٰن (دارمی) موجود ہیں کسی دوسرے کی طرف رُخ نہ کرنا [4]۔ ابوسعید الاشج فرمایا کرتے تھے کہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن ہمارے امام ہیں [5]۔ ابن الشرقی کہتے ہیں کہ خراسان نے پانچ ائمہ حدیث پیدا کئے ہیں ان میں دارمی کا بھی ذکر کیا [6]۔ ابوحاتم بن حِبّان کہتے ہیں کہ "کان من الحفاظ المتقنین واھل الورع والدین" اور فرماتے ہیں کہ دارمی حدیث کے یاد کرنے والے، جمع کرنے والے اسے سمجھنے اور اس پر تصنیف کرنے والے محدث تھے۔ اپنے وطن میں حدیث کو پھیلایا اور اس کی حفاظت و حمایت کی۔ اور مخالفین کی مخالفت کا خاتمہ کیا [7]۔

علمی خدمات تصنیف و تالیف

امام دارمی نے اپنے وقت کے فرقۂ باطلہ جہمیہ کے رد میں متعدد کتابیں تصنیف کیں [8]۔ آپ کی تصانیف میں سب سے

---

[1] مقدمہ سنن دارمی ص ۶ از مولانا عبدالرشید کشمیری (مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۳ھ) [2] مقدمہ سنن دارمی ص ۹

[3] ایضاً ص ۶ [4] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۱ [5] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۲ ، [6] تہذیب ج ۵ ص ۲۹۵ ، [7] تہذیب ج ۵ ص ۲۹۶

[8] تنقیح الرواۃ فی تخریج احادیث المشکوٰۃ ج ۱ ص ۱ للعلامۃ السیالکوٹی الوزیر احمد حسن السنبھلی المتوفی ۱۳۳۶ھ (مطبع انصاری دہلی ۱۳۳۳ھ)

زیادہ مشہور کتاب "سنن" ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس کو بجائے "سنن" کے "مسند"[1] کہا ہے۔ لیکن ملا علی قاری نے شرح مشکوٰۃ میں اس کو وہم قرار دیا ہے[2]۔ اور صاحب کشف الظنون نے شرح الفیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابن الصلاح نے اس کو مسانید میں شمار کر کے غلطی کی ہے[3]۔ ابن الصلاح نے اپنے مقدمہ "علوم الحدیث" میں بھی اس کو "مسند دارمی" کے نام سے ہی ذکر کیا ہے۔ اس پر بھی حافظ عراقی نے شرح کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ان کا وہم ہے[4]"

حافظ عراقی نے ایک عجیب وغریب شبہ ظاہر کیا ہے کہ:

انھم ذکروا فی ترجمتہ الدارمی ان لہ الجامع والمسند والتفسیر وغیرہ ذلک فلعل الموجود ھو الجامع والمسند قد فقد[5]

مورخین نے امام دارمی کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کی تصانیف میں ایک جامع ایک مسند اور ایک تفسیر وغیرہ ہے تو ہو سکتا ہے کہ موجود جو ہے جامع ہو اور مسند مفقود و نایاب ہوگئی ہو۔

عراقی کا یہ شبہ اگرچہ بالکل نرالا ہے اور تعجب ہے کہ بعد والوں نے اس سے کسی قسم کا تعرض بھی نہیں کیا حتیٰ کہ مجھے کہیں شیخ الاسلام حافظ ابن حجر کے کلام میں بھی اس سے اتفاق یا اختلاف نہیں ملا۔ تدریب الراوی میں سیوطی نے اس کو نقل کر کے خاموشی اختیار کر لی ہے اور علامہ عبدالحی لکھنوی نے بھی الاجوبۃ الفاضلۃ میں اسے نقل کیا ہے لیکن یہ شبہ ہے اہم اس لئے کہ جب ان کی تصانیف میں دو کتابیں ایک سنن اور ایک جامع ہیں اور ایک کتاب جس کی ترتیب بطرز

---

[1] "سنن" حدیث کی وہ کتاب کہلاتی ہے جس میں حدیثیں فقہی ترتیب سے لکھی جائیں اور "مسند" وہ کتاب کہلاتی ہے جس میں ہر صحابی کی کل روایات ایک جگہ جمع کر دی جائیں اور ابواب کی کوئی رعایت نہ ہو [2] مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۳، [3] کشف الظنون ج ۲ ص ۲۳۲، مقدمہ سنن دارمی ص ۷۔ (نوٹ) صاحب کشف الظنون نے غالباً شہرت کی رعایت کرتے ہوئے اس کو مسانید کے تحت بیان کیا ہے۔

[4] "التقیید والایضاح شرح علوم الحدیث المعروف بمقدمۃ ابن الصلاح ص ۲۴۲ لزین الدین العراقی

[5] الاجوبۃ الفاضلۃ ص ۳۰

جوا مع ہے دستیاب ہے تو کیا بعید ہے کہ یہی وہ جامع ہوا ور مسند کوئی اور ہو۔ عراقی کے اس شبہ نے یہ ایک مستقل تحقیق طلب سوال پیدا کر دیا ہے۔ اگر چہ ان کے اس قول میں اور مذکورہ بالا بیان میں تعارض ہے کہ ابن الصلاح نے سنن دارمی کو مسند کہہ کر غلطی کی ہے کیونکہ جب یہ احتمال موجود ہے کہ مسند کوئی اور ہوا ور جامع یہ ہو تو پھر اس اعتراض کا کیا موقع ہے کہ ابن الصلاح نے جامع کو مسند کہہ دیا، ہو سکتا ہے کہ ابن الصلاح نے جسے مسند کے نام سے ذکر کیا ہے وہ مسند ہی ہو۔ لیکن حافظ عراقی نے بھی اس کو علی الفہم ذکر س دائخ کے الفاظ سے ذکر کیا ہے یعنی میرے اس اعتراض کے ساتھ ساتھ یہ شبہ بھی ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ خود حافظ عراقی کو اگر اس شبہ کا حل مل جاتا تو انھیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ بہر حال یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ امید ہے کوئی صاحب اس پر توجہ فرمائیں گے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کا تذکرہ کتاب السنن المسمی بمسند الدارمی (کتاب السنن جو مسند دارمی کے نام سے موسوم ہے) کے الفاظ میں کیا ہے۔

سنن دارمی کا مرتبہ

اس کتاب کی سند صحاح کی اکثر کتابوں سے عالی ہے اس لئے اس کا مقام بھی بہت بلند ہے اور محدثین نے بہت اونچے الفاظ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ علامہ حافظ علاؤ الدین مغلطائی المتوفی ۷۶۲ھ نے اس کو الصحیح کہا ہے اور ان سے قبل ہماری اس کتاب الترغیب والترہیب کے مصنف علامہ زکی الدین المنذری المتوفی ۶۵۶ھ اس کو الصحیح لکھ چکے ہیں بلکہ حافظ مغلطائی نے تو کہا ہے کہ اہلِ علم کی ایک جماعت اس کو الصحیح کہتی ہے[۵] اور بعض علماء نے دعویٰ کیا ہے کہ سنن دارمی صحیح بخاری سے پہلے لکھی گئی ہے۔ حافظ ابن حجر اس سے اختلاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "مجھے یہ تسلیم نہیں ہے اور جسے اس کا دعویٰ ہو وہ ثبوت پیش کرے۔

---

[۵] مقدمہ سنن دارمی ص۳

اس کا جواب ترکی بہ ترکی علامہ سید محمد بن اسماعیل الامیر نے اپنی شرح توضیح الافکار علی تنقیح الانظار میں دیا ہے کہ جسے صحیح بخاری کی تصنیف کے مقدم ہونے کا دعویٰ ہو وہ کہیں اس کا ثبوت پیش کرے[1]۔ حافظ مغلطائی المتوفی ۷۶۲ھ فرماتے ہیں کہ ابن ماجہ کی جگہ اگر سنن دارمی کو رکھا جائے تو بہت مناسب ہے[2]۔

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ:

انہ لیس دون السنن فی المرتبۃ بل لو ضم الی الخمسۃ لکان اولیٰ من ابن ماجۃ فانہ امثل منہ بکثیر[3]	سنن دارمی مرتبہ میں دیگر کتب سنن سے کم نہیں ہے بلکہ اگر اسے پانچ کتابوں (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی) کے ساتھ ابن ماجہ کی جگہ میں لگا دیا جائے تو یہ اس سے بہتر ہے کیونکہ یہ ابن ماجہ سے بدرجہا فائق ہے۔

ملا علی قاری نے شرح مشکوٰۃ میں حافظ ابن حجر کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا ہے:

ینبغی ان یجعل مسند الدارمی سادسا للخمسۃ بدلہ فانہ قلیل الرجال الضعفاء، نادر الاحادیث المنکرۃ والشاذۃ وان کان فیہ احادیث مرسلۃ وموقوفۃ فھو مع ذلک اولیٰ منہ[4]	مناسب یہ ہے کہ پانچ کتابوں کے ساتھ ملا کر چھٹی کتاب مسند دارمی قرار دی جائے کیوں کہ اس میں ضعیف راوی کم ہیں اور منکر و شاذ روایات بھی نادر ہیں۔ اور اگرچہ اس میں چند مرسل و موقوف حدیثیں بھی ہیں لیکن اسکے باوجود یہ سنن ابن ماجہ سے اولیٰ ہے۔

---

[1] مقدمہ سنن دارمی صٹ [2] ایضاً [3] تدریب الراوی ص۱۰۲ للسیوطی، کشف الظنون ج ۲ ص۳۳۳
[4] مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۱ ص۲۳، فی ترجمۃ ابن ماجہ

محترم مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی فرماتے ہیں کہ "واما اضافۃ الدارمی بدل ابن ماجۃ فالقول بہ حادث وقع بعد اضافۃ سنن ابن ماجۃ الی الکتب الخمسۃ" یعنی دارمی کو چھٹی کتاب قرار دینے کا قول حادث اور نیا ہے جو ابن ماجہ کو چھٹی کتاب قرار دیئے جانے کے بعد سامنے آیا ہے لیکن یہ بات خود ثابت نہیں ہے کہ ابن ماجہ کسی بھی دور میں بلا اختلاف چھٹی کتاب مانی گئی ہو۔ علامہ رزین بن معاویۃ العبدری المتوفی ۵۳۵ھ نے پانچ صحاح کے ساتھ چھٹی کتاب موطا امام مالک قرار دی ہے۔ علامہ ابن الاثیر المتوفی ۶۰۶ھ نے جامع الاصول میں یہی مسلک اختیار کیا ہے اور یہی ابن الدیبع[a] الشیبانی متوفی ۹۴۴ھ نے جامع الاصول کی تلخیص تیسیر الوصول میں کیا ہے۔ حافظ مغلطائی، حافظ العلائی، حافظ ابن حجر عسقلانی اور ملا علی قاری وغیرہم کی رائیں آپ کے سامنے ہیں ایسی صورت میں یہ کیسے درست ہے کہ ہم سنن ابن ماجہ کے چھٹی کتاب ہونے کو ایک طے شدہ مسئلہ سمجھ لیں۔

اور جن لوگوں نے ابن ماجہ کی تعریف کی ہے ان کے الفاظ دیکھئے تو تعریف کے ساتھ تقریباً ہر ایک نے تنقید ضرور کی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے البدایۃ والنہایۃ میں لکھا ہے "کلہا جیاد سوی الیسیر" یعنی سب حدیثیں اچھی ہیں سوائے چند احادیث کے (ج ۱۱ ص ۵۲)، حافظ ذہبی نے کہا ہے "کتاب حسن لولا کدرہ من احادیث واھیۃ لیست بالکثیرۃ"، یعنی یہ کتاب بہت عمدہ تھی اگر اسے چند بے اصل حدیثوں نے مکدر نہ کر دیا ہوتا اگرچہ ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔

محترم مولانا محمد علی کاندھلوی دارمی کے متعلق حافظ ابن حجر کی مذکورہ بالا رائے نقل کرنے کے بعد اسے کمزور کرنے کے لئے لکھتے ہیں۔

"لیکن اس تصریح کے باوجود حافظ ابن حجر کا عمل اس کے خلاف ہے چنانچہ محدث محمد بن اسماعیل الیمانی لکھتے ہیں کہ "صحاح خمسہ کے ساتھ موطا بھی

---

[a] بفتح الدال وسکون الیاء المثناۃ التحتانیۃ وبفتح الباء الموحدۃ وفی آخرہا عین مہملۃ ساکنۃ

ہے جیسا کہ جامع الاصول میں ابن الاثیر نے کہا اور کچھ لوگوں نے ان کی جگہ ابن ماجہ کو رکھا ہے۔ اسی کے پیش نظر حافظ ابوالحجاج المزی نے تہذیب الکمال میں رجال کی ترتیب قائم کی ہے اور اسی راہ کو اس کتاب کے اختصار میں حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں اور علامہ خزرجی نے خلاصہ میں اختیار کیا ہے[۵]"

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اس اقتباس کو ذکر کرکے یہ کہنا کہ ابن حجر کا عمل ان کی مذکورہ بالا رائے کے خلاف ہے کسی طرح درست نہیں۔ یہاں ابن حجر اپنی طرف سے کوئی مستقل کتاب نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ حافظ مزی کی کتاب تہذیب الکمال کا اختصار کر رہے ہیں اور چونکہ اصل کے مصنف کا رجحان ابن ماجہ کو سادس ستہ قرار دینے کی طرف ہے اس لئے اس کے اختصار میں اسی رائے کا باقی رکھنا ضروری ہے لہذا اس کو ابن حجر کی رائے قرار دینا ہی صحیح نہیں ہے۔ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی کی اس رائے پر دوسرا اعتراض محترم مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی نے کیا ہے۔ چنانچہ "ما تمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجۃ" میں اس سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے حافظ کا کلام نقل کرنے کے بعد "تناقض ابن حجر فی ھذا الباب" کا عنوان قائم کیا ہے اور اس کے تحت نقل کیا ہے کہ حافظ مغلطائی نے جو سنن دارمی کو "الصحیح" کہا ہے حافظ ابن حجر کو اختلاف ہے۔ ناظرین بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ:۔ (۱) دارمی "الصحیح" ہے یا نہیں (۲) اور ابن ماجہ کے مقابلہ میں دارمی مقدم ہے یا نہیں؟ یہ دونوں بالکل الگ باتیں ہیں۔ حافظ مغلطائی کی رائے ہے کہ دارمی "الصحیح" کا درجہ رکھتی ہے، حافظ ابن حجر کو اس سے اتفاق نہیں دوسری رائے حافظ مغلطائی اور صلاح الدین العلائی وغیرھما کی یہ ہے کہ سنن ابن ماجہ کے بمقابلہ سنن دارمی صحاح ستہ میں جگہ پانے کی زیادہ حقدار ہے اس رائے سے حافظ ابن حجر کو پورا پورا اتفاق بلکہ وہ دارمی کو ابن ماجہ سے بدرجہا

---

۵ امام اعظم اور علم الحدیث ص۳۴۴ مصنفہ مولانا محمد علی کاندھلوی بحوالہ توضیح الافکار ج ۱ ص۵۵

بہتر قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں باتوں کو ذکر کرکے حافظ ابن حجر کے کلام میں تناقض قرار دینا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

علامہ شیخ محمد عابد سندھی نے امام صلاح الدین العلائی سے نقل کیا ہے کہ:۔

لو قدم مسند الدارمی بدل ابن ماجة فکان سادسا لکان اولی[51]

اگر مسند دارمی کو سنن ابن ماجہ کی جگہ میں رکھدیا جائے اور اسے چھٹی کتاب قرار دیا جائے تو بہت اچھا ہو۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مقدمۂ مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ "بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ سنن دارمی اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ اس کو صحاح ستہ میں چھٹی کتاب کی جگہ دی جائے اس لئے کہ اس میں ضعیف رجال بہت کم ہیں اور منکر و شاذ روایات بھی اس میں شاذ و نادر ہیں اور سند میں بھی اس کی عالی ہیں اور اس میں بخاری سے بھی زیادہ ثلاثیات[52] ہیں[53] ابو حاتم نے دارمی کی ثلاثیات کی تعداد پندرہ بیان کی ہے[54]۔

پہلی حدیث ثلاثی یہ ہے۔ دارمی کہتے ہیں۔ حدثنا جعفر بن عون انبانا یحیی بن سعید عن انس قال جاء اعرابی الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فلما قام بال فی ناحیة المسجد[55] الخ

اس حدیث میں امام دارمی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف تین واسطے ہیں جعفر بن عون، یحییٰ بن سعید اور حضرت انس صحابی رضی اللہ عنہ۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے تدوین حدیث میں ایک جگہ سنن دارمی کے متعلق لکھا ہے کہ یہ حدیث کی مستند کتاب اور اس کا درجہ صحاح کی اکثر کتابوں سے بلند ہے[56]

---

۵۱ قاله الشیخ السندھی فی ثبتہ۔ (مقدمہ سنن دارمی ص۲) ۵۲ "ثلاثی" وہ روایت کہلاتی ہے جس کی سند میں محدث کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف تین واسطے ہوں۔ ۵۳ مقدمہ مشکوٰۃ ص۲، ۵۴ مقدمہ سنن دارمی ص۱۶
۵۵ سنن دارمی ص۱۱ باب البول فی المسجد ۵۶ تدوین حدیث ص۲۶

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ سنن دارمی جامعیت، حسن ترتیب اور علو اسناد ہر لحاظ سے اس رائے کی مستحق ہے جو یہاں اہل علم پیش کر رہے ہیں ضرورت ہے کہ اہل قلم حضرات مختلف پہلوؤں سے اس کا تعارف کرائیں اس کی اہمیت کو واضح کریں اور مشائخ حدیث اور ارباب مدارس اس کی طرف توجہ فرمائیں اور اسے درس میں شامل کریں۔

نواب صدیق حسن خاں بھوپالی مرحوم نے سنن دارمی کا قدیم نسخہ حاصل کر کے اس کا تکملہ اور دیگر نسخوں سے اس کا مقابلہ کرا کر ۱۲۹۳ھ میں مطبع نظامی کانپور سے شائع کرایا۔ اس کے کل صفحات ۴۴۲ ہیں خط بہت عمدہ اور جلی ہے۔ شروع میں مولانا محمد عبدالرشید بن محمد شاکشمیری کے قلم سے مقدمہ بھی ہے۔ ہندوستان کے اکثر بڑے کتب خانوں میں موجود ہے۔ میری نظر سے سنن دارمی کا یہی ایک نسخہ گزرا ہے۔ سنن دارمی ایک ہزار پانچ سو آٹھ الیواب پر مشتمل ہے جن میں تین ہزار پانچ سو ستاون حدیثیں آگئی ہیں[۱]۔ سنن دارمی ۱۳۴۹ھ میں دو جلدوں میں دمشق سے شائع ہوئی ہے۔

سنن دارمی کے تراجم

(۱) سنن دارمی کا مکمل ترجمہ تحت اللفظ با متن "اسلامیہ پرنٹنگ پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ دہلی" نے کرزن اسٹیم پریس میں طبع کرا کر شائع کیا تھا یہ ترجمہ متوسط (۲۰×۲۶) سائز کے پانچ سو چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ مرزا حیرت دہلوی کی نگرانی میں شائع ہوا ہے مترجم کے نام کی جگہ لکھا ہے کہ "فاضل علماء سے عربی کا اردو میں ترجمہ کرایا"۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ترجمہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی کا کیا ہوا ہو واللہ اعلم یہ ترجمہ میرے پاس موجود ہے اس پر سن طباعت درج نہیں ہے لیکن ڈاکٹر عبدالحق صاحب بابائے اردو مرحوم نے نہ معلوم کہاں سے اس کا سن طباعت ۱۳۰۰ھ بیان کیا ہے[۲]۔

(۲) دوسرا ترجمہ بامحاورہ سلیس اور شگفتہ اردو زبان میں ہے لیکن اخیر سے یہ اور مذکورہ ترجمہ دونوں بہت ملتے جلتے ہیں اس ترجمہ کا ایک نسخہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ مگر ناقص ہے[۳]۔

(۳) ڈاکٹر عبدالحق صاحب مرحوم نے ایک ترجمہ کا ذکر کیا ہے کہ مطبع سعیدی کراچی سے ۱۹۵۱ء

---

[۱] بستان المحدثین ص۴۸ [۲] قاموس الکتب ص۱۵۷ [۳] مراسلت مکرم مولانا ظفر الدین صاحب مفتاحی و محترم مولانا سید محبوب صاحب رضوی۔

میں شائع ہوا ہے اور اس پر مفتی انتظام اللہ شہابی کا مقدمہ ہے صفحات ۶۹۶ ہیں۔[۱] لیکن نہیں کہا جا سکتا کہ ہم نے نمبر ۲ میں جس ترجمہ کا ذکر کیا ہے یہ وہی ہے یا کوئی اور ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے "اتحاف المہرۃ باطراف العشرۃ" میں جن دس کتابوں کے اطراف جمع کئے ہیں ان میں دارمی بھی ہے۔ ذیل التذکرۃ لابن فہد ص۳۳۲۔ اس اتحاف المہرۃ کا قلمی نسخہ مکتبہ مرادیہ آستانہ میں محفوظ ہے (حاشیہ کوثری برذیل مذکور)

وفات امام دارمی عرفہ کے دن جمعرات کو بعد نماز عصر سن دو سو پچپن ہجری (۲۵۵ھ) میں فوت ہوئے اور عید الاضحیٰ جمعہ کے روز دفن کئے گئے۔[۵۳]

اسحٰق بن احمد بن خلف البخاری کہتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو جب امام دارمی کی وفات کی اطلاع کا خط ملا تو آپ نے انتہائی صدمہ سے سر جھکا لیا آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور بے ساختہ آپ کی زبان سے یہ حسرت آمیز شعر نکلا حالانکہ بجز ان اشعار کے جو احادیث میں آگئے ہیں یا جس کی ضرورت کسی لغت کی تحقیق کے سلسلے میں پڑ گئی ہے آپ کبھی شعر نہیں پڑھتے تھے ؎

إن تبق تفجع بالاحبة كلهم
وفناء نفسك لا ابا لك افجع[۵۴]

ترجمہ: اگر تو زندہ رہے گا تو تمام دوستوں کی موت کا صدمہ تجھ ہی کو اٹھانا پڑے گا۔ لیکن خود تیری موت کا سانحہ ان سب سے زیادہ المناک ہے۔

رحمۃ اللہ علینا وعلیہم اجمعین

---

[۱] قاموس الکتب ص۱۳۲ [۵۲] تاریخ بغداد ج۱۰ ص۳۲، [۵۳] تہذیب التہذیب ج۵ ص۲۹۶
مقدمہ سنن دارمی ص۱

مرزا غالب اور مدرسۂ کار کمپنی

(۲)

پروفیسر ابو محفوظ الکریم معصومی۔ مدرسۂ عالیہ، کلکتہ

کلیات میر تقی میر ۱۸۱۱ء میں طبع ہوا۔ سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے۔ "مدرسۂ عالیہ کے لئے نوازش تفضلات سے صاحبان عالی شان کالج کانسل ..... بہ تصحیح مرزا کاظم علی جوان اور مرزا جان طپش و مولوی محمد اسلم و قادر چرن متر... ۱۸۱۱ء میں مطابق ۱۲۲۶ ہجری، ہندوستانی چھاپہ خانے میں چھاپا گیا ہوا۔"

رقعات جامی کا پہلا ایڈیشن مولوی الہ داد نے ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے خاتمہ کا اقتباس حسب ذیل ہے:۔

برضمیر نگاہان .... پوشیدہ نماند کہ چون برائے صاحبان عالیشان جماعۂ متعلمین مدرسۂ عالیہ، کہ در صدد کسب مہارت بزبان فارسی اند، از اقسام نثر اکثر... مثل بہار دانش و اخلاق محسنی، و انشائی ابوالفضل و اخلاق جلالی، در تحت طبع در آمد خواستم کہ برائے طبع نثرے برگزینم ....، (طبع دوم ۱۲۴۲ھ ۱۸۲۷ء در مطبع ایشیاٹک لتھوگرافک کمپنی)

ظاہر ہے کہ صاحبان عالیشان جس مدرسۂ عالیہ کے متعلم تھے، وہ فورٹ ولیم کالج ہی ہو سکتا ہے۔ یا کلیات میر کی طباعت جس مدرسۂ عالیہ کے لئے ہوئی تھی اس سے یہی کالج مراد لیا جا سکتا ہے، نہ کہ محمڈن کالج۔

برہان قاطع مطبوعہ ۱۸۱۸ء، قصہ حاتم طائی (۱۸۱۸ء) مطبوعہ۔

وغیرہ کے سرورق اور دیباچہ میں مدرسۂ عالیہ فورٹ ولیم، مدرسۂ عالیہ، اور مدرسہ عالیہ کالج کے الفاظ ملتے ہیں جو فورٹ ولیم کالج کے لیے لکھے گئے ہیں۔

منتخب الفوائد محمد خلیل علی خاں اشک کی قابلِ قدر تالیف ہے، جو دراصل کتاب آداب الحرب والشجاعۃ کا ترجمہ ہے جس کا دوسرا نام اوصاف الملوک وطرق حروبہم ہے۔ اس کے دیباچہ میں مترجم کا یہ بیان ملتا ہے۔ "احقر العباد محمد خلیل علی خان نے کہ تخلص جس کا اشک ہے سن بارہ سے چھبیس(۲۶) کے درمیان مطابق اٹھارہ سو دس عیسوی کے، وقت میں محمد اکبر بادشاہ غازی کے اور عہد میں..... لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر ممالک محروسہ سرکار کمپنی انگریز..... اور حکومت میں خداوند نعمت کپتان ٹیلر صاحب دام حشمتہ کی، انتظام میں..... ڈاکٹر ولیم ہنٹر صاحب دولت کے، کتاب اوصاف الملوک وطرق حروبہم کو، کہ سلطان التمش کے حکم سے جس کو محمد منصور سعید ابو الفرح خلیل نے بمشقت تمام بڑی جد وجہد سے ہزاروں کتابوں کا انتخاب کرکے تالیف کیا تھا، زبان میں موافق محاورے کے، واسطے مدرسۂ عالیہ کے ترجمہ کیا.... نام اس کا منتخب الفوائد رکھا۔ کیونکہ تاریخ بھی اس کی یہی ہے" (مخطوطہ نمبر ۱۲، اردو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ)

منقولۂ بالا عبارت میں مدرسۂ عالیہ، یقیناً فورٹ ولیم کالج کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

۱۸۰۳ء میں خرد افروز کا نسخہ تیار ہوا، مقدمہ میں مترجم کا بیان حسب ذیل ہے:

"بعد حمد ونعت کے شیخ حفیظ الدین احمد بن شیخ جلال الدین محمد بن شیخ محمد ذاکر صدیقی، کہتا ہے کہ اس فقیر کے جد اعلیٰ پہلے عرب سے دکن کو آئے، بعد دو تین پشتوں کے شیخ حسن مغفور، جنت البلاد بنگالے کو تشریف لائے..... اس حقیر نے بیس برس کے سن تلک مدرسہ کمپنی میں رہ کر علوم عربی و فارسی سے فراغت کی، جو فکر معیشت کی انسان کو لازم ہے، تحصیل علم کے بعد تلاش میں در آیا، اور کمپنی بہادر کے اس مدرسۂ عالی میں نوکر ہوا کہ جس کی بنا امیر بیہ تدبیر اشرف الاشراف مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کے عہد میں ہوئی۔ (مخطوطہ نمبر ۱۱۸، اردو، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ)

اس عبارت میں مدرسہ کمپنی سے، جہاں شیخ حفیظ الدین نے تحصیل علم کی، یقیناً

مدرسۂ عالیہ یا محمڈن کالج مراد ہے جو اس وقت تک بیٹھک خانہ روڈ پر واقع تھا اور کمپنی کے مدرسۂ عالی سے جس کی بنا گورنر جنرل ویلزلی کے عہد میں ہوئی فورٹ ولیم کالج مراد ہے۔

فتاویٰ قاضی خاں کی چار جلدیں ۱۸۳۵ء میں ایشیاٹک لیتھوگرافک پریس میں طبع ہوئی تھیں، تصحیح کرنے والوں میں ایک نام مولوی حافظ احمد کبیر، امین مدرسۂ کمپنی بہادر کا ملتا ہے۔ انگریزی سرورق پر ان کے نام کے ساتھ SUPERINTENDENT OF THE GOVERNMENT MADRASA لکھا ہے۔ امین مدرسۂ کمپنی بہادر سے محمڈن کالج کے عہدہ نائب سکریٹری کی طرف اشارہ ہے جس پر حافظ صاحب ۱۸۲۳ء ہوئے تھے[۱]

سید منصور علی بن سید امام بخش حسینی موسوی سبزواری نے قصۂ سیف الملوک کا ترجمہ بحر عشق کے نام سے کیا تھا اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں ــ" ...... کلکتہ میں وارد ہو کر بصیغۂ منشی گری صاحبانِ عالیشان نوآموزوں کی تعلیم و درس کے واسطے، مدرسے میں کمپنی انگریز بہادر دام اقبالہ کے تفرقِ ہندوی میں سرفراز ہوا ہے ...... سن بارہ سو اٹھارہ ہجری میں مطابق اٹھارہ سو تین عیسوی (۱۸۰۳) کے زبان ریختہ نثر میں ترجمہ کیا (ورق : ۲، مخطوطہ نمبر ۱۱) یہاں مدرسہ کمپنی انگریز بہادر سے فورٹ ولیم کالج مراد لیا گیا ہے۔

اقتباسات منقولۂ بالا سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مدرسۂ عالیہ، مدرسۂ عالی، مدرسۂ کمپنی

---

[۱] حالات کیلئے دیکھئے: تذکرۂ کاملان رامپور ص۲۹، تاریخ مدرسہ عالیہ ج ۱ ص۹۲

حافظ صاحب کی نگرانی میں ایک ہفتہ وار (آئینۂ گیتی نما) کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ شاہ الفت حسین فریاد اسی ہفتہ وار کے سلسلہ میں راجہ محبوب سنگھ کو لکھتے ہیں: الحال اخبار یکہ مسمی با آئینۂ گیتی نماست و ظہور محاسن آن موقوف بر مطالعہ عالی است و در مدرسۂ عالیہ باہتمام فاضل نحریر یگانۂ عالم بے نظیر حافظ احمد کبیر صاحب مطبوع می شود۔ قطعہ از این بعالی خدمت ہم سمت ابلاغ می یابد اگر پسند جناب سامی باشد، بفقیر ارشاد ورود کہ در بندگی حافظ صاحب اعلام کنند۔ تا در ہر ہفتہ بخدمت عالی رسیدہ باشد (ریاض الافکار، تذکرۂ فریاد)

کا اطلاق فورٹ ولیم کالج پر بھی ہوتا تھا اور کبھی محمڈن کالج سے تمیز کرنے کے لئے فورٹ ولیم کالج کو مدرسۂ جدید کہتے تھے (دیباچہ انتخاب سلطانیہ۔ مخطوطہ نمبر ۱۹، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ) لیکن کسی قید احترازی کا التزام بہر حال غیر ضروری تھا۔

مرزا غالب کی تحریر میں (مدرسۂ سرکار کمپنی) سے مدرسۂ عالیہ یا محمڈن کالج ، کی طرح فورٹ ولیم کالج بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔ اور جب دونوں باتوں کا احتمال ہے، کوئی وجہ نہیں کہ مشاعرہ کی جگہ خاص طور پر محمڈن کالج یا مدرسۂ عالیہ کو قرار دیا جائے۔ اس ترجیح کے لئے کسی خارجی دلیل یا کم از کم قرینہ کا پایا جانا ضروری ہے۔ ہمارے علم میں اہل تحقیق میں سے جن لوگوں نے صراحت کے ساتھ مدرسۂ سرکار کمپنی سے ولزلی اسکوائر کے مدرسۂ عالیہ کو مراد لیا ہے ان کی تحریریں دلائل و قرائن سے یکسر خالی ہیں۔

تھوڑی دیر کے لئے اگر دوسرے احتمال کو تسلیم کرلیں اور غالب کے مدرسۂ سرکار کمپنی سے فورٹ ولیم کالج کو مراد لیں تو ہمارے خیال میں یہ ایسا احتمال ہے جسے مستبعد قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں، بلکہ تمام تر قرائن سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی روایات میں مشاعرہ بجا طور پر شامل رہا ہے اس کالج کے تحت ترجمہ و تالیف کا جو صیغہ قائم ہوا اس سے اردو زبان کے نثر نگار اور شاعر دونوں قسم کے ادبا وابستہ تھے اور منتخب اصحاب قلم اور شاعروں کی خاصہ جماعت فراہم ہوگئی تھی جس نے اپنے ادبی رجحان اور شاعرانہ مذاق کے لحاظ سے کلکتہ میں مشاعرہ کی بنا ڈالی۔ یہ مشاعرہ ہر سال بڑے اہتمام کے ساتھ ۲۵۔ جولائی کو منعقد ہوتا تھا۔ اس میں کلکتہ کے تمام چھوٹے بڑے شاعر، ہم طرح غزلیں سناتے تھے۔ اردو کے محسن اور دلدادہ انگریز بھی اس میں دل چسپی لیتے تھے اور ان کی نگرانی میں یہ مشاعرہ ایک باضابطہ شاعرانہ مقابلہ اور علمی دنگل ہو گیا تھا۔

۱۸۱۲ء میں جو مشاعرہ ہوا تھا اس میں کالج نے مرزا جان طپش کے کلیات کا نسخہ خریدا اور اس کی شاعرانہ قابلیت کے اعتراف میں گراں قدر صلہ دینے کے علاوہ کلیات کو شائع کیا۔

(ملاحظہ ہو ارباب نثر اردو ص ۲۵۶-۲۵۷)

منشی بینی نرائن جہاں کی تالیف دیوان جہاں میں جس کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے ۲۵ جولائی ۱۸۱۵ء کے مشاعرہ کی غزلیں گل دستہ کی شکل میں درج[1] ملتی ہیں۔ غزل طرح میں کاظم علی جواں، میر حیدر بخش حیدری، سید جعفر علی روان، افتخار الدین علی خاں شہرت مرزا ہاشم علی عیاں (پسر جوان) ابوالقاسم خاں قاسم[2]، میرزا قاسم علی ممتاز (پسر جوان) مرزا لطف علی ولد نظر آتے ہیں۔

---

[1] دیوان جہاں کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی میں نظر آیا اس میں مشاعرہ کی تاریخ سنہ کے بغیر درج ہے (ورق ۱۷۳-ب، مخطوطہ نمبر ۵۶)

[2] ابوالقاسم خاں قاسم کے لئے دیکھئے مولانا مہر کی کتاب غالب (ص ۳۰-۳۱، ۱۱۳-۱۱۴) نیز یاران غالب تیر عرشی (ص ۳۸) مولانا مہر لکھتے ہیں: قاسم کے متعلق کوئی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی وہ فارسی کے شاعر تھے۔ مولانا مہر نے قاسم اور طپاں کی مدح میں غالب کا ایک قطعہ الناظر (لکھنؤ) کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ دیوان جہاں میں بینی پرشاد لکھتے ہیں: قاسم تخلص نام ابوالقاسم خاں، خاندان شاہی سے کچھ قرابت رکھتے ہیں اور اس خاکسار کو بھی ان کی خدمت میں نیاز ہے۔ بالفعل کلکتہ میں تشریف رکھتے ہیں (ورق ۹۴ ر ظ-۹۵) اس کے بعد قاسم کی تین غزلیں نقل کی ہیں:

(۱) سمجھے وہی انداز مرے طرز سخن کا — نالہ ہو سنا جس نے کبھی مرغ چمن کا (کل ۷ ابیات)
(۲) شور و فغاں ہے متصل لوں کی ہم دھوم ہے — شاید دل جاں ہی یا مرگ دل مرحوم ہے (کل ۹ شعر)
(۳) اشکوں سے ہر مژہ ہے مری نسترن کی شاخ — پھولوں میں کیا کبھی ہے یہ میری چمن کی شاخ (کل ۷ بیت)

۲۵ جولائی کے مشاعرہ میں قاسم نے جو غزل پڑھی تھی اس کا مطلع ہے:

ہجر میں اک گل کے گل ہاتھوں پہ کھایا چاہیئے — ہاتھ کو گلدستۂ رنگین بنایا چاہیئے

مقطع میں فرماتے ہیں:

لگ رہی ہے لو یہی قاسم کئی دن سے ہمیں — حضرت دہلی کو کلکتے سے جایا چاہیئے

(دیوان جہاں، ورق ۱۷۶ ب-۱۷۷ ر ظ)

سالانہ مشاعرہ کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی کالج سے منسلک حلقہ شعراء کے اہتمام میں ہر مہینے مشاعرے ہوتے ہوں گے، جن میں اردو فارسی کی غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ بظاہر یہی سلسلہ غالب کے قیامِ کلکتہ کے زمانہ تک باقی رہا جس کا تذکرہ انھوں نے مسدس اٹھتی یاتندہ کے خط میں کیا ہے۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ یا محمڈن کالج میں کبھی مشاعرہ کا منعقد ہونا ثابت ہو جائے تو بات دوسری ہے۔ ورنہ پابندی کے ساتھ ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو بزمِ سخن کا آراستہ کیا جانا ہو خاص اہتمام چاہتا ہے، وہ کسی مدرسے کے علماء اور اصحابِ فن کے مذہبی ماحول، دینی مذاق، اور مدرسی مزاج سے پوری طرح مطابقت نہیں رکھتا اس کے برعکس فورٹ ولیم کالج کے حلقۂ ادب سے وابستہ اصحابِ شعر و سخن کے زیرِ اہتمام، ان کے ذوق، میلانِ طبع بخصوص ادبی رجحان اور شاعرانہ ماحول کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہر مہینے ایک مقررہ دن میں بزمِ سخن منعقد کرنے کی بات بہمہ وجوہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

مرزا غالب کے بیان سے معلوم ہو چکا ہے، کہ یہ مشاعرہ ہر مہینے، پہلے اتوار کو ہوتا تھا۔ مدرسۂ عالیہ (محمڈن کالج) میں جمعہ کے سوا ہر روز تعلیم ہوتی تھی اتوار کا دن بھی درس و تدریس کے ایام میں شامل تھا۔ ۱۸۶۹ء کی ترمیم کے بموجب مدرسہ اتوار کو پورے دن بند رکھا جانے لگا۔ اس طرح مدرسہ کے اسٹاف کو ولزلی اسکوائر کی نئی عمارت میں منتقل ہونے کے بعد بھی اتنی فرصت کہاں ملتی ہوگی کہ ہر مہینے پہلے اتوار کو بزمِ سخن آراستہ کرنے کا اہتمام کرتے۔ علاوہ بریں مدرسہ کا اسٹاف غالب کے قیامِ کلکتہ کے بعد تک اس قدر محدود تھا کہ اس کے لئے مشاعروں کا اہتمام کرنا خاصہ دشوار کام تھا۔ غالباً اس وقت تک بہ شمولیت مدرس اوّل کل پانچ استاذ اور خطیب و مؤذن اسٹاف میں ہوتے تھے۔ (تاریخ مدرسہ عالیہ: ص ۶۴-۶۵ حصّہ اوّل) پھر مشاعرہ کی مجلس معمولی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ سامعین کی خاصہ کثرت ہوتی تھی اور ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی تھی۔ آپ خود

مرزا کی زبانی سن چکے ہیں کہ جس مشاعرہ میں ان پر اعتراضات کئے گئے، اس میں پانچ ہزار کا مجمع تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ مدرسہ کا اندرونی صحن پانچ ہزار کے لگ بھگ مجمع کے لئے "جائے تنگ است و مردماں بسیار" کا مصداق ہے۔ اس صحن میں اتنے بڑے مجمع کے لئے گنجائش نہیں نکل سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مرزا غالب نے کلکتہ کا سفر جس مقصد سے کیا تھا اس میں کامیابی کا راستہ کچھ اسی طرح ہموار ہو سکتا تھا کہ فورٹ ولیم کالج کے ارباب علم وادب سے تعلق و تعارف پیدا کیا جائے۔ لہٰذا یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ غالب فورٹ ولیم کالج سے یکسر بے تعلق رہ گئے ہوں۔ علی الخصوص جبکہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ فورٹ ولیم کالج مرزا غالب کی مراجعت کے بعد بھی ایک عرصہ تک کمپنی کے ارباب بسط وکشاد کی مخالفت کے باوجود اپنی بیشتر روایات کے ساتھ قائم رہا۔ مثنوی بادِ مخالف کے نسخے جن لوگوں کے پاس گویا بطور معذرت نامہ بھیجے گئے تھے ان کے نام خود مرزا غالب نے بتلائے ہیں ان میں سے کسی ایک کا تعلق مدرسہ عالیہ کلکتہ سے ثابت نہیں اس کے برعکس مولوی کرم حسین بلگرامی فورٹ ولیم کالج کے قدیم کارپرداز نظر آتے ہیں جو اواخر مئی ۱۸۳۰ء تک یقیناً کالج کے میر منشی رہے اور یکم جون ۱۸۳۰ء سے سو روپیہ پنشن پر متعلقہ خدمت سے سبکدوش کر دیے گئے۔[۱]

---

[۱] فورٹ ولیم کالج کے عملہ میں تخفیف کا فیصلہ خط مورخہ ۲۳ر فروری ۱۸۳۰ء کی رو سے کیا گیا اور اس کا نفاذ یکم جون ۱۸۳۰ء سے عمل میں آیا۔ شعبۂ فارسی میں کرم حسین بلگرامی کے علاوہ عبدالرحیم، نذر اللہ بدر علی معرضِ تخفیف میں آئے۔ شعبۂ ہندی کے تارنی چرن، میر حسین علی، مرتضیٰ خان اور شعبۂ بنگلہ کے رام کمار، اور گدا دھر، اسی تاریخ سے سبکدوش کئے گئے۔ ان میں ہر ایک کی پنشن مقرر ہوگئی اور آئندہ کے لیئے طے کر دیا گیا کہ کالج کا عملہ سکریٹری وسب سکریٹری پر مشتمل ہوگا میں بہت محدود اور ناگزیر تعداد منشیوں اور چند [illegible] شامل رہے [illegible] باقی اگلے صفحہ

مولوی عبدالقادر رامپوری اگر وہی مفتی عبدالقادر غمگین ہیں جن کا ذکر شوق نے کیا ہے۔ تو وہ بھی قطعاً کمپنی کے کارپردازانِ قدیم سے تھے ۔ صرف مولوی نعمت علی عظیم آبادی کا حال کچھ نہیں کھلتا، پھر بھی کلکتہ مدرسہ سے ان کا رشتہ جوڑنا خلاف واقعہ معلوم ہوتا ہے ۔ اگر یہ مشاعرہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے زیرِ اہتمام ہوا تھا تو مثنوی کے نسخوں کا مدرسہ سے وابستہ حضرات میں سے کسی ایک کے پاس نہ بھیج کر فورٹ ولیم کالج اور کمپنی کے راست خدمت گزاروں کے پاس بھیجنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں!

مذکورۂ بالا دلائل و وجوہ کی روشنی میں ہمیں اس عام خیال سے اتفاق کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، کہ مرزا غالب نے جس مشاعرہ میں شرکت کی تھی، وہ مدرسہ عالیہ ولزلی اسکوائر میں منعقد ہوا تھا۔ جبکہ پیش کردہ دلائل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس مدرسہ سرکار کمپنی میں ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو مشاعرہ کا اہتمام کیا جاتا تھا اس سے فورٹ ولیم کالج ہی مراد لیا جا سکتا ہے بقیہ

(حاشیہ) دیکھیے: (BENGAL PAST AND PRESENT: XXII, 138-141

غالب کے قیام کلکتہ کے زمانے میں فورٹ ولیم کالج کا سکریٹری DAVID RUDDLE. فارسی زبان کے شیدائیوں میں تھا۔ ۱۸۲۶ء میں اس عہدہ پر مقرر ہوا اور ۱۱ر جنوری ۱۸۳۲ء میں مستعفی ہو کر یورپ چلا گیا۔ دوبارہ ایران ہو کر ہندوستان آ رہا تھا کہ ۱۶۔ دسمبر ۱۸۳۵ء کو شیراز پہنچ کر فوت ہو گیا۔

فورٹ ولیم کالج کے لئے جو عمارت مخصوص تھی اس کا محل وقوع ڈلہوزی اسکوائر کے جنوبی سمت، کونسل ہاؤس اسٹریٹ کا ایک گوشہ تھا اسی عمارت کے بالمقابل ایک دوسری عمارت بھی کالج کی ضروریات کے لئے مصرف میں لی گئی تھی اور دونوں عمارتوں کو ایک گیلری کے ذریعہ ملا دیا گیا تھا۔

ملاحظہ ہو: H-E-A-COTTON, CALCUTTA OLD AND NEW P. 231, CALCUTTA-1907

۲۴۔ فروری ۱۸۵۴ء کو فورٹ ولیم کالج حکماً بند کر دیا گیا اور اس کی جگہ بورڈ آف اکزامنرز قائم ہوا۔ لیکن فورٹ ولیم کالج کا نام آئندہ ایک عرصہ تک بعض ذمہ دار عہدہ داروں کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ ولیم ناسولیس نے فتوح الشام ازدی کا انگریزی دیباچہ یکم جولائی ۱۸۵۴ء کو لکھتے ہوئے اخیر میں لکھا ہے۔ FORT WILLIAM COLLEGE, 1st JULY, 1854 دیباچہ میں مولوی کبیرالدین احمد کی امداد کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

IN THIS I WAS MUCH ASSISTED BY MAULVI KABIR UDDIN AHMED OF THE COLLEGE OF FORT WILLIAM (PREFACE, VI)

مولوی کبیرالدین احمد اور ناسولیس کے اشتراک عمل سے طلبۂ اینگلو پرشین ڈیپارٹمنٹ (کلکتہ مدرسہ) کے لئے ایک فارسی انتخاب بہ نام منتخب گل ترتیب ہوا تھا۔ اس کے انگریزی دیباچہ کے آخر میں ملتا ہے:

COLLEGE OF FORT WILLIAM, 1st SEPTEMBER, 1863

غالب اور معراج الخیال

ڈاکٹر شریف حسین صاحب قاسمی، ایم۔ اے شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی

سید میر وزیر علی عبرتی عظیم آبادی، انیسویں صدی عیسوی کے ایک برجستہ فارسی مصنفین میں سے ہیں۔ فارسی میں ان کی تقریباً سترہ تالیفات آج بھی محفوظ ہیں اور ان کے علاوہ کچھ اب دستیاب نہیں ہوتیں۔ ہمیں اس وقت عبرتی کی دیگر تصانیف سے سروکار نہیں، البتہ ان کے تذکرہ "معراج الخیال" میں غالب کے ترجمہ کو پیش کرنا مقصود ہے۔

عبرتی نے دو تذکرے فارسی میں تصنیف کیے ہیں۔ ایک تذکرہ معراج الخیال[1] ہے جو فارسی شعراء کے حالات پر مشتمل ہے۔ دوسرا تذکرہ "ریاض الافکار" ہے جس میں بعض فارسی نثر نگاروں کے ترجمے شامل ہیں "ریاض الافکار" کا مختصر تعارف نثار احمد فاروقی اپنے ایک مضمون بعنوان "غالب اور ریاض الافکار"[2] میں جو اسی موقر رسالہ کے ایک پچھلے شمارہ میں چھپا تھا، کرا چکے ہیں۔

---

(۱) ایشیاٹک سوسائٹی، شمار مخطوطہ ۰۰۶، یہ صاف ستھرے نستعلیق میں لکھا گیا ہے اور اس کا سائز ۱۱×۷ ہے۔

(۲) فاروقی صاحب کا یہ مضمون، اُن کی تصنیف "تلاش غالب" ص ۱۹۵ - ۱۹۹) میں شامل ہے۔

معراج الخیال ۲۰۵ شعرا کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں شامل بیشتر شعرا اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر اور انیسویں صدی عیسوی کے اوائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تذکرہ ۱۸۴۱ء/۱۲۵۷ھ میں مکمل ہوا۔ عبرتی نے اس موقع کی مناسبت سے ایک تاریخی قطعہ کہا ہے جو "معراج الخیال" میں موجود ہے اور اس قطعہ کے مندرجہ ذیل شعر میں "نظم روانی" سے یہ سنہ برآمد ہوتا ہے:

چو فکر سال ترتیبش نمودم　　چکید از خامہ ام نظم روانی[1]

۱۲۵۷

اس کے برخلاف عبرتی نے "ریاض الافکار" ۲-۱۸۵۱/۱۲۶۸ میں لکھنا شروع کیا اور اسی سال اسے مکمل کر لیا۔ یعنی "ریاض الافکار"، "معراج الخیال" سے گیارہ سال بعد معرضِ وجود میں آیا۔ مزید برآں عبرتی نے غالب کے متعلق جو کچھ "معراج الخیال" میں لکھا ہے وہ مفصل تر ہے اور "ریاض الافکار" میں شامل غالب کا ترجمہ اسی کا اقتباس ہے۔

عبرتی شخصاً غالب سے نہ مل سکے لیکن عبرتی نے اپنے دونوں تذکروں میں غالب کا ذکر بہت احترام سے کیا ہے "معراج الخیال" سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کے شاگرد خواجہ حیدر جان متخلص بشائق[2] سے عبرتی ملے تھے اور شائق نے عبرتی سے اپنے

۱۔ معراج الخیال": ورق ۸۵ الف

۲۔ ان کا نام خواجہ فیض الدین عرف حیدر جان اور تخلص شائق تھا۔ یہ جہانگیر نگر (ڈھاکہ) کے رہنے والے تھے اور ۳-۱۸۵۲/۱۲۶۹ میں فوت ہوئے: تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تلامذۂ غالب: (مالک رام)، مرکز تصنیف و تالیف، نکودر، ص ۱۶۸۔

استاد کی بہت تعریف و صیف کی تھی لیکن یہ امر تعجب ہے کہ عبرتی اپنے دونوں تذکروں میں غالب کی جائے پیدائش "دارالسلطنۃ دہلی" بتاتے ہیں جو درست نہیں بہرحال اس طرح کا تسامح فارسی و اردو کے بیشتر تذکروں میں نظر آتا ہے۔

معراج الخیال میں غالب کا ترجمہ اس وجہ سے اہم ہے کہ اس میں ایک ہمعصر شاعر اور مصنف نے غالب کے ساتھ کلکتہ میں پیش آنے والے ادبی معرکہ کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ اس سلسلے میں اپنی رائے دی ہے اور معترضین پر غالب کی بالادستی کا اعتراف کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ وہ لوگ جو غالب کو مرزا قتیل پر ترجیح دیتے ہیں وہ تکلف سے کام لیتے ہیں یعنی انصاف نہیں کرتے۔

عبرتی نے کلکتہ میں رونما ہونے والے معرکہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اہمیت کا حامل ہے۔ چونکہ عبرتی اس وقعہ کے صرف تین سال بعد ۲-۱۸۳۱/۱۲۴۸ میں کلکتہ گئے تھے[1] اور ظاہر ہے کہ عبرتی نے اس واقعہ کے ردعمل کو خود مشاہدہ کیا ہوگا۔

اس کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ شائق کلکتہ اور دہلی آئے تھے اور کلکتہ میں ہی غالب سے ان کی ملاقات ہوئی[2]۔ چونکہ غالب کی کلکتہ سے واپسی کے صرف تین سال بعد عبرتی کلکتہ پہنچے تھے اور ممکن ہے کہ شائق اس عرصہ تک کلکتہ میں مقیم رہے ہوں اس لئے غالباً حیدر جان شائق سے عبرتی کی ملاقات کلکتہ میں ہوئی تھی۔

عبرتی نے غالب کی فارسی اور اردو نظم و نثر کی بہت تعریف کی ہے بہرحال "معراج الخیال" میں غالب کے ترجمہ کو یہاں نقل کیا جا رہا ہے تاکہ غالب کے فن کے متعلق ان کے ایک ہم عصر کے خیالات کا علم ہو سکے: "غالب: اسم شریف آن نغز کلام، معنی تلاش، اسد اللہ خاں است، مولد حمیدہ اش خاک جوہر خیز دارالسلطنۃ دہلی، بتقریبی از شاہ جہاں آباد وارد شہر کلکتہ گشت[3]، سخن فہمان کلکتہ

---

(۱) عبرتی نے اپنی مختصر سوانح حیات اپنی ایک تصنیف حملۂ سکندری رامپور لائبریری، شمارہ ۲۴۹۲، میں لکھی ہے۔　(۲) تلامذۂ غالب، ص، ۱۶۸۔

(۳) غالب اپنی پنشن سے متعلق مقدمہ کی پیروی کے لیے ۱۸۲۸ء میں کلکتہ گئے تھے: ذکر غالب (طبع سوم) ص: ۵۷

پلی ہمہ دانی آں سیف لسان نبسردہ، حریفانہ آدینرشی ہا کردند، چون آن مغتنم روزگار خیلی سخن رس و ماہر این فن بود، کسی را از اہماعہ برخود دستی نداد، بلکہ ہمہ را مہر سکوت برلب نیسان نہاد۔ چنان چہ مختصر مسنوے کہ درمناظرہ اہل کلکتہ بنظم درآوردہ شاہد این مقال است۔ مگر بعض سخن شناسان کہ بر مرزا قتیل آن عالی افکار رأیجیع میدہند، خالی از تکلف نمی نماید۔ بن محرر اوراق را ہم چیزی نظم و نثر آن معنی یاب بہ بیاضی بنظر درآمدہ۔ البتہ در پارسی زبان شعری از خامہ فصاحت بارش میچکد کہ یاران ہم عصر را دل از فکر شعری سرد میکند، و نثری از قلم بلاغت نگارش می تراود کہ تنگ نگاہان این فن سپند از مردم دیدہ آن می سوزند و ہمچنان در ہندی زبان ہم از خوشگویان اند بلندی پایہ اش پیداست۔ از زبان خواجہ حیدر جان متخلص بشائق کہ از شاگردان عالی گفتار باشد، شنودیم کہ خیلی وارستہ مزاج و آزادانہ طبیعت زیست فرمودی، بہر بزمی کہ تشریف دادی، پردہ گوش اہل بزم از رنگین مقالی خویش روکش فصل بہاران ساختی۔ تادم تحریر این تذکرہ بشاہ جہان آباد بعیش و کامرانی میگذارد۔ جز این چند سطر از حال خجستہ مالش، بگوشم نخوردہ کہ زیب رقم میدادم، از آن غالب عرصہ سخندانی است"۔(۱) عبرتی نے "معراج الخیال" میں غالب کی جو غزل نقل کی ہے اس میں صرف پانچ شعر ہیں۔ اس کے برخلاف ضیاء الدین احمد خاں نیر کے مرتبہ غالب کے فارسی دیوان اور نولکشور کی مطبوعہ غالب کی فارسی کلیاتِ نظم میں اس غزل کے بارہ شعر ملتے ہیں جو شعر عبرتی نے نقل کیے ہیں وہ بغیر کسی اختلاف کے ان دونوں متذکرہ دیوان اور کلیات میں موجود ہیں "معراج الخیال" میں موجود غزل ذیل میں نقل کی جارہی ہے:

جنونِ مستم بفصل نوبہارم میتوان کشتن — صراحی برکف و گل در کنارم میتوان کشتن
تغافلہای یارم زندہ دارد ورنہ در بزمش — بجرم گریۂ بی اختیارم میتوان کشتن
جفا برچون منی کم کن اگر کشتن ہوس باشد — بذوقِ مژدۂ بوس و کنارم میتوان کشتن
بجرمِ اینکہ درمستی بپایان بردہ ام عمری — بکوی میفروشان در خمارم میتوان کشتن
گرفتم یار باشد بی نیاز از کشتنم غالب — بدردِ بی نیازیہای یارم میتوان کشتن

(۱) یہ بیاض عبرتی کے دوست میر ذوالفقار علی نے ترتیب دی تھی: ریاض الافکار، ۷، ۴۹ الف۔ بحوالہ تلاش غالب، ص ۱۹۸) (۲) معراج الخیال: ۵۱ ب و ۵۲-الف

ادبیات

انسان

ڈاکٹر اسما سعیدی - ایم - اے - بی ایڈ - پی - ایچ ڈی دہلی

آج بھی شام اور سحر ہے وہی — گردشِ وقت کا اثر ہے وہی
آج بھی ہے حسیں چمن کی فضا — عطر یار و خنک ہے بادِ صبا
آج بھی آبشار ہیں دلکش — وادی و کوہسار ہیں دلکش
آج بھی لالہ زار اور صحرا — دل پہ کرتے ہیں اک اثر گہرا
آج بھی ہے کشش بہاروں میں — نزہت و دلکشی نظاروں میں
آج بھی ضو فشاں ہیں نجم و قمر — مہر کی پڑتی ہے کرن سب پر
آج بھی آگ کا مزاج ہے گرم — طبعِ گل آج بھی ہے نازک و نرم
آج بھی آہ سادہ دل شبنم — رکھتی ہے اپنی آنکھ کو پرنم
آج بھی آسمان سے بادل — خشک صحرا کو کرتے ہیں جل تھل
آج بھی فطرتِ نسیم سحر — گل فشاں بھی ہے اور سرور آور
قاعدے سب وہی ہیں قدرت کے — رسم و آئیں، اصول فطرت کے
کیوں مگر یہ بدل گیا انساں — کیوں ہے تخریب کاری اس میں نہاں
سینۂ گیتی کا اس سے ہے لرزاں — ہے دلِ کائنات کیوں ترساں
مانگتے ہیں بہائم اس سے پناہ — اس کا شیوہ الگ، الگ ہے راہ
ظلم سفاکی اور چالاکی — اس کی طینت میں جھوٹ، بے باکی
قتل و غارت گری و خونریزی — رہزنی جور اور بے رحمی

بغض و نفرت، خصومت و غیبت — عیب جوئی، عداوت و تہمت
مکر و تزویر و کذب، خود غرضی — جعل، فن و فریب بد عہدی
ظاہری خلق و ظاہری اُلفت — ظاہری نیکی ظاہری عفّت
ظاہری ہمدمی و دلجوئی — ظاہری مہر و نرمی، ہمدردی
ظاہری خوشنمائی و خوبی — ظاہری ہر ادائے محبوبی
خود نمائی و خود سری و غرور — دوسروں کی تباہی پر مسرور
خود فریبی، تصنّع، جہل و ظلوم — شرمسار اس سے ہیں فنون و علوم
حیلہ جوئی بہانے لاف و گزاف — خوبیاں اس کی اس کے ہیں اوصاف
شکلِ انساں میں ہے یہ اک ابلیس — یہ کسی کا رفیق ہے نہ انیس
جہل و شر اور فساد سے معمور — ہر ادا میں کراہتیں مستور
اس کا ایماں ہے دولت و شہرت — اس کا یزداں ہے منصب و عزّت
خود پرستی و تمکنت، نخوت — حرصِ زر، حرصِ حشمت و شوکت
آرزوئے تموّل و سطوت — برتری اور دبدبہ عظمت
اس کے سارے تمدّن و آداب — فی الحقیقت تباہی کے اسباب
اس کی تفریح رقص و بے شرمی — ارغوانی شراب کی گرمی
شغل ہیں اس کے بے شمار و عجیب — عادتیں اس کی ہیں عجیب و غریب
بربریت ہے اس کا ادنیٰ شغل — گم مشینوں میں اس کی فہم و عقل
کھیلتا ہے یہ خون کی ہولی — آنکھ ظلم و ستم سے کب کھولی
جانتا ہے مآلِ ظلم و ستم — پھر بھی کرتا نہیں یہ رحم و کرم
رشوت و سود خواری اس کا شعار — عیش و عشرت سے رنگ پر ہے نکھار
نفس کا بندہ عشرتوں کا غلام — دشمنی دل میں لب پہ شیریں کلام

دوستی میں نہاں ہے غدّاری — طنز و طعنہ بہ شکلِ غم خواری
جو دو بخشش ہے اس کی مکّاری — اک مدد اور لاکھ عیاری
مصلحت کا اسیرِ ابن الوقت — عقل کا بودا اور دل کا سخت
کیا یہی ہے وہ محترم انساں — جو ازل سے ہے نائبِ یزداں
جو ملائک کا تھا کبھی مسجود — حسبِ تعمیلِ قادر و معبود
عالمِ رنگ و بو کی وجہ بنا — جاوداں ہے کبھی نہ ہوگا فنا
جس سے ہے کائنات کی تکوین — جو ہے دُنیا کا سب سے اعلیٰ مکین
ہیں تصرّف میں جس کے مہر و ماہ — سارے گردوں ہیں ایک گردِ راہ
ہیں گھٹائیں فضائیں جس کے لیے — نرم و نازک ہوائیں جس کے لیے
پھول کا حسن رونقِ گلشن — وادی و آبشار و دشت و دمن
کوہ و صحرا و گلستاں بستی — دونوں عالم کی رفعت و پستی
سب ثوابت تمام سیّارے — چرخ کے دلفریب نظّارے
بحر و بر، ابر اور باد و بہار — سب ہیں جس کے لیے جو ہے مختار
گردشِ وقت و صبح و شامِ حسیں — جس کی منّت پذیر جس کی رہیں
ہے تصرّف میں جس کی ہر اک شے — کر لیے جس نے بحر و بر سب طے
جس کو بخشی ہے حق نے اک قدرت — جس کا تابع ہے عالمِ فطرت
جس کی تخلیق پر خدا کو ناز — منکشف جس پہ کر دیئے سب راز
کی عطا جس کو عقل و فہم، ادراک — تاکہ ہو آشنائے ذاتِ پاک
وسعتِ دل، بلندیِ احساس — پختگیِ یقیں اُمید اور آس
علم و فن نطق و دانش و حکمت — عزم و جرأت شجاعت و ہمت
ذہن کی ہر بلندی و رفعت — جستجو شوق کام کی رغبت

آرزو و امید و سوزِ دروں   راحت و عیش، حسن کا افسوں
عشق کا جذبۂ لطیف و بلند   ڈالتا ہے جو آسماں پہ کمند
آنکھ کا نور و برتری و شعور   پاکبازیِ رُوح دل کا سرور
ہیں یہ احساں خدائے برتر کے   مالکِ کائنات و سرور کے
جس پہ ہیں اس کے اس قدر احساں   کیا یہی ہے وہ ناسپاس انساں
جس کی تعلیم و تربیت کے لیے   حق تعالیٰ نے انتظام کیے
درسِ دین و معاشرت کے لیے   آشتی، امن و عافیت کے لیے
نورِ ایمان و آگہی کے لیے   رشد، نیکی، سلامتی کے لیے
رحم و انصاف اور کرم کے لیے   چارۂ درد و رنج و غم کے لیے
عالمی امن و دوستی کے لیے   عالمی بھائی چارگی کے لیے
باہمی اتحاد کی خاطر   دفعِ شرّ و فساد کی خاطر
اپنے بندے کے امتحاں کے لیے   اس کی بہبودیِ جہاں کے لیے
شرک کے ابتذال کی خاطر   جہل کے انفعال کی خاطر
دائمی انبساط کی خاطر   کفر کے انحطاط کی خاطر
کیے پیدا خدا نے پیغمبر   رہنما اور ہادیِ اکبر
تاکہ پیغامِ حق سنائیں اسے   راستہ خیر کا بتائیں اُسے
تاکہ پیدا ہو اس میں ہر خوبی   گرمیِ دین و جوشِ ایمانی
ہوشمندی خودی، خردمندی   راستی، سادگی و نرم دلی
غمگساری و عجز و ہمدردی   ہمدمی و شرافت و نرمی
مہر و اخلاص و گرمیِ اُلفت   بے ریائی و زہد اور عفت
زہد و فقر و توکّل و غیرت   صبر و محنت تحمّل و ہمّت

ضبط و حلم و حیا و نفس کشی　　اعلیٰ کردار اور نیک دلی
سعی و جہدِ عمل اولوالعزمی　　بادشاہی میں شانِ درویشی
پاکبازی و پاکیِ افعال　　جوش و عظمت بلندیِ اعمال
خوفِ اللہ اور خدا ترسی　　حبِّ اللہ اور وفاداری
حبِّ انسان و دلدہی، شفقت　　صدق و ایثار و عزت و حرمت
عیش سے اجتناب و بے زاری　　کبر سے احتراز اور دوری
درسِ پیغمبراں سے یہ انساں　　درسِ پیہم سے ان کی یہ انساں
سارے پیغمبروں کی ہمت سے　　رہنما، ہادیوں کی محنت سے
بن گیا تھا یہ نازشِ دوراں　　بزمِ انسانیت کا روحِ رواں
اس کی تقدیس پر تھے سب حیراں　　اس کے جبروت سے ہر اک لرزاں
اس کی ہیبت سے کانپتے تھے فلک　　محوِ حیرت تھے آسماں پہ ملک
رعب سے اس کے بادشہ ترساں　　خسرواں اس سے مانگتے تھے اماں
امن و انسانیت کا تھا پیکر　　تذکرے اس کے تھے کبھی گھر گھر
نیکیوں سے تھی زندگی تاباں　　پرجلال و منور و رخشاں
انکساری تھی اس میں، بے غرضی　　بے نیازی تھی اور خوش خلقی
تھا قلندر تونگری میں یہ　　بادشہ تھا قلندری میں یہ
دولت و زر کی سروری سے نفور　　جاہ و منصب کی دلبری سے نفور
اس سے شاداب تھا جہاں کا چمن　　اس سے جنت ہر ایک دشت و دمن
تھا کرم اس کا بیکراں عالی　　بیکسوں کا تھا وارث و والی
اپنے عیبوں پہ منفعل نادم　　حکمراں، اک خلیفہ و خادم
تھا غمِ دیگراں خود اس کا غم　　بے ریا یہ تھا صادق و ہمدم

خود پسندی سے رہتا یہ بیزار
تھا مثل اس کا بذل اور ایثار

علم و عرفاں کا سر بسر اک نور
روشنی جس کی تھی قریب و دور

عیب جوئی سے مجتنب تھا یہ
وقت کا اپنے محتسب تھا یہ

شخصیت میں تھی اس کی اک تاثیر
اعتماد و یقین کی تصویر

عدل و انصاف گستری تھا شعار
ہر ادا میں نہاں تھا ضبط و وقار

اس کا کردار ایک کوہِ عظیم
لطف اس کا تھا ایک لطفِ عمیم

وقت کا تھا یہ حاکم و آقا
وقت کا حیف یہ غلام ہوا

منکسر، محنتی و مخلص تھا
بذل و جود و کرم سے مفلس تھا

تھا شجاع و بہادر و جانباز
جانتا تھا یہ زندگی کا راز

فرض آگاہ و حق شناس و رحیم
مشفق و پاکباز اور کریم

اس سے آباد تھے یہ میخانے
بادۂ حق سے پُر تھے پیمانے

تھا وجود اس کا برکتوں کا سبب
خیر و انصاف، رحمتوں کا سبب

صابر و قانع و حلیم و غیور
آزمائش میں مطمئن مسرور

رزم اور بزم میں سدا مشغول
گاہ شمشیر و گاہ تھا اک پھول

سعی و کوشش کا تھا یہ اک طوفاں
حوصلہ، عزم و جستجو کا جہاں

تھا وسیع النظر دلِ بیدار
پاک ذہن و نگاہ سجدہ گزار

کیوں مگر یہ بدل گیا انساں
حیف، تھا یہ تو نائبِ یزداں

تبصرے

احتساب: چھوٹا اخباری سائز کتابت وطباعت بہتر۔ چندہ سالانہ چھ روپیہ پتہ: دودھ پور۔ علی گڑھ۔ مولانا محمد تقی امینی ناظم دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ملک کے مشہور اور صاحب تصانیف کثیرہ عالم اور اہل قلم ہیں۔

یہ ہفتہ وار اخبار مولانا کی ادارت میں ابھی چند ماہ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ اس کا قدم برابر ترقی اور اصلاح کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یوں تو ہر اشاعت میں متعدد اصلاحی اور مذہبی مضامین ہوتے ہی ہیں بڑی بات یہ ہے کہ یہ اخبار اپنے فاضل مدیر کے تعمیری اور اصلاحی افکار کا ترجمان ہوتا ہے۔ امید ہے کہ یونیورسٹی کے طلبا کے علاوہ عام مسلمان بھی اسے دلچسپی سے پڑھیں گے۔ لیکن شروع کے صفحہ پر ایک مختصر عبارت کو جلی قلم سے لکھنا اور پھر مضمون متعلقہ کے بھی بعض جملوں اور عبارتوں کو منتخب کرکے درمیان مقالہ میں الٹی سیدھی سطروں میں نمایاں طور شائع کرنا ایک مذہبی اصلاحی ہفتہ وار کے لئے نامناسب ہے۔ اس سے پروپیگنڈہ" بازی" کی بو آتی ہے اور اسی وجہ سے بعض اخباروں نے اس کو اپنا وطیرہ بنالیا ہے۔

امریکہ کے کالے مسلمان: از ڈاکٹر مشیر الحق تقطیع خورد، ضخامت ۱۰۴ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت دو روپیہ - پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۲۵۔

امریکہ کے کالے مسلمانوں پر وقتاً فوقتاً اردو اخبارات میں مضامین نکلتے رہتے ہیں۔ لیکن اب تک اردو میں اس موضوع پر کوئی مستند اور جامع کتاب نہیں تھی۔ یہ کتاب اس ضرورت کو باحسن وجوہ پورا کرتی ہے۔ لائق مصنف نے کناڈا میں چھ سات برس مقیم رہ کر

ان لوگوں کا قریب سے مطالعہ کیا ہے اور ساتھ ہی اس موضوع پر انگریزی میں جو چند کتابیں لکھی گئی ہیں ان سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس بنا پر یہ کالے مسلمان کون ہیں؟ ان کی کتنی قسمیں ہیں؟ ان میں کیا کیا تحریکیں پیدا ہوئیں؟ ان تحریکوں کے بانی کون تھے؟ ان کا مقصد پروگرام اور ان کی تنظیمات کیا ہیں؟ ان کے عقائد، عوائد رسمیہ اور ان کے معاشرتی آداب کیا ہیں؟ یہ کتاب ان سب امور پر روشنی ڈالتی ہے۔ زبان صاف ستھری اور مورخانہ ہے۔

فضائل علم و مناقب علماء : مرتبہ مولانا صدر الدین عامر انصاری ضخامت ۱۰۴ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ۔

پتہ۔ ادارہ، باب العلوم منزل منزل بستی حضرت نظام الدین اولیا۔ نئی دہلی ۱۳

اسلام میں علم کی جو اہمیت ہے اور جس طرح بار بار حصول علم کی تاکید اور اسی نسبت سے علماء کے فضائل و مناقب کا بیان ہے وہ غالباً اس شد و مد کے ساتھ کسی مذہب میں نہیں ہے۔ عربی میں اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں اور ان کے علاوہ قرآن و حدیث میں بھی یہ ارشادات بکھرے ہوئے ہیں۔ لائق مرتب نے ان سب ماخذ سے عموماً اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ العالی کی تحریروں سے خصوصاً استفادہ کر کے یہ کتاب بڑے سلیقہ سے مرتب کی ہے۔

پہلا باب قرآنی آیات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد کے ابواب میں عنوانِ باب کی مناسبت سے ایک یا دو حدیثیں نقل کرتے ہیں۔ پھر ان کا ترجمہ اور اس کے بعد اس کی تشریح، اس ضمن میں حضرت شیخ الحدیث کے جستہ جستہ واقعات بھی بیان ہوتے گئے ہیں۔ زبان شگفتہ اور انداز بیان موثر و دلنشین ہے۔ ارباب ذوق کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ لیکن علم اور علما سے متعلق ابھی اور چند اہم موضوعات ہیں مثلاً علماء سوء اور علمائے خیر! ان کے باہمی امتیازات، علما کے اوصاف، اور ان کے لئے شرائط و آداب، وغیرہ! امید ہے کہ کتاب کے دوسرے حصہ میں ان مسائل پر گفتگو ہوگی! البتہ ہمارے نزدیک یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ جس علم کے

فضائل و مناقب بیان کئے گئے ہیں اس سے مراد صرف علم دین ہے، جب قرآن مجید کائنات ارض و سما کو اللہ کی آیات کہتا اور ان پر غور و خوض کرنے کی بار بار تاکید کرتا ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ جس علم کے فضائل بیان کئے گئے ہیں اس سے مراد صرف علم دین ہی ہو بہتر تھا کہ لائق مولف ایک باب میں علم کی حقیقت پر بحث کر لیتے، حضرت آدم کو جس علم کی بنیاد پر خلیفۃ رب اور مسجود ملائکہ ہونے کا شرف عطا فرمایا گیا وہ الاسماء کلہا کا علم ہے نہ کہ کوئی خاص ملک علم ہا اس کتاب کے دوسرے حصہ میں ان تمام امور کی وضاحت ہونی چاہیئے۔

تخلیق انسانی کا مقصد: از مولانا حبیب ریحان ندوی تقطیع خورد ضخامت ۲۰۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت تین روپے پچاس پیسے۔

پتہ: دار التصنیف والترجمہ ۱۳۔ مسجد شکور خان روڈ۔ بھوپال۔

یہ کتاب جو چھ ابواب پر منقسم ہے اس میں امم ماضیہ کی شریعت، اس کی تاریخ اور اس کے اغراض و مقاصد پر گفتگو کرنے کے بعد شریعت محمدیہ، اس کے اصول حیات اور اس ضمن میں خلافت اسلامی نظام زندگی میں اس کی اہمیت و ضرورت پر بسط و تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔ خلافت کی بحث میں صحابہ کرام کے اختلافات اور ان کے مشاجرات کا تذکرہ ناگزیر تھا، لائق مصنف نے اس کا سرسری ذکر کر کے اجمالاً خلافت راشدہ کی سرگذشت بیان کی ہے اور پھر وہ اچانک موجودہ زمانہ میں شرعی قوانین کی تنفیذ کی ضرورت و اہمیت کی طرف منتقل ہو گئے ہیں۔ موصوف ایک مدت سے لیبیا میں بحیثیت ایک استاد کے مقیم ہیں۔ لیبیا کی حکومت کے سربراہ کرنل قذافی ایک نہایت مخلص اور راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ ان کا جذبہ ہے کہ صرف ان کے ملک ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں اسلامی اور شرعی قوانین نافذ ہوں۔ اس سلسلہ میں ان کی مساعی کا تذکرہ وقتاً فوقتاً اخبارات میں آتا رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں ابھی پچھلے دنوں لیبیا میں ایک عظیم اسلامی کانفرنس بھی منعقد ہوئی تھی۔ جس میں عرب ملکوں کے مشاہیر علماء [illegible] ہو کر اسلامی قانون کے مختلف مسائل و مباحث پر مقالات پڑھے۔ تقریریں [illegible]

تیار اور خیالات افکار کیا۔ نوجوان مصنف نے کتاب کا آخری حصہ اس کانفرنس کی روئداد کے لیے وقف کر دیا ہے۔ بہر حال کتاب بہت سی مفید معلومات پر مشتمل ہے اور لائق مطالعہ ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر بھی مسرت انگیز ہے کہ موصوف نے لیبیا میں مقیم ہوتے ہوئے اپنے وطن بھوپال میں تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ یہ کتاب اس ادارہ کی پہلی پیش کش ہے۔ ہماری دعا ہے کہ یہ ادارہ ترقی کرے۔ اور اُردو زبان میں اسلامی لٹریچر میں اضافہ کا باعث ہو۔

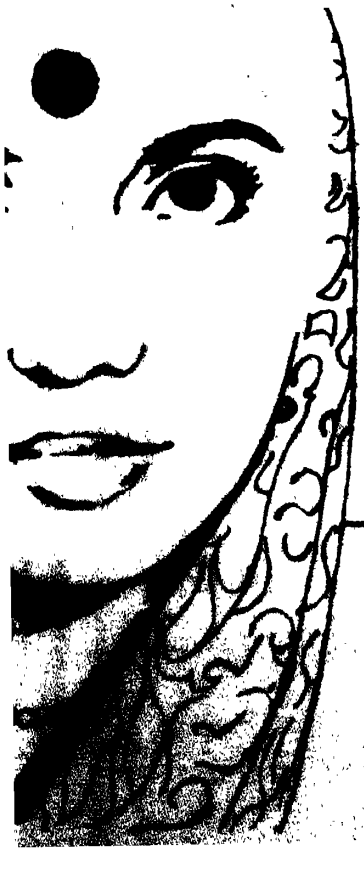
اردو ڈائجسٹ ہما علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر: مرتبہ مولانا عبدالوحید صدیقی۔
تقطیع خورد۔ ضخامت ۲۹۲ صفحات۔ کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت: چار روپے۔
پتہ: اردو ڈائجسٹ ہما۔ جے ۱۷۔ جنگپورہ اکسٹینشن نئی دہلی ۱۴۔

اُردو ڈائجسٹ ہما اُردو زبان کا نہایت مقبول و مشہور ماہنامہ ہے جس نے کم سنی کے باوجود اردو داں طبقہ میں بڑی ہر دلعزیزی حاصل کر لی ہے۔ اس کا یہ خاص نمبر اس کی روایات کے مطابق ہے اس کے نامہ نگار نے یونیورسٹی کے بعض ممتاز لوگوں سے انٹرویو کر کے جو روئداد قلمبند کی ہے۔ اس میں اگرچہ بعض چیزیں تصحیح طلب ہیں۔ تاہم دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کی قدیم و جدید ہیئت اور اس کی تنظیم و ترتیب کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق ٹھوس اور مفید معلومات اعداد و شمار کی روشنی میں تاریخ وار بیان نہ کیے گئے ہوں۔ مضامین اور معلوماتی شذرات اور چارٹ کے علاوہ اوّل تو یوں بھی اس کا کوئی مضمون تصاویر کے بغیر نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ بھی ان سے خالی نہیں ہے لیکن علی گڑھ یونیورسٹی جب کہ ابھی صرف کالج تھی اس زمانہ کے اکابر علی گڑھ کی ایسی نایاب تصویریں بھی ہیں جو غالباً اب نادر ہی کہیں مل سکتی ہیں موجودہ ایکٹ کے سلسلہ میں مخالف اور موافق آرا کا بھی ایک مستقل باب ہے۔ غرض کہ اس میں شبہ نہیں یہ نمبر بڑی محنت اور تلاش و جستجو سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس لیے اس نمبر کی حیثیت تاریخی بھی ہے اور ادبی بھی۔ جن حضرات کو علی گڑھ یونیورسٹی سے دلچسپی ہے ان کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے۔

راجو کب تک اکیلا رہے



راجو دو سال کا تھا،
لیکن چمپا کی ساس کنبہ میں
ایک اور بچہ چاہتی تھی۔ اس کے
سوچنے کا ڈھنگ ہی ایسا تھا۔
لیکن چمپا جانتی ہے کہ
راجو کی صحیح نشو و نما کے لئے یہ
ضروری ہے کہ اسے کم سے کم
ایک اور سال تک پورا لاڈ پیار ملے
اور صحیح دیکھ بھال ہو۔



بچوں کی پیدائش میں
صحیح وقفہ ہونے سے
وہ صحت مند رہتے ہیں۔


بھارت کے
دفاع و ترقی
میں شرکت کیجیے
ساتھ ہی
7 1/4 %
3 سالہ کھاتے ......%
1 سالہ کھاتے ......%
قومی بچت ادارہ
تفاصیل کے لئے اپنے ڈاک گھر یا اپنے ضلع کے قومی بچتوں کے ضلع
آرگنائزر سے پوچھ تاچھ کیجئے۔
davp 72/213

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

ندوۃ المصنفین

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

برہان دہلی

جلد: ۶۹	ماہ ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ مطابق دسمبر ۱۹۷۲ء	شمارہ: ۶

۱۔ نظرات	سعید احمد اکبرآبادی	۳۶۲
مقالات		
۲۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی	" " "	۳۶۵
۳۔ رسول شاہد و مشہود	جناب قاری بشیر الدین صاحب (پنڈت) (ایم۔ اے) نیشنل ایوارڈی (شاہجہاں پور)	۳۸۱
۴۔ الترغیب والترہیب حافظ زکی الدین المنذری	مولوی محمد عبداللہ صاحب دہلوی رفیق ندوۃ المصنفین دہلی	۳۹۰
۵۔ علامہ اقبال اور تاریخ زمان	مولوی شبیر احمد خاں صاحب غوری اجمل خاں طبیہ کالج علیگڈھ	۴۰۸
۶۔ تبصرے	س ع	۴۲۸

نظرات

مسلم پرسنل لا کے موضوع پر جو علماء کرام نہایت محنت و جانفشانی سے داد تحقیق دے رہے ہیں ان میں سے بعض اس میدان میں اتنے آگے چلے گئے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہیں وہ حضرات جو مسلم پرسنل لا میں تغیر و تبدل کے حامی ہیں ان کو ان مضامین میں اپنی تائید کا سامان نہ مل جائے۔ مثلاً ایک مولانا نے تحقیق کی ہے (اور بالکل صحیح کی ہے) کہ (۱) طلاق اسلام میں ابغض المباحات ہے (۲) طلاق اگر بے ضرورت ہو اور بے وجہ ہو تو جمہور علما کے نزدیک مکروہ اور امام صاحب کے نزدیک حرام ہے (۳) میاں اور بیوی میں اگر نزاع ہو تو شوہر فوراً اس کو طلاق نہ دے بلکہ قرآن کے حکم کے مطابق دونوں کی طرف سے ایک شخص حکم ہو اور وہ اصلاح ذات البین کی کوشش کریں۔ اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو اب شوہر کو طلاق دینے کی اجازت ہے (۴) لیکن ان حالات میں بھی طلاق دینے کے لئے چند قیود و حدود ہیں۔ مثلاً یہ کہ شوہر طہر کی حالت میں ایک طلاق دے، اور تمام طلاقیں ایک ہی مرتبہ نہ دے۔

اب مسلم پرسنل میں تغیر و تبدل کا حامی ایک شخص کہتا ہے کہ پاکستان میں جو عائلی قانون بنا ہے تو اس کا حاصل بھی تو یہی ہے کہ معاشرہ میں عام فساد کے پیدا ہو جانے کے باعث طلاق کی اباحت کے حکم کو جس طرح غلط اور شریعت کے منشا کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے اس قانون کے ذریعہ اس کا انسداد کرنا مطلوب ہے۔ اور اگر پاکستان میں یہ

بات صحیح ہے تو کسی دوسرے ملک میں درست کیوں نہیں ہو سکتی" طلاق کے سلسلہ میں تحقیق و تجسس کی یہ مثال ہم نے صرف نمونہ کے طور پر نقل کی ہے ورنہ تعدادِ ازواج وغیرہ دوسرے مسائل کا عالم بھی یہی ہے۔ اب فرمایئے اگر کوئی "متجدد پسند" یہ کہے تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ راقم الحروف نے دارالعلوم دیوبند میں مسلم پرسنل لا پر اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا بھی تھا۔ مسلم پرسنل لا کا معاملہ جو زیر بحث ہے، یہ نہ ہونا چاہیئے کہ اس بارہ میں اسلام کے احکام کیا ہیں؟ ان احکام کی تفصیلات کیا ہیں؟ اس میں فقہاء کے آراء کیا ہیں؟ اور ان کے لئے شرائط و قیود کیا ہیں؟ اور تاریخ اسلام میں ان پر عمل کس کس شکل و صورت میں ہوتا رہا ہے؟ بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ سماج میں اختلال پیدا ہو جانے کے باعث جب شریعت کے بعض سماجی احکام کا استعمال ان کی اصل اسپرٹ اور روح اور شارع علیہ السلام کے منشاء و مقصد کے خلاف عام طور پر کیا جا رہا ہو اور ان کو ہوس پرستوں نے اپنے لیے بچاؤ کا ذریعہ بنا لیا ہو تو اب ان حالات کی اصلاح کا طریقہ کیا ہے؟ کیا اس مقصد کے لئے حکومت سے کوئی قانون بنوانا درست ہے؟ اگر ہے تو کن شرائط کے ساتھ؟ اور اگر نہیں ہے تو ان حالات کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے؟

ہم کو یہ سطور لکھنے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ دارالعلوم دیوبند کے مذکورہ بالا اجتماع کے لئے جن حضرات نے مقالات لکھے تھے ان میں سے بعض نے اپنے مقالات کی اشاعت قبل از وقت کر دی ہے۔ یہ مقالات عوام کے لئے ہرگز نہیں لکھے گئے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ ان مقالات کی روشنی میں دیوبند کے اجتماع میں شریک علماء اصل موضوع بحث پر بحث و تمحیص اور غور و فکر کر سکیں اور پھر بمبئی میں جو عظیم اجتماع

ہونے والا ہے اس میں اپنے فیصلہ کا اعلان کریں ۔

افسوس ہے پچھلے دنوں پروفیسر سید احتشام حسین کا اکسٹھ برس کی عمر میں اچانک حرکتِ قلب کے بند ہو جانے کے باعث الہ آباد میں انتقال ہو گیا۔ موصوف اردو زبان کے نامور استاذ، بلند پایہ ادیب، مصنف اور نقاد تھے۔ اگرچہ انہوں نے لسانیات، تاریخ اور سماجیات پر بھی لکھا ہے لیکن ان کی قلمی تگ و دو کا اصل میدان تنقید تھا۔ اگرچہ وہ ترقی پسند نظریۂ ادب کے حامی اور اس کے علمبردار تھے، لیکن طبیعت میں سنجیدگی تھی اور فکر میں اعتدال و توازن، اس حیثیت سے انہوں نے اردو ادب میں نئی تحریکوں کی رہنمائی کی اور ان کو غلط راستہ پر پڑ جانے سے بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ ان کی تحریر شگفتہ اور رواں ہوتی تھی اور اس میں زبان کے چٹخارہ کے بجائے علمی وقار ہوتا تھا۔ اردو زبان و ادب میں محقق اور تنقید نگار نوجوانوں کی موجودہ نسل کے پیدا کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ اخلاق و عادات کے اعتبار سے بڑے شریف، ہمدرد، متواضع اور سادہ طبیعت انسان تھے، اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت و بخشش کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔

ضروری گزارش

حضرات، ممبرانِ ادارہ اور برہان کے خریداروں سے گزارش ہے کہ ادارہ سے آپ حضرات کو یاددہانی کے جو خطوط ارسال کیے جا رہے ہیں ان پر فوری توجہ فرمائیں۔ نیز خطوط ارسال کرتے وقت یا منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ اور خریداری نمبر کا لکھنا نہ بھولیں جو پتہ کی چٹ پر درج ہوتا ہے۔ تاکہ تعمیلِ ارشاد میں تاخیر نہ ہو۔

نیازمند منیجر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اسلامیان ہند کا تہذیبی ورثہ

(۶)

از:- سعید احمد اکبرآبادی

آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جس چیز کا نام ہے معنوی اور بنیادی اعتبار سے تین چیزیں اس کے عناصر ترکیبی ہیں (۱) تعلیم (۲) تہذیب (۳) سیاسیات۔" سیاسیات پر ہم ایک جامع گفتگو اس وقت کریں گے جب موجودہ ایکٹ ۱۹۷۲ء زیر گفتگو آئے گا۔ اس وقت تذکرہ اس درسگاہ کے تہذیبی کردار اور اس کی روایات کا چل رہا ہے اور چونکہ نواب وقار الملک اس سلسلۂ طلائی کے آخری مگر نہایت اہم کڑی ہیں جنھوں نے کالج کے تہذیبی اور اسلامی کردار کو نکھارا اس کو وسیع کیا اور مستحکم بنایا اور یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہو سکا کہ بقول مولانا حبیب الرحمان خان صاحب شیروانی کے خود نواب صاحب کی شخصیت اور ان کے اسلامی خصائل ملک و ملت کے واسطے کامل رہنما ہیں " اس بنا پر مرحوم کے عہد سکریٹری شپ کا تذکرہ ہم ذرا کسی قدر تفصیل سے کریں گے اور اسی پر کالج کے تہذیبی اور اسلامی کردار کا باب ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد نظام تعلیم پر ایک جامع تبصرہ ہو گا۔

نواب وقار الملک کی شخصیت اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نواب وقار الملک (مولوی حاجی مشتاق حسین صاحب) کی شخصیت بہت غیر معمولی اور عہد آفرین تھی، وہ سر سید

اور نواب محسن الملک کی طرح تعلیم قدیم کی پیداوار تھے۔ لیکن قدرت نے ان کو دل و دماغ کے اُن اعلیٰ اوصاف کمالات سے نوازا تھا کہ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے، ایک بہت معمولی نوکری سے اپنی معاشی زندگی کا آغاز کرنے کے باوصف وہ بڑی تیز رفتاری سے ترقی کرتے چلے گئے، یہاں تک کہ اس زمانہ میں عہدہ و منصب اور قومی و ملی وجاہت کے اعتبار سے ایک مسلمان کے لئے جو سب سے بڑا اعزاز ہو سکتا تھا وہ ان کو حاصل تھا۔ چناں چہ حیدرآباد میں دولتِ آصفیہ کے ریونیو سکریٹری رہے۔ اس سے سبکدوش ہوئے تو علی گڑھ کالج اور آل انڈیا مسلم لیگ کے سکریٹری منتخب ہوئے اور جہاں کہیں رہے اور جو خدمت بھی انھوں نے اپنے ذمہ لی اس کو اس خوبی اور عمدگی سے انجام دیا کہ اس کا حق ادا ہو گیا۔

کالج سے ان کا تعلق | کالج اور تعلیم جدید کے معاملہ میں وہ شروع سے سرسید کے رفیق اور شریک تھے اور چونکہ مذہب کے معاملہ میں وہ سخت کٹر اور متشدد تھے اس بنا پر عام مسلمانوں کی طرف سے سرسید پر جب اعتراضات یا ان کے مذہبی خیالات و افکار کے بارے میں شکوک و شبہات ظاہر کئے جاتے تھے تو ایسے مواقع پر سرسید نواب صاحب کی شخصیت کو ہی اپنے لئے بطور سپر استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سرسید نے تہذیب الاخلاق میں لکھا: "منشی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) کی ذاتی نیکی اور نہایت سخت دینداری، بے ریا عبادت، سچی خدا پرستی، غایت تشدد سے نماز اور روزہ ادا احکام شریعت کی پابندی جو درحقیقت بے مثل ہے، اس لائق تھی کہ اگر ہماری قوم پر خدا کی خفگی نہ ہوتی تو اس سے مسلمانی کو فخر سمجھتے، مگر خدا نے ایسا اپنا غضب ہماری قوم پر نازل کیا ہے۔"

(بحوالہ تذکرۂ محسن ص ۸۰)

سرسید سے غیر معمولی عقیدت و ارادت | ان کو سرسید سے غیر معمولی محبت اور عقیدت و ارادت تھی سرسید کی عظیم شخصیت، اور ان کی مخلصانہ جد وجہد کا دل سے اعتراف اور اس کی قدر کرتے تھے۔ لیکن جب ان کو سرسید کی کسی رائے، یا عمل سے اختلاف ہوتا تھا تو اس کا اظہار بھی

لاگ لپیٹ کے بغیر بڑی صفائی اور جرأت سے کرتے تھے لیکن سچے اور پکے مسلمان ہونے کے باعث وہ "جام وسندان باختن" کے ہنر سے واقف تھے، اختلاف کو ہمیشہ انھوں نے اختلاف کی حد تک رکھا، اس سے متجاوز ہوکر کبھی اسے خلاف نہیں بننے دیا۔ سرسید کو بعض اوقات ان کے اختلاف سے سخت اذیت ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ اسی قسم کے ایک موقع پر جھنجلاکر نواب صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"میں کامل یقین رکھتا ہوں اور پورے ایمان سے کہتا ہوں کہ تم نے غلطی کی۔ قیامت میں خدا کے سامنے کہوں گا کہ اے میرے دادا رسول اللہ! میں نے بغیر کسی غرض دینی و دنیوی کے تیری امت کی بھلائی کی کوشش میں کوئی درجہ باقی نہیں رکھا تھا، جن لوگوں نے اس کو برباد کرنا چاہا منجملہ ان کے ایک یہ نواب انتصار جنگ (وقارالملک) ہیں، آپ کہیں گے: میں نے نہایت نیک نیتی سے کہا تھا، خدا یقینی آپ کو معاف کرے گا۔ گو میری اور میرے دادا کی تشفی نہ ہوگی۔ یا للہ نہ ہوگی۔ تا للہ نہ ہوگی ثم باللہ نہ ہوگی، یہ میری رائے ہے آپ کی نسبت" [1]

لیکن ان پر اس خط کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اپنی رائے پر قائم رہے، ایک اور موقع پر سرسید نے اسی قسم کا خط لکھا تو اس کے جواب میں کس جسارت اور بے باکی سے لکھتے ہیں:۔

---

[1] سرسید کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذات کے سید ہونے کے باعث ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو نسبی تعلق تھا اس پر ان کو نہ صرف فخر تھا بلکہ اکثر اس کا استحضار رہتا تھا۔ چنانچہ اس مکتوب میں بھی یہ بات ہے۔ خطوط کے علاوہ بعض تقریروں میں بھی انہوں نے اس کا اظہار کیا ہے اس کا مقصد تعلی یا بارخوانی ہرگز نہیں بلکہ جس طرح بچہ کو تکلیف ہوتی ہے تو باپ اور ماں کو یاد کرتا ہے، اسی طرح سرسید کو جب کبھی کسی مخالفت کا یا پریشانی کا سامنا ہوتا ہے تو بے ساختہ حضور پر نور یاد آتے ہیں۔ یہ امر حضورؐ کے ساتھ غایت محبت کی اور عشق دلیل ہے۔

"آپ فرماتے ہیں کہ لوگ قوم قوم پکارتے ہیں، قوم کا نام انہوں نے کس سے سیکھا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ آپ ہی سے یہ نام بھی سیکھا ہے اور آپ سے آزادی بھی سیکھی ہے، جو اتفاق وقت سے آپ ہی کے خلاف کام میں لائی جا رہی ہے، اور چونکہ وہ راستبازی سے کام میں لائی جا رہی ہے تو آپ کو خوش ہونا چاہیے۔ یا کم از کم اس کی شکایت تو نہ کرنی چاہیے۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں،

"آپ کی فرمائش یہ ہے کہ ہم حالات سے لاعلم بھی رہو اور بھلانے بھی ... اور جو ہم کہتے ہیں اس کو مان لو یہ تو صرف نبی کا درجہ مذہبی معاملات میں ہے۔ اور آپ جو شرک فی النبوۃ کے ہمیشہ خلاف رہے ہیں۔ خدا کے لئے مجھ کو سمجھائیے کہ یہ شرک فی النبوۃ نہیں ہے تو اور کیا ہے۔"

پھر لکھتے ہیں :-

"خیر آپ جانیں اور آپ کا کام جانے، ہر ایک کو اپنی قبر میں علیحدہ علیحدہ جانا ہے، اگر آج میں آپ کی ناراضی کے خوف سے وہ رائے دیدہ دانستہ کو ملک سمجھتا ہوں وہ قوم کا گناہ ہے تو کل خدا کے سامنے آپ میرے گناہ نہ بخشوائیں گے۔" (وقار حیات ص ۲۵۷)

اس نوع کے متعدد اور مختلف مکتوبات کے اقتباسات صرف اس غرض سے نقل کئے ہیں کہ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید کے رفقاء یوں سب ہی ماشاءاللہ چندے آفتاب چندے ماہتاب تھے، لیکن اس میں بھی نواب وقار الملک کس آن بان اور شان کے تھے۔ اپنی رائے میں اس درجہ متشدد۔ اس کے اظہار میں اس قدر جری اور ... لیکن با ایں ہمہ اپنے قائد اور رئیس جماعت کا یہ ادب و احترام کہ (جیسا کہ ... جا چکا ہے) ایک اعلیٰ دنیوی جاہ و منصب پر فائز ہونے کے بعد بھی ...

کے سامنے اپا گشتا ہوا سر جھکائے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں: سرکار! یہ سر حاضر ہے، جوتے ماریئے، لیکن بندہ کہے گا تو یہی کہ رائے آپ کی غلط تھی" یہ معمولی واقعہ نہیں یہ کیرکٹر، یہ محبت، تعظیم و تکریم اور ساتھ ہی فرض شناسی میں حسن توازن واعتدال! کوئی شبہ نہیں کہ یہ غیر معمولی اخلاقی عظمت اور کیرکٹر کی دلیل ہے۔ ۵ا

۵ا راقم الحروف نے علی گڑھ تحریک اور سرسید کا تھوڑا بہت مطالعہ پہلے بھی کیا تھا۔ چنانچہ اس موضوع پر بیرونی ممالک میں لکچر دیئے ہیں اور بعض سیمناروں میں مقالات پڑھے ہیں۔ لیکن اس مضمون کے سلسلہ میں اب جو مزید مطالعہ کیا اور سرسید کے رفقاء اور ان کے ساتھیوں کے حالات اور کارنامے پڑھے تو ششدر و حیران ہو کر رہ گیا کہ اللہ اکبر! یہ کس سیرت (CALIBRE) کے لوگ تھے۔ اگر نظر کو اور وسیع کیجئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک مسلمانوں کا ایک عظیم دور نشاۃ ثانیہ کا ہے، اس دور میں علماء، مشائخ، جدید تعلیم یافتہ گروہ میں۔ بیرسٹر، وکیل، اساتذہ، ماہرین تعلیم، ارباب سیاست، شعراء، ادباء، اصحاب صحافت و جرنلزم، ارباب صنعت و تجارت، روؤسا و امراء، یہاں تک کہ کھلاڑی اور پہلوان ان میں کوئی ایک طبقہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں بڑے اور بلند پایہ لوگ نہ پیدا ہوئے ہوں۔ یہ سب اپنے پیشوں اور کاموں کے اعتبار سے مختلف تھے۔ لیکن ان میں ایک خاص قسم کی وضعداری۔ مروت و شرافت اور اسلامی اخلاق و کردار کی جھلک پائی جاتی تھی اور اسی لئے سماج میں یہ حضرات الگ سے ممتاز تھے۔ غالباً یہ سب کچھ نتیجہ تھا اس زوال کا جو ۱۸۵۷ء میں اپنے نقطۂ عروج کو پہونچ گیا۔ مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی رحمۃ اللہ علیہ بات چیت میں کبھی کبھی بعض بڑی انتہا پسندانہ باتیں کہہ جاتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا: میاں سعید! میرے نزدیک اکبر الہ آبادی اور اقبال قدرت کی طرف سے مسلمانوں کے لئے اس انحطاط کا بدلہ ہیں جو انہیں ۱۸۵۷ء میں پہونچا، اور در حقیقت یہ دونوں ... الی ہیں کہ اگر قدرت مجھ سے پوچھے کہ تم کیا چاہتے ہو! اپنی حکومت و سلطنت یا اکبر و اقبال ... ۔ بہر حال ضرورت ہے کہ کوئی ادارہ مسلمانوں کے اس عہد نشاۃ ثانیہ کی ... ، وہ اس عہد کی ایک نہایت سبق آموز اور ولولہ انگیز داستان ہوگی۔

حسن انتظام کی تین شرطیں | عام اڈمنسٹریشن اور خصوصاً ایک کالج یا یونیورسٹی کے اعلیٰ منتظم کے اڈمنسٹریشن کے لئے تین شرطیں ضروری ہیں :

(۱) منتظم کا کیرکٹر بے عیب اور بے داغ ہو۔ اس کے ظاہر و باطن اور اس کے قول و فعل میں تضاد اور تباین نہ ہو۔ جس چیز کا مطالبہ وہ دوسروں سے کرے وہ خود اس پر پورا عامل ہو۔

(۲) طلباء کا مکمل طور پر ہمدرد و بہی خواہ ہو۔ ان کو اپنی اولاد سمجھے اور اس لئے ان کے ہر قسم کے دکھ درد میں ان کا شریک اور ان کی فلاح و بہبود کی کوششوں میں سرگرم ہو۔

(۳) اصول و قواعد اور ڈسپلن کا سخت پابند ہو۔ جو معاملہ کبھی پیش آئے اس پر ٹھنڈے دل اور طلبا کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبہ سے غور و خوض کرے اور جب کسی نتیجہ پر پہونچ جائے تو اس پر سختی سے قائم رہے اور کسی دباؤ یا لالچ سے اپنی رائے یا فیصلہ میں تبدیلی نہ کرے۔

اب اس نقطۂ نظر سے غور کیجئے تو ان میں سے وہ کونسی شرط ہے جو بکمال و تمام نواب صاحب میں موجود نہ ہوں جہاں تک ان کے ذہنی اور دماغی کمالات و اوصاف کا تعلق ہے۔ اس کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ شروع میں دس روپے ماہوار کے ملازم ہوئے تھے۔ ترقی کرتے کرتے نظام گورنمنٹ کے ڈپٹی سکریٹری ہوئے اور تین ہزار روپیہ مشاہرہ پایا۔ پھر اس حیثیت سے موصوف نے مالیاتی بندوبست اور اس کے دستور و آئین میں اصلاحات کر کے ریاست کو جو فائدہ پہنچایا اور اس کو ترقی دی۔ خود نظام اور اس زمانہ کے بڑے بڑے انگریز عہدہ داروں نے اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے اب شرائط سہ گانہ کو ملاحظہ فرمایئے :-

صاف ستھری اور پاک زندگی | نواب صاحب کی ضخیم سوانح حیات کا مطالعہ کیجئے صفحات کے صفحات ان کی امانت و دیانت اور تقویٰ و طہارت کی مثالوں سے پر ہیں۔ یہاں مولانا

حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی کی جامع شہادت کا نقل کردینا کافی ہوگا۔ فرماتے ہیں :۔

" قبل اس کے کہ وقارالملک مرحوم سے نیاز حاصل ہو ان کی دیانت و صداقت دل پر نقش ہو چکی تھی، سب سے اول نواب محسن الملک کے ہاں ملاقات ہوئی اور اسی موقع پر نماز مغرب ساتھ ساتھ ادا کی، اس کے بعد نواب صاحب کو بہت کچھ دیکھا۔ سکریٹری شپ کے زمانہ میں۔ تعلیمی اور سیاسی دونوں میدانوں میں ساتھ کام کرنے کی عزت حاصل ہوئی۔ پاس رہنے کا اتفاق ہوا۔ حیدرآباد آکر ان کے متعلق اتنا سنا کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں جتنا دیکھا، جتنا سنا، اسی قدر ان کی دیانت و صداقت کا نقش گہرا ہوتا گیا، یہ اوصاف خاص نتیجہ تھے مذہبی عقیدہ کی پختگی اور فرائض مذہبی کی پابندی کا "

(مقدمہ وقار حیات ص ۲)

آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

" اُن کی (نواب وقارالملک) زندگی کی کل جس طاقت سے چل رہی تھی اور چلتی رہی وہ ان کی مذہبی زندگی تھی، بچپن میں نماز کے گھر میں پابند تھے، بڑے ہوئے تو نماز کے پیچھے انگریزی ملازمت چھوڑ دی، حیدرآباد میں عروج کے دور میں شاہی اسپیشل ان کی نماز کے واسطے روکی گئی، علیٰ ہذا القیاس اس زندگی میں ان کی اولین سعادت یہ تھی کہ ان کے قلب نے قوت کے ساتھ صداقت ایمانی کو جذب کیا، اور یہ انجذاب تہہ تک پہونچا، اسی کا نام ہے قوتِ ایمانی، قوتِ ایمانی کو لازم ہے، پابندی ارکان اسلام، قوت ایمان اور پابندی ارکان کا نتیجہ تھی وہ پُر عظمت زندگی جس کا کارنامہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ (ص ۱۱)

طلبہ کے ساتھ محبت | طلبہ کے ساتھ ان کی محبت اور شفقت کا یہ عالم تھا کہ وقار حیات

کے مصنف کا بیان ہے۔

"نواب صاحب کی ہمیشہ سے یہ خصوصیت تھی کہ وہ طلبا کو نہایت عزیز رکھتے تھے اور ان کی فلاح و بہبودی اور اخلاقی اصلاح کے لئے ہمیشہ مستعد رہتے تھے، طلبا کے ساتھ ان کی مہربانی محض ظاہری طرز عمل تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ دل سے طلباء کی عزت کرتے تھے اور نہایت فراخدلی سے غیر مستطیع طلبا کی مالی اعانت بھی کرتے تھے۔ یہ اعانت عموماً خفیہ ہوتی تھی اور وہ کبھی کسی کے سامنے اس کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ ہم کو بذات خود ایسے متعدد تعلیم یافتہ اصحاب سے واقفیت ہے جنھوں نے نواب صاحب کے وظیفہ سے تعلیم حاصل کی اور معزز عہدوں پر پہونچے"

اس کے بعد لکھتے ہیں:

"نواب صاحب کا زمانۂ سکریٹری شپ اس لحاظ سے بھی یادگار رہیگا کہ انہوں نے وظائف کی مد میں بے دریغ روپیہ خرچ کیا، اور انجمن القرض سے اصرار کر کے دلایا۔ وظائف کا اہتمام بجائے پرنسپل کے انہوں نے خود اپنے ہاتھ میں رکھا، جو صیغۂ راز میں تھا، وہ حتی الامکان یہ کوشش کرتے تھے کہ کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ کون کون طالب علم وظیفہ خوار ہیں"

اس سلسلہ میں ان کا جو ذاتی خیال تھا۔ اسے ایک مرتبہ انھوں نے اس طرح ظاہر کیا۔

"کوئی قوم صرف اپنے دولتمندوں کی اولاد کو تعلیم دینے کے ذریعہ سے ترقی نہیں کر سکتی، یہی ہونہار نوجوان جن کے ماں باپ ان کی تعلیم کے مصارف برداشت نہیں کر سکتے قوم کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی سمجھے جانے کے قابل ہیں، ایسے ہونہار اور شریف نوجوان جو اس وقت افلاس کی مصیبت میں گرفتار ہیں اگر پڑھ لکھ کر کام کے قابل ہو جائیں تو انہی سے قوم ترقی کر سکتی ہے [illegible]

طلبا کی عزت: محبت اور شفقت کے ساتھ طلبا کی عزت کرتے تھے، تاکہ ان میں عزت نفس اور خودداری پیدا ہو۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا بیان ہے: "گو ہم بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔ لیکن ہم کو اور خود اپنے بیٹے کو نواب صاحب مرحوم ہمیشہ "آپ" اور "جناب" کہہ کر خطاب کیا کرتے تھے" نواب محسن الملک کی ایک لغزش پر ناراض ہو کر ایک مرتبہ انہوں نے کہا تھا:۔ "پہلے آپ خود اپنے بچوں کی عزت کیجئے، اس کے بعد دوسروں سے امید کیجئے کہ وہ بھی ان کی عزت کریں گے۔" وہ چاہتے تھے کہ طلبا میں عزتِ نفس اور خودداری پیدا ہو اور ظاہری طور پر بھی وہ ایسے شکستہ حال نہ نظر آئیں کہ اپنا وقار قائم نہ رکھ سکیں، ایک دفعہ کسی شخص نے طنزاً ان کے سامنے کہا کہ بعض ایسے طلبا بھی وظیفہ مانگنے آتے ہیں جو سوٹ بوٹ سے آراستہ ہوتے ہیں، ان کو مدد نہ دیجائے۔ نواب صاحب کو یہ گفتگو ناگوار گذری، فرمایا:۔

"کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ ایسے طالب علم ہمارے سامنے ننگے یا چیتھڑے لگائے ہوئے آئیں۔"

طلبا سے بے تکلف ملاقات: "نواب صاحب کا دروازہ طلبا کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا، کسی وقت روک ٹوک نہ تھی، وہ خواہ کیسے ہی ضروری کام میں مصروف ہوں، اور کیسے ہی ذی رتبہ شخص سے ملاقات کر رہے ہوں، اگر کوئی طالب علم آجاتا تھا تو وہ فوراً اس سے ملاقات کرتے تھے اور بڑے اطمینان اور خوش دلی سے اس کے آنے کی غرض سُنکر، اس کا انتظام کر دیتے تھے، وہ طلبا سے عموماً تخلیہ میں ملاقات کرتے تھے تاکہ طلبا آزادی دبے تکلفی سے اپنی ضرورتیں بیان کر سکیں،...... جب وہ صبح سے دوپہر تک کام کر کے زنانہ مکان میں کھانا کھانے یا کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے جانا چاہتے تھے تو برآمدہ میں آکر چاروں طرف خوب غور سے دیکھ لیا کرتے تھے کہ کوئی طالب علم تو نہیں ہے، اگر کسی کو آتا دیکھتے تو فوراً رک جاتے تھے اور پھر اس طرح اطمینان

وسکون سے اس آنے والے سے گفتگو کرتے تھے کہ گویا کسی کام کے لیے بیٹھا ہو
ہیں۔ (ص ۸۳۲)

طلبا کی مذہبی اور اخلاقی اصلاح | نواب صاحب سکریٹری ہونے سے پہلے ایک مدت تک
سے اکثر تین برس تک طلبا کے بورڈنگ ہاؤس کے نگران اور منتظم بھی رہے تھے، اس زمانہ
میں اور اس کے بعد سکریٹری شپ کے عہد میں ان کی توجہ بڑی سختی اور اہتمام کے ساتھ طلبا کی مذہبی
اور اخلاقی اصلاح پر مرکوز رہی، نماز کا یہ اہتمام تھا کہ وقار حیات کے مصنف لکھتے ہیں
مولوی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) کے زمانۂ نگرانی میں نماز کے معاملہ میں طلبا پر بڑی
سختی ہوتی تھی، ترک نماز ایک ایسا جرم تھا جس کو وہ کبھی معاف نہیں کرتے تھے صاحبزادہ
آفتاب احمد خاں جو اسی زمانہ میں اسکول کے طالب علم تھے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:-

> "جس انہماک اور محنت اور ہمدردی کے ساتھ نواب صاحب مرحوم بورڈنگ ہاؤس کا انتظام اس زمانہ میں کرتے تھے، وہ کبھی فراموش نہیں ہو سکتا، ڈائننگ ہال اور باورچی خانہ کی نگرانی وہ کرتے تھے۔ طلبا کی خواندگی کی دیکھ بھال وہ کرتے تھے، ان کے امتحانات کے نتائج میں دلچسپی وہ لیتے تھے۔ کھیلوں میں وہ شریک ہوتے تھے اور نماز کی پابندی کے لئے جو تنبیہ ان کے زمانہ میں ہوتی تھی وہ کبھی کبھی نہیں ہوئی"

علاوہ ازیں انہوں نے لڑکوں کو تاش کھیلنے، شطرنج کھیلنے اور ڈھول طبلہ بجانے
اور سوانگ رچانے وغیرہ کی ممانعت کر دی تھی کہ ان سے کھیل کود یعنی تفریح اور
ورزش کا فائدہ بھی نہیں ہوتا اور وقت ضائع ہوتا ہے۔ پھر انہوں نے صرف احکام
ذریعہ بند کرنے پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ پوشیدہ طور پر اس کی نگرانی بھی رکھتے تھے
حد یہ ہے جیسا وقار حیات (ص ۸۳۶) میں ہے، چاندنی راتوں میں وہ ہمیشہ از فرق
تا بقدم سفید پوش ہوتے اور اندھیری راتوں میں اس کے برعکس سیاہ پوش، مقصد یہ تھا کہ

وہ شب کی خاموشیوں میں بورڈنگ ہاؤس کا چکر لگائیں تو کوئی طالب علم ان کو دور سے دیکھ کر پہچان نہ سکنے اور لڑکوں کو شرارت کرتے ہوئے عین موقع پر پہونچ کر پکڑ لیں۔ اس سلسلہ میں وقار حیات کے مصنف نے متعدد دلچسپ واقعات نقل کئے ہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ سن لیجئے، کہتے ہیں:

"ایک دفعہ ایک کمرے میں بیٹھے چند لڑکے خفیہ طور پر تاش کھیل رہے تھے۔ کھیلتے کھیلتے کسی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "کہیں سر گھٹا ملا (نواب صاحب) نہ آجائے" دفعتاً دروازہ کھلا اور مولوی مشتاق حسین صاحب پوری متانت اور سنجیدگی سے یہ کہتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ السلام علیکم! بندہ حاضر ہے"

ڈسپلن اس محبت و شفقت اور ان کی اخلاقی اور مذہبی نگرانی میں مستعد رہنے کے ساتھ وہ نظم و ضبط اور قاعدہ و قانون کی پابندی کے معاملہ میں بھی سخت گیر اور متشدد تھے اور لڑکوں کی اسٹرائک یا ہنگامہ آرائی کی پروا نہیں کرتے تھے، نواب محسن الملک کے زمانہ میں جو طلبا نے جو اسٹرائک کی تھی اور اس کی تحقیقات کے لیے جو ایک کمیشن مقرر ہوا تھا نواب وقارالملک بھی اس کے ایک ممبر تھے۔ آپ نے کمیشن کی ایک عام رپورٹ کے علاوہ الگ ایک نوٹ بھی لکھا تھا، اس میں آپ نے تحریر فرمایا:۔

"اس قسم کے حالات کے لحاظ سے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم کو اپنا انتظام کافی احتیاط اور غور کے ساتھ منصفانہ اور صحیح اصولوں پر قائم کرنا چاہیے، اور ہر ایک نقصان کو برداشت کرنے کے واسطے، جو ڈسپلن قائم رکھنے کی غرض سے عائد ہو ہم کو تیار رہنا چاہیے، عام ازیں کہ طلبا کی طرف سے ایسی کوئی دھمکی ہو، یا اسٹاف کی طرف سے۔ میں انتظام کو ضعیف اور کمزور دیکھنے کے بجائے کالج اور بورڈنگ ہاؤس کے کمروں کا خالی دیکھنا مناسب سمجھتا ہوں"

یہ نواب محسن الملک کے سکریٹری شپ کے زمانہ کی بات تھی۔ ان کے بعد جب نواب [illegible]
سکریٹری ہوئے تو ان کے زمانہ میں بھی متعدد مرتبہ ٹرسٹیوں کے بعض فیصلوں پر طلبا نے اظہار
ناراضگی اور احتجاج کیا لیکن نواب صاحب ٹرسٹیوں کے فیصلہ پر قائم رہے اور طلبا سے انھوں نے
صاف کہا کہ ٹرسٹیوں کا فیصلہ حق اور انصاف پر مبنی ہے۔ طلبہ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کی خوشی
یا ناخوشی کے خیال سے اس فیصلہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی، ان معاملات میں طلبا کا دخل
دینا اپنے حدود سے تجاوز کرنا ہے:

ڈسپلن کے معاملہ میں اس درجہ سخت گیر اور متشدد ہونے کے باعث بعض اوقات طلبا
میں بددلی اور بیزاری پیدا ہوتی تھی۔ لیکن چونکہ نواب صاحب طلبا کے ساتھ محبت اور شفقت
کا برتاؤ دل و جان سے کرتے تھے۔ ان کا کیرکٹر بے داغ تھا اور ان کی امانت و دیانت پر
سب کو اعتماد کلی تھا اس بنا پر وقتی اور ہنگامی بددلی اور بیزاری کے باوجود سب طلبا ان سے بڑی
محبت اور دل سے ادب و احترام کرتے تھے۔ چنانچہ جب انھوں نے اپنی ذاتی مجبوریوں کے
باعث سکریٹری شپ سے استعفا دیا تو طلبا بے حد مضطرب اور غمگین ہوئے اور انہوں نے
یونین کلب کے رامپور حامد ہال میں جمع ہو کر ان کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا اور نہایت پرتاثیر الفاظ میں
التجا کی کہ وہ ان سے جدا نہ ہوں: "وقار حیات" کے مصنف لکھتے ہیں: "نواب صاحب اس کارروائی
سے بے حد متاثر ہوئے۔ طلبا کو محبت آمیز جواب دیا۔ اپنی مجبوریاں بیان کیں اور بیش
قیمت نصیحتیں کیں اور طلبا کے دل کو مسخر کر کے رخصت ہو گئے۔"

نواب صاحب کے عہد کی اصلاحات | نواب صاحب کا سکریٹری شپ کا زمانہ اگرچہ کچھ زیادہ
طویل نہیں۔ یعنی کل چار برس اور چند ماہ ہے۔ لیکن اس اعتبار سے بہت اہم اور شاندار ہے کہ
بعض اندرونی اور بیرونی اسباب کے باعث کالج کو جو گھن لگ گیا تھا اور جس نے اندر ہی
اندر خاموش طریقہ پر کالج کے اصل مقصد کی بنیاد کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے
کالج کو نجات ملی۔ اور اس طرح اسے نئی زندگی اور [illegible]

سب سے اہم مسئلہ یورپین اسٹاف کا تھا۔ اس اسٹاف سے کالج کو تعلیمی اعتبار سے خصوصاً اور بعض دوسرے اعتبارات سے عموماً جو فوائد پہونچے نواب صاحب اس کے معترف اور مداح تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ پرنسپل اور اس کے ساتھ دوسرے یورپین اساتذہ نے مطلق العنانی کی جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی اور جس کے باعث کالج کا سکریٹری بے دست و پا ہو کر رہ گیا تھا نواب صاحب اس کے شدید مخالف تھے۔ چنانچہ نواب محسن الملک سے اُن کے اختلاف کی بڑی وجہ پرنسپل اور اسٹاف کے ساتھ نرمی اور اغماض کا برتاؤ ہی تھا۔ چنانچہ نواب صاحب کے تقرر کے کچھ دنوں بعد ہی نواب صاحب اور پرنسپل میں سکریٹری اور پرنسپل کے اختیارات کے معاملہ میں سخت اختلاف شروع ہو گیا اور آخر نتیجہ یہ ہوا کہ پرنسپل اور اس کے ساتھ یورپین اسٹاف سب نے استعفاء دے دیا۔ لیفٹننٹ گورنر ان لوگوں کا پشت پناہ تھا۔ لیکن نواب صاحب کو ہندوستان کے سب مسلمانوں کی تائید حاصل تھی۔ جب نواب صاحب اور پرنسپل کے اختلافات اور لیفٹننٹ گورنر کی موخر الذکر کی حمایت کی خبر ملک میں عام ہوئی تو مسلمانوں میں آگ لگ گئی۔ شہر شہر بڑے بڑے عظیم جلسے ہوئے۔ اخبارات میں نہایت زوردار مضامین لکھے گئے۔ سر آغا خاں، سید امیر علی۔ نواب صاحب ڈھاکہ اور اور میجر سید حسین بلگرامی ایسے نامور اور معزز مسلمانوں نے حکومت اور نواب وقار الملک کے نام ٹیلیگرام بھیجے۔ لندن میں جو مسلمان آباد تھے انھوں نے بھی تین جلسے کئے۔ ان سب کا حاصل نواب صاحب کے موقف کی زبردست حمایت و تائید اور اس معاملہ میں ان کے ساتھ مکمل اشتراک و تعاون کی یقین دہانی تھی۔ اس وقت پورے ملک میں مسلمانوں میں جو ہیجان برپا تھا! اس کی کیا نوعیت اور اس کا کیا مقصد تھا؟ اس کا اندازہ اس زمانہ کے ایک نہایت مشہور اور با اثر اخبار "کشف الاخبار" بمبئی کے ایک مضمون سے حسب ذیل اقتباس سے ہو سکتا ہے: یہ اخبار اپنی اشاعت مورخہ ۲۰ جون ۱۹۰۹ء میں لکھتا ہے:

"علی گڑھ کالج میں اسٹاف اور ٹرسٹیوں کے درمیان جو ناگوار اختلاف پیدا

ہو سکے یہ وہ اگر جلدی سے فیصل نہ ہو گیا تو اس کا نتیجہ نہایت ہی برا ہو گا۔ اصل
بات یہ ہے کہ موجودہ سکریٹری نواب مشتاق حسین صاحب، نواب محسن الملک کی طرح
سے خوشامدی اور چاپلوس نہیں ہیں، وہ اسٹاف کی اطاعت پسند نہیں کرتے اور
اس بارے میں ہم انہیں ہرگز ہرگز مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے، بات یہ ہے کہ
یورپین اسٹاف کا دماغ نواب محسن الملک کی خوشامدوں سے آسمان پر پہنچ گیا
تھا۔ اب مسلمانوں میں خودداری کا مادہ پیدا ہو گیا ہے اور وہ اس بات کو ہرگز ہرگز گوارا
نہیں کر سکتے کہ ہمارے نوکر ہم پر حکمرانی کریں۔ کالج مسلمانوں کا کالج ہے اور وہ
جس طرح چاہیں اس کا کاروبار چلائیں۔"

"امرتسر کے مشہور اخبار وکیل" نے ۱۴۔ جولائی کی اشاعت میں "قومی جہاز خطرہ میں"
کے عنوان سے ایک ولولہ انگیز مضمون سپرد قلم کیا۔ اور اس میں لکھا:۔

۳۰۔ جولائی ۱۹۰۹ء کو (جب کہ ٹرسٹیوں کی لیفٹننٹ گورنر کے ایما پر ایک اسپیشل
میٹنگ ہونے والی تھی) مسلمانوں کی قسمت کے فیصلہ کا دن قرار پایا ہے، جو بالکل
سر پر آگیا ہے۔ اگر مسلمانوں میں زندہ رہنے کی خواہش ہے۔ اگر ان میں غیرت
و حمیت ہے، اگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں ان کی تربیت کے سب
سے بڑے نشانات گورنمنٹ انگلشیہ کے زیر سایہ محفوظ رہیں تو ان کو چاہیے کہ اس
موقع کو ہاتھ سے نہ دیں اور "حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ" کہہ کر کھڑے ہو جائیں۔"

اس کے بعد اخبار مذکور نے مشورہ دیا ہے کہ تمام مسلمانان ہند جا بجا جلسے کر کے
مسلم لیڈر نواب وقار الملک پر کامل اعتماد ظاہر کریں اور ان کی شاندار قومی خدمات ...
کریں، اسی طرح سر آغا خان اور سید امیر علی وغیرہ نے جو تار دیئے ان ...
نے صاف لکھا: ہم بہ زور تائید کرتے ہیں، اس کارروائی کی جو وقار الملک کالج کی ...
قائم رکھنے کے لئے کر رہے ہیں۔ ہم کو ان پر پورا اعتماد ہے۔"

غرض کہ اس طرح کے سینکڑوں خطوط اور تار نواب وقار ملک کو ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے موصول ہوئے، اور سر آغا خاں اور سید امیر علی نے براہ راست لیفٹننٹ گورنر کو بھی مفصل خط لکھا جس میں آنریری سکریٹری (نواب وقارالملک) کے اوصاف دکمالات بیان کرنے کے بعد یہ بھی صاف صاف لکھدیا تھا کہ کالج تمام تر آنریری سکریٹری اور ٹرسٹیوں کے ہاتھ میں رہنا چاہیئے۔

مسلمانانِ ہند نے اس موقع پر علی گڑھ کالج کے ساتھ اپنی غیرمعمولی محبت کا جس جوش وخروش اور ولولہ وعزم کے ساتھ مظاہرہ کیا اس کا اثر یہ ہوا کہ اگرچہ شروع میں لیفٹیننٹ گورنر کا رویہ پرنسپل اور اسٹاف کے حق میں نہایت سخت اور غیرمصالحانہ تھا۔ لیکن مسلمانوں کے اس عام احتجاج اور مطالبات کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہا " آخر پرنسپل اور اس کے ساتھ اسٹاف کے بعض لوگوں کا استعفا منظور کرلیا گیا۔ اگرچہ پرنسپل نے اپنا استعفا واپس لینے کی خواہش تحریراً کی بھی تھی!

وقارِ حیات کے فاضل مصنف نے اس پورے ہنگامے کی روئداد نہایت مبسوط ومفصل دستاویزات وکاغذات کی روشنی میں قلمبند کی ہے جو پڑھنے کے لائق ہے۔ اس نہایت شدید اور انقلاب انگیز بحران میں نواب صاحب نے جو رول ادا کیا ہے، وہ ان کی لیاقت وقابلیت۔ غیرمعمولی فہم وتدبر معاملہ فہمی اور ذہانت اور حیرت انگیز عزم وہمت کا عجیب وغریب شاہکار ہے۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ اگر سید کا نام کالج کے بانی کی حیثیت سے تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہنے کا مستحق ہے تو نواب وقارالملک کا نام نامی اور اسم گرامی اس کالج کو اس کے اساسی مقاصد کے مطابق نہایت مستحکم اور غیرمتزلزل بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے مسلمانانِ ہند کی تعلیم کی تاریخ میں ہمیشہ روشن اور تابناک رہنے کا حقدار ہے۔

اس پوری سرگزشت اور روئداد کو پڑھ کر یہ عبرت بھی ہوتی ہے کہ ایک وہ بھی زمانہ وہ تھا جب کہ ملک میں انگریزوں کی آمرانہ حکومت قائم تھی مسلمان محکوم تھے اور ۱۸۵۷ء میں شکست فاش نے ان کے حوصلے پست کر دیئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے دم خم یہ تھے کہ جب انہوں نے اپنے محبوب علی گڑھ کالج پر آنچ آتے دیکھی تو تلملا اٹھے اور کالج کے سکریٹری اور اس کے ٹرسٹیوں کی مدد کے لئے ایک ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ کو شکست ہوئی اور کالج کا سفینہ اس گرداب بلا سے صحیح سلامت نکل آیا۔ لیکن اس کے برعکس آج ملک آزاد ہے۔ مسلمان بھی آزاد ہیں اور ملک میں ایک جمہوری اور سیکولر حکومت قائم ہے۔ لیکن اس کے باوجود کم ہمتی، ڈر اور خوف اور مصلحت پسندی کا یہ عالم ہے کہ حکومت کی طرف سے یونیورسٹی کے حق میں اچھا برا جو فیصلہ اور جو حکم بھی آئے بہرحال وہ یونیورسٹی کے ارباب اختیار عمائد کے لئے بسر و چشم تسلیم کر لینے کا مستحق ہے، اور کسی میں اس کے خلاف بیزاری کے اظہار کی جرأت نہیں ہے۔ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ

رسولِ شاہد و مشہود

(۴)

(از جناب قاری بشیر الدین صاحب پنڈت۔ ایم۔ اے)

اسی طرح پادری فانڈر اپنی تفسیر انجیل مطبوعہ لندن ۱۸۷۱ء صفحہ ۲۰۱ پر تحریر فرماتے ہیں کہ انجیل یوحنا باب ۱۶ آیۃ ۱۳ میں جو پیشگوئی ہے کہ "میرے بعد سچائی کا روح آئے گا۔ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تم کو غیب کی خبریں دے گا" اس سے یقیناً محمدؐ اور اُن کا قرآن مراد ہے کیوں کہ ہم عیسائی جو اس سے "روح القدس" مراد لیتے ہیں غلط ہے۔ اس لئے کہ روح القدس کو تو ہم خدا مانتے ہیں یا اس کا ایک جزء۔ تو پھر خدا سے کیونکر سنے گا۔ اسی طرح پادری طامس ولیم اپنی تفسیر انجیل ص ۲۵ مطبوعہ لندن ۱۸۸۰ء میں تحریر کرتے ہیں کہ انجیل کی ساری پیشین گوئیاں محمدؐ پر صادق آتی ہیں۔ اور عیسائی جو اس سے مراد "روح القدس" لیتے ہیں تو یہ غلط ہے۔ اس کے بعد پادری صاحب نے غلطی کے اسباب بتائے ہیں۔

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی پیشین گوئی بزبان عبرانی میں آنحضورؐ کو عربی الفاظ احمدؐ سے یاد کیا ہے اور اپنے متبعین کو ہدایت کی ہے کہ وہ اُن کی پیروی کریں۔ قرآن عزیز نے اس کی تصدیق ان الفاظ میں کی ہے:۔

إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ (سورہ صف) یعنی (وہ وقت بھی قابل تذکرہ ہے) جب کہ عیسیٰ ابن مریم نے فرمایا کہ اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں کہ مجھ سے پہلے جو توراۃ آچکی ہے اس کی

تصدیق کرنے والا ہوں اور میرے بعد جو ایک رسول آنے والے ہیں جن کا نام مبارک احمد ہوگا۔
میں اُن کی بشارت دینے والا ہوں (ملاحظہ ہو سورۂ صف آیت ۶)

پیشین گوئی کی مکمل عبارت | جناب مسیحؑ کی پیشین گوئی عید دفسح) اور عہد الفطر سے دو دن پہلے کی ہے کہ جب انھیں یقین ہو گیا کہ اُن کا وقت آگیا ہے اور اُن کو گرفتار کرنے کی تیاریاں ہو چکی ہیں۔ جناب مسیح علیہ السلام کی تبلیغی جد و جہد اور عوام میں بیداری کے آثار پیدا ہوتے دیکھ کر یہود کے سرداروں، فقیہوں، فریسیوں اور کاہنوں کو حسد پیدا ہوا اور انھیں اپنے لئے سخت خطرہ نظر آنے لگا۔ چنانچہ سازش کی گئی کہ بادشاہ وقت کو مشتعل کر کے حضرت مسیحؑ کو دار پر چڑھا دیا جائے۔
اس زمانہ میں یہود کا بادشاہ جو اپنے باپ دادا کی مملکت میں سے صرف ⅟۴ کا مالک تھا شہنشاہ روم کے زیر اثر اور باجگزار تھا۔ اس کا گورنر پلاطیس دراصل یہود کے بادشاہ کا افسر اعلیٰ تھا اور وہی دراصل یہود کی بچی کھچی مملکت کا بادشاہ تھا۔ یہ بت پرست تھا۔ سازشی یہود اس کے دربار میں پہنچے اور اسے ہر طرح سے سمجھایا کہ یہ (مسیحؑ) عوام کو شعبدے دکھا کر گرویدہ بنا رہا ہے اور اور ان کو بددین بنانے میں منہمک ہے، چاہتا ہے کہ قیصر روم کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے اس کی اس کی سرکوبی ضروری ہے۔ ابھی یہ فتنہ ابتدائی منزل میں ہے دبایا جا سکتا ہے ورنہ پھر بڑی مشکل کا سامنا ہوگا۔ پلاطیس نے اجازت دیدی۔ گرفتار کر کے قتل کر دینے کی سازش کا جال انجیل یوحنا میں درج ہے۔ (ملاحظہ ہو یوحنا باب ۱۱۔ آیات ۴۷ تا ۵۱)
یہ موقع بہت نازک تھا۔ وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو جمع کر کے بہت سی نصیحتیں کیں۔ اُن سے کہا "اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے اور میں اپنے باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا۔ کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں لیکن مددگار یعنی روح القدس (یعنی احمد یا فارقلیط) جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد

۔۔۔ےگا۔۔۔۔۔اوراب میں نے تم سے اس کے (فارقلیط کے) ہونے سے پہلے کہدیا ہے
یعنی پیشین گوئی کردی ہے) تاکہ جب ہو جائے (احمدؐ مبعوث ہوں) تو تم یقین کرو۔ اس کے
بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیوں کہ دنیا کا سردار (احمد) آتا ہے اور مجھ میں
اس کا کچھ نہیں (یعنی دنیا جس نبی موعود کی ابتک منتظر چلی آتی ہے وہ میں نہیں ہوں بلکہ
وہ احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں)" (یوحنا باب ۱۴ آیۃ ۱۶-۲۵، ۲۶-۳۰)
حواریوں کو تسلی دیتے ہوئے اس پیشین گوئی کی مزید وضاحت فرمائی " میں تم سے
سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار
(فارقلیط یا احمد) تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اُسے تمہارے پاس بھیج
دوں گا۔۔۔۔۔ جب وہ یعنی روحِ حق (احمد یا فارقلیط) آئے گا تو تم کو تمام سچائی
کی راہ دکھلائے گا اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور
تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا" (یوحنا باب ۱۶- آیات ۷-۱۲-۱۳)
المختصر توریت و انجیل نیز دیگر صحائف انبیاءِ کرام کی یہ ہیں وہ تحریری شہادتیں
آنحضورؐ کے متعلق جو روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ ان کو علماءِ یہود و نصاریٰ اچھی طرح
جانتے تھے یہی وجہ ہے کہ اہلِ مکہ نے ایک مرتبہ جب یہودِ مدینہ کے پاس اپنے معتمدین
کو یہ دریافت کرنے کے لئے بھیجا کہ کیا نبی آخرالزماں سید کائنات محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کی نسبت ان کی کتابوں میں کوئی خبر ہے؟ اس کا جواب علماءِ یہود نے یہ دیا کہ یہی ان کا
زمانہ ہے اور ان کی نعت وصفت توریت میں موجود ہے۔ علماءِ یہود میں سے حضرت
عبداللہ بن سلامؓ، بن یامینؓ، ثعلبہؓ، اسدؓ، اور اسیدؓ جنھوں نے تعصب کو بالائے طاق
رکھ کے توریت میں آنحضورؐ کے اوصاف پڑھے تھے ایمان لے آئے۔ اسی طرح بحیرہ
راہب نے آپ کو حضرت ابوطالب کے ساتھ تجارتی سفر میں جب کہ سن شریف
۔۔۔۔۔ کا تھا دیکھ کر پہچان لیا تھا اور ابوطالب کو ہدایت کی تھی کہ اس بچہ کو

یہود نصاریٰ سے محفوظ رکھنا وہ اس کے دشمن ہیں [illegible]
مال تجارت سے کر حبش گئے تو وہاں نسطورا راہب نے [illegible]
[illegible] دیکھ کر کہا یہاں ایک فارقلیط جس کی خبر عیسیٰ علیہ السلام نے دی ہے [illegible] آپ سے
بھی دو سال پیشتر بغرض تجارت آپ نے ملک شام کا سفر کیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ جو
آپ سے عمر میں دو سال چھوٹے ہیں وہ بھی اس سفر میں ساتھ تھے۔ راستہ میں ایک
منزل پر ٹھہرے وہاں ایک بیری کا درخت تھا۔ حضور سید عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام
اس کے سایہ میں تشریف فرما ہوئے۔ قریب ہی ایک راہب رہتا تھا حضرت صدیقؓ
اس کے پاس چلے گئے۔ راہب نے آپ سے پوچھا یہ کون صاحب ہیں جو اس بیری کے
سایہ میں جلوہ فرما ہیں۔ حضرت صدیقؓ نے بتایا کہ یہ محمدؐ بن عبداللہ ہیں۔ راہب نے کہا
خدا کی قسم یہ نبی ہیں (حالانکہ اعلان نبوت میں ابھی ۲۰ سال باقی تھے۔ اس بیری کے سایہ
میں حضرت عیسیٰؑ کے بعد سے آج تک ان کے سوا اور کوئی نہیں بیٹھا۔ یہی نبی آخرالزماں ہیں
راہب کی یہ بات حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دل میں اثر کر گئی اور نبوت کا یقین آپ کے دل میں
جم گیا۔ ہر وقت سفر و حضر میں آپ کے ساتھ رہنے لگے جب ۲۰ سال گذرنے کے بعد آنحضرتؐ
کو اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا تو مَردوں میں سب سے پہلے آپ ہی ایمان
لائے۔ (کنزالایمان ص ۴۴۹ و ص ۵۹۹)

گذشتہ صفحات میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس پر اگر آپ سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں گے
تو اس ناچیز کے معروضہ پر ہمنوائی کے لئے مجبور ہوں گے کہ انبیاء عالم میں محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کا وجود اقدس ایک ایسا کعبۂ مقصود ہے جس کی نسبت دنیا کے ہر ایک عظیم الشان
نبی نے بشارت دی ہے اور اپنی اپنی امتوں کو اس رحمۃ اللعالمین کے زیر سایہ جمع ہونے
کی تلقین کی ہے۔ مذاہب عالم میں سینکڑوں اختلافات ہوا کریں لیکن جس امر پر
سب کے سب متفق ہیں وہ جناب حنوک (ادریسؑ) کا دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ

آنے والا خداوند ہے۔ وہ ایک عالمگیر طغیان بدی کے وقت حسب بشارت جناب نوح ؑ نجات کا کشتیبان ہے۔ وہی حضرت موسیٰ ؑ کا مثیل، جناب داؤد کا محبوب، حضرت سلیمان ؑ کا محمدیم اور جناب مسیح ؑ کا فارقلیط ہے۔ اس طرح سب مذاہب کا آخری محبوب اور کعبۂ مقصود ایک اور صرف ایک ہے اور وہ ہے ذات گرامی سید الاولین و الآخرین سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

گو میری اور رقیب کی راہیں تھیں مختلف
لیکن ہم ایک منزلِ جاناں پہ جا ملے

انبیاء کرام میں سے کچھ شاہدانِ عظام کی پیشین گوئیاں سرکار دو عالم آنحضور ؐ کے متعلق پیش کی جا چکی ہیں۔ توریت و انجیل میں سامی النسل پیغمبروں کا ذکر ہے۔ اب جو بشارتیں آپ ملاحظہ فرمائیں گے وہ آریائی نسل کے دانشور نیز رشیوں منیوں کی ہیں۔ بشارتوں میں نہایت واضح اور کھلی ہوئی نشانیاں موجود ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہیں لیکن سامی النسل پیغمبروں کی طرح بشارت دینے والے ان آریائی نسل کے بزرگوں کا نام پاکر شاید آپ کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ بنی نوع انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے نبی و رسول تو ہر قوم میں اور دنیا کے ہر ملک میں آئے پھر آخر کیا وجہ ہے کہ قرآن عزیز نے ذکر صرف انھیں انبیاء کرام کا کیا جو آنحضور ؐ کی جائے بعثت کے قریب اور پڑوس مقامات میں ہوئے۔ دور دراز ممالک میں بھی تو قومیں آباد تھیں۔ کیا اللہ کو ان کی اصلاح کے لئے کسی نبی یا رسول کو بھیجنے کی ضرورت نہ تھی جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ بت پرستی اور شرک میں ملوث ایرانی، جاپانی، چینی، ہندی وغیرہ بہت سی قومیں رہیں۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے اس بنیادی حقیقت کو ملحوظ رکھئے کہ قرآن عزیز دوسری آسمانی کتابوں کے مقابلہ میں دو حیثیتوں سے منفرد ہے۔ ایک تو اس اعتبار سے کہ وہ آفاقی و عالمی صحیفۂ ہدایت ہے، دنیا کے ہر ملک و اقلیم کے لئے اور ہر زمانہ کے لئے۔ دوسری اس کی شانِ انفرادی یہ ہے کہ اس کی مخاطبِ اوّل براہِ راست

ملک عرب کی ایک قوم تھی جس کی ایک مخصوص ذہنیت، ثقافت و معاشرت اور فکری وسیاسی حالت تھی اسی قوم کے ذریعہ صحیفۂ ہدایت کو عام کرنا تھا۔ اس لئے تخاطب میں ان کی ذہنی استعداد کا لحاظ رکھنا ضروری تھا۔ اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا اس لئے کہ حکیمانہ کلام وہ ہے جس کے علوم و معارف متکلم نہیں بلکہ مخاطب کے معیار اور ذہن کے مطابق ہوں۔ قرآن حکیم سے بڑھ کر اس حکیمانہ اصول پر اور کون عمل کر سکتا تھا۔ چنانچہ قوم عرب کے مسلمات عقل و نقل کے برخلاف اگر حکایات و امثال میں ذکر بھیم و ارجن یا رستم و اسفندیار یا روم و یونان کے مشاہیر کا کیا جاتا تو یہ سراسر خلافِ حکمت و مصلحت ہوتا۔ یا اگر گردشِ ارض و آفتاب کے ضمن میں تذکرہ نیوٹن و آئنسٹائن کے زمانہ کے نظریات و تحقیقات کا چھیڑ دیا جاتا یا تاریخ و جغرافیہ یا عام علوم و فنون کے سلسلہ میں کوئی بات ایسی پیش کی جاتی جو ان کی فہم و استعداد سے بالاتر ہوتی تو خواہ مخواہ منکرین توحید و رسالت اور آخرت کے لئے ایک اور وسیع میدان انکار و تکذیب کے لئے ہاتھ آجاتا اور ان کی اصلاح کبھی نہ ہو سکتی اس لئے قرآن عزیز نے انتہائی حکیمانہ طریقہ یہ اختیار کیا کہ اس نے ساری فروعی و ثانوی بحثوں کی تصریح تو ایکبارگی مذاقِ عرب کے خلاف نہیں کی اور اہلِ عرب کے علمی، عقلی، فکری مزعومات کو ان کے حال پر چھوڑے رکھا لیکن اشارے ایسے برابر رکھ دیئے اور کلام میں اتنی لچک پیدا کر دی کہ آنے والی نسلیں اپنے دور کے ماحول فکری کے مطابق کتابِ الٰہی کی تعبیر و تشریح میں آزاد رہیں۔

بہرحال قرآن عزیز کی براہ راست مخاطب تھی قوم عرب۔ اس کے باہر کا ذکر اگر کہیں بہ تصریح نام چھیڑا جاتا تو آخر ختم کہاں پر ہوتا؟ کس ملک کا ذکر کیا جاتا اور کس کو چھوڑا جاتا مگر ہندوستان کو لیا جاتا تو ایران کو کس قاعدہ سے ترک کیا جاتا؟ اگر چین کا نام آ جاتا تو جاپان نے کیا قصور کیا تھا؟ غرضیکہ اس طرح فہرست کو کرۂ ارض کے ایک ایک ملک اور ایک ایک صوبہ و ریاست تک دراز سے دراز تر کرنا پڑتا اس لئے ذکر صرف انھیں کا کیا گیا جس سے عرب مانوس تھے ان کی اصلاح کے لئے "وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ" کہا تو

ایسی نہیں کہ جس میں خدا کی طرف سے کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو"

یہ کہکر انھیں بتایا کہ تمہاری قوم منفرد نہیں ہے۔ دُنیا کی ہر قوم میں اللہ کے برگزیدہ بندے رشد و ہدایت کے لئے بھیجے گئے ہیں خواہ ایک لاکھ چوبیس ہزار ہوں یا اس سے بھی کم یا زائد اور مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۝ ان میں سے بعض نبیوں کا نام لے کر ان کا ذکر تمہیں سُنا دیا ہے اور بعض کا نام لے کر ذکر نہیں سنایا لیکن معلوم و غیر معلوم" ایمان تم کو سبھی پر لانا ہے لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ ۝ یعنی نبیوں میں سے کسی نبی کے درمیان فرق نہ کرو۔ سب کی تعظیم و تکریم کرنا تم پر فرض ہے۔ یہ بتا کر انھیں دعوتِ غور و فکر دی گئی کہ توریت و زبور و انجیل کتب مقدسہ کے علاوہ کہ جن سے تم واقف ہو دوسری اقوامِ عالم کے صحائف پر بھی غور کرو اگرچہ تم ان سے نامانوس ہو کچھ تو اس لئے کہ ان کی تاریخی حیثیت مبہم ہے اور کچھ اس لئے کہ براہ راست وہ تم سے متعلق نہیں لیکن ان میں بھی اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اُن پیشین گوئیوں کو محفوظ رکھا ہے کہ جن میں آنحضور کے مبعوث ہونے کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ آئیے ان آریائی کتب مقدسہ کی پیشین گوئیوں پر غور کریں:۔

پارسی مذہب کی کتابیں زرتشتی مذہب جسے عوام پارسی مذہب کے نام سے جانتے ہیں ایران کا قدیم مذہب ہے اسی کو آتش پرست یا مجوسی دین بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی مذہبی کتب ژندکی پہلوی زبان میں ہیں اور کچھ لٹریچر میخی خط میں بھی محفوظ ہے۔ پہلوی رسم الخط فارسی سے ملتا جلتا ہے لیکن ژندی و میخی دونوں خط اس سے مختلف ہیں۔ قدیم ایرانیوں کی مذہبی کتب میں دو دفتر اہم ہیں ایک دساتیر اور دوسرا ژند اوستا (کاوستا) ان کے بھی خورد و کلاں کے عنوان سے دو دو حصے ہیں۔ ان کتابوں کی صحیح تعداد اور زمانہ نزول کے متعلق اسقدر اختلافات ہیں کہ قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ زرتشتی مذہب کے ہائی پریسٹ مانک نصروانجی پی۔ ایچ ڈی دھالا شری تھیسالاجی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: "زرتشت نے جس زبان میں اپنے

گیتوں کو ترتیب دیا وہ جلد ہی دنیا سے نابود ہو گئی۔ اس کے بعد اوستا کا رواج ہوا جو پارتھینس کے آخری دنوں تک جاری رہی۔ اس کے بعد پہلوی زبان اوستا پر غالب آگئی۔ پہلوی زبان کا دور آٹھ صدیوں تک قائم رہا۔ پس جیسے پارسی خود ایک تباہ شدہ قوم کے کھنڈرات ہیں اسی طرح ان کی مقدس کتابیں ایک برباد شدہ مذہب کے خرابے ہیں۔" (بحوالہ میثاق النبیین ص ۲۹)

ایران کی مذہبی و سیاسی کیفیت قبل مسیح | توریت نیز بعض آثار قدیمہ کی روشنی میں اتنا پتہ چلتا ہے کہ جس زمانہ میں بخت نصر نے بیت المقدس کو خاکستر کر کے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنایا اسی زمانہ میں پارس کے اندر بھی سیاسی و مذہبی حالات کروٹ بدل رہے تھے۔ پچھلے صفحات میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ ۶۱۲ ق م نینوی کی آشوری حکومت برزوال آیا اور بابل کا عروج ہوا۔ ۵۵۹ ق م میڈیا اور جنوبی پارس کی متحدہ حکومت بنی اور اس کے بادشاہ خورس نے بابل سے آزادی حاصل کی یہ سب کچھ بابل کے سفاک وظالم بادشاہ بخت نصر کے مرنے کے بعد ہوا۔ اس کے تخت کا مالک نابونی دس تسلیم کیا گیا اس نے حکومت کا تمام بار وزیر اعظم بیلشازار پر ڈالدیا جو بڑا عیاش اور ظالم تھا حضرت دانیال اس کے مشیر تھے انھوں نے بہت کچھ سمجھایا بجھایا آخر میں کنارہ کش ہو گئے۔ تورات کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ بیلشازار نے اپنی ملکہ کے اکسانے پر حکم دیا کہ بیت المقدس سے لائے ہوئے مقدس ظروف میں شراب پلائی جائے۔ چنانچہ دوران جشن جب شراب کا دور چل رہا تھا ایک غیبی ہاتھ نمودار ہوا اور دیوار پر لکھ دیا "منے منے تقیل اوفرسین" بحوالہ دانیال کا صحیفہ باب ۵ آیات ۵ تا ۲۵) نوشتہ کا مطلب یہ ہے کہ "خدا نے تیری مملکت کا حساب کیا اور اسے تمام کر ڈالا۔ تو ترازو میں تولا گیا اور کم نکلا۔ تیری حکومت پارہ پارہ ہوئی اور فارسیوں کو دیدی گئی۔ چناں چہ خورس نے لیڈیا (ایشیائے کوچک) اور کرمان وغیرہ کی مہمات سے فارغ ہونے کے بعد بابل کا رخ کیا

اور وہاں کے گورنر گوب ریاس کی مدد سے شہر کو فتح کر لیا۔ بیلشازار مارا گیا۔
صحیفۂ عزرا باب ۱ آیات ۱تا ۸ سے پتہ چلتا ہے کہ خورس ایران کے مروجہ مذہب کے خلاف توحید الٰہی کا داعی تھا۔ اس کے جانشین دارا اوّل نے اپنے زمانۂ حکومت میں ایک اہم تاریخی کام یہ کیا ہے کہ چٹانوں پر کتبے نقش کرا دیئے ہیں جو اس کے اور خورس کے عہد زریں کو روشنی میں لاتے ہیں۔ ان میں سے ایک کتبہ شہر اصطخر میں دریافت ہوا ہے۔ یہ بہت مفصل کتبہ ہے اس میں دارا نے اپنی مملکت کے صوبوں کے نام تک گنا دیئے ہیں۔ اسی کتبہ میں دارا کے مذہبی عقیدہ کا ذکر ہے۔ اور وہ یہ ہے:
"خدائے برتر اہورمزدہ ہے۔ اسی نے زمین و آسمان بنائے۔ اسی نے انسان کی سعادت بنائی ..... میں اہورمزدہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے میرے خاندان کو اور ان تمام ملکوں کو محفوظ رکھے جو اس نے اپنے فضل و کرم سے مجھے دئے ..... اے انسان! اہورمزدہ کا تیرے لئے حکم ہے کہ بُرائی کا دھیان نہ کر۔ صراطِ مستقیم کو نہ چھوڑ گناہ سے بچ۔"
اصطخر کے کتبہ سے زائد اہمیت "کتبہ بے ستون" کو حاصل ہے جس میں ایک مجوسی باغی "گوماتہ کوموگوش" کے مقابلہ میں کامیابی حاصل ہونے کو اہورمزدہ کے فضل کی جانب منسوب کیا ہے۔ ہیرو ڈوٹس نے بھی مجوسیوں کی بغاوت کا ذکر کیا ہے۔ خورس اور دارا کے مومن ہونے اور قدیم مذہب موگوش (موجوس) سے بیزاری کا ثبوت وہ تبلیغی اعلان ہے جو اس نے دانیال کے دشمنوں کے خلاف اس وقت شائع کیا جب کہ دشمنوں نے انھیں شیر ببر کے ڈال دیا تھا اور وہ معجزانہ طور پر بچ گئے تھے۔ اعلان کے الفاظ پر غور کیجئے" میں یہ حکم دیتا ہوں کہ میری مملکت کے ہر ایک صوبہ کے لوگ دانی ایل (دانیال) کے خدا کے آگے ترساں و لرزاں ہوں کیونکہ وہی زندہ خدا ہے جو ہمیشہ قائم ہے۔ اس کی سلطنت لازوال ہے ...... اسی نے دانی ایل کو شیر کے چنگل سے چھڑایا" (دانیال کی کتاب باب

۱۹ آیات ۲۵-۲۸)

ایران کا قدیم مذہب اور حضرت زرتشت (زردشت) وسط ایشیاء کے آرین قبائل کا مذہبی تخیل بنیادی طور پر مشترک رہا ہے۔ یہ سب مظاہر پرست تھے۔ سورج، چاند، آگ، ہوا پانی وغیرہ ان کے دیوتا تھے۔ ایران اور ہندوستان کے عوام الناس کے تخیل میں بس اتنا فرق ہے کہ ہندی دیوتا خیر و شر دونوں کے مالک ہیں لیکن ایران میں خیر کا الگ اور شر کا الگ۔ اس مذہب کے معتقد مجوسی کہلاتے تھے۔ تقریباً ۶۶۰ ق۔م اور ۵۸۳ ق۔م کے درمیان تفقاز اور آذربائیجان کے اس نواح میں جو وادی ارس کہلاتی ہے ایک ملہم من اللہ ہستی کا ظہور ہوا۔ یہ حضرت ابراہیم زردشت کی شخصیت تھی انھوں نے مجوسیوں کو دین الٰہی کی تعلیم دی۔ مورخین کا خیال ہے کہ وہ حضرت یرمیاہؑ اور حضرت دانیالؑ کے شاگرد تھے۔ ان پر نازل شدہ الہامی کتاب "اوستا" اگرچہ اب محرف ہو چکی ہے تاہم اس میں اب بھی ایسے مضامین ہیں جو "دینِ حق" کے مؤید ہیں اور الہامی کتب کی طرح اس میں بھی آنحضورؐ کے متعلق پیشگوئیاں موجود ہیں۔ ژند اوستا کا پہلا حصہ وندیداد اور دوسرا یشت کہلاتا ہے۔

بہرحال توریت کے بیانات کو پیش نظر رکھ کر جو بیت المقدس کی ازسرِنو تعمیر سے متعلق ہیں نیز سنگی کتبات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خورس، کیقباد، دارا اوّل کا مذہب مجوسی مذہب کے خلاف "دینِ حق" کا مذہب تھا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایران زردشت کی تعلیم کو زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکا۔ سکندر مقدونی کے حملہ کے بعد یونان کے خارجی اثرات اور قدیم مجوسی مذہب کے داخلی اثرات نے زرتشتی (زردشتی) مذہب کو بگاڑ دیا۔ سکندر مقدونی کے حملہ سے اصطخر میں زرتشت کا مقدس صحیفہ اوستا (کاوستا) آگ کی نذر ہو گیا پھر تقریباً پانچ سو سال کے بعد ساسانی حکومت کے بانی اردشیر بابکان نے "اوستا" کو ازسرِنو مرتب کرایا۔ مسلمانوں نے خیر القرون میں جب ایران کو فتح کیا تو وہاں کا مذہب مجوسی، زردشتی اور یونانی مذاہب کا معجونِ مرکب تھا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو قصص القرآن جلد سوم مصنفہ

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاردی مرحوم)

پھر بھی اس میں کچھ ایسی ٹھوس حقیقتیں جو دین الٰہی کے سرچشمہ سے نکلی ہوتی ہیں۔ جنھیں دیکھ کر صحابہؓ کرام نے جب ایران کو فتح کیا تو ایرانیوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اہلِ کتاب کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ ان کی اس حالت کو دیکھ کر کہ " ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے کہ جس نے آگ جلائی اور جب آگ نے اپنے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے اس کے نور کو سلب کر لیا اور اس کو سخت تاریکی میں نابینا چھوڑ دیا"(سورۂ بقرہ: ۱۷) جب اسلام کو پیش کیا تو انھوں نے اسے قبول کر لیا معاندین یہ سمجھے کہ ان میں اسلام بزورِ شمشیر پھیلا جیمس ڈارمیسٹر نے ژند اوستا کے ترجمہ کی تمہید میں کیا خوب لکھا ہے۔

WHEN ISLAM ASSIMILATED THE ZOROASTRIANS TO THE PEOPLE OF THE BOOK IT EVINCED A RARE HISTORICAL SESE AND SOLVED THE HISTORICAL PROBLEM OF THE ORIGIN OF THE AVESTHA.

"یعنی جب اسلام نے زرتشتیوں کو اہل کتاب میں شامل کر لیا تو اس نے ایک بےنظیر تاریخی نکتہ کو آشکارا کر دیا اور اوستا کی حیثیت کے معمہ کو حل کر دیا"۔ بحوالہ میثاق النبیین ص۳۵)۔ معاندین اسلام نے جان بوجھ کر اس نکتہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

قابلِ غور نکتہ | بعض کوتہ اندیش طبائع جب دو مختلف مذہبی کتابوں کی تعلیم میں کچھ مطابقت دیکھتے ہیں تو وہ غلطی سے یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ بعد کی کتاب نے اپنے ماسبق صحیفہ سے اس تعلیم کو نقل کر لیا ہے۔ وہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ وہ خدا جس نے ایک نبی کو شمعِ ہدایت دی (جس کو خود اس نبی نے اور اس کی قوم نے اپنے تک محدود رکھنے کی کوشش کی) وہ اس صداقت کے نور کو دوسرے نبی پر بھی ظاہر کر سکتا ہے۔ وہ رب المشارق والمغارب ہے اس کی رُوحانی روشنی اور تعلیم کبھی کسی ملک اور قوم تک محدود نہیں بلکہ اختلاف اوقاتِ زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ روشنی کبھی برابر چلتی رہی ہے مسلم قوم کے علاوہ ہر قوم

نے غلطی سے اپنا ایک مشرق قرار دے لیا ہے اور یہ سمجھتی ہے کہ صرف اس بھارت [illegible]
کی روشنی پھوٹی ہے حالانکہ ایک عقلمند انسان جسے زمین کی گولائی کا علم ہے وہ جانتا
ہے کہ مشرق ایک نہیں ہے بلکہ زمین کے اوپر فضاء کا ہر نقطہ جہاں آفتاب نمایاں ہوتا
ہے ایک قوم کے لئے مشرق ہے تو دوسری قوم کے لئے وہی مغرب ہے اس لیے اقتباس
نور کے لئے اسلام کو کسی قوم و مذہب کی ضرورت نہیں پس قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ اگر
قرآن پاک صحائف سابقہ کی تصدیق کرتا ہے تو وہ بھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق
کرتے ہیں لہٰذا کسی نے کسی سے کچھ نہیں لیا اور نہ اس کی ضرورت تھی اس لیے کہ
بہر صورت ان سب کا علم حقیقی تو صرف ایک اور ایک ہی عالم الغیب ہے۔ غرضیکہ
قرآنِ پاک میں ہدایت کی جو روشنی ہے وہ کسی سے عاریتاً لی ہوئی نہیں ہے اور وہ جو کتب
سابقہ کی تصدیق کرکے اقوام عالم کو ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دیتا ہے تو وہ صحیح ہے۔

زرتشتی مذہب سے مماثلت :- (بحوالہ المیثاق النبیین ص۲۲ تا ص۲۶)

زرتشتی مذہب کی تعلیم	اسلام کی تعلیم
(۱) زرتشت کا کہنا ہے کہ خدا ایک اور صرف ایک ہے (نامہ مشت وخشور دساتیر ص۶۹ مطبوعہ بمبئی)	اللہ احد
(۲) " " " او ہمتا ندارد " " "	لم یکن لہ کفواً احد
(۳) " " " ہیچ چیز با و نماند " " "	لیس کمثلہ شیٔ
(۴) دساتیر میں ہے۔ ہستی دہ ہمہ روح و مادہ (دساتیر ص۳)	خالق کل شیٔ ہر چیز کا وہ خالق ہے
(۵) " " " ہر چہ پنداری ازاں برتر است (" ۶۹)	وَلَہُ الْمَثَلُ الْاَعْلیٰ اس کی ہر صفت برتر و اعلیٰ ہے
(۶) " " " ناامید از مہربانی و بخشندگی او مشوید (" ۳۳)	لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَۃِ اللہ اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو
(۷) زرتشت نے فرمایا " من نزدیک تر ترا از توام (" ۱۲۲)	نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔
(۸) ملائکہ کے متعلق فرمایا " سروشاں بیشمار اند " (دساتیر ص۶)	اسلامی عقیدہ بھی یہی ہے کہ ملائکہ بیشمار ہیں
(۹) فرشتے کلام الٰہی پیغمبر کے دل پر نازل کرتے ہیں (" ص۳۷)	" " " " "

(۱) بہشت کے متعلق بتایا بہشتیاں را تخن آزمش یزداں برتر باشد دہیچ کہ شود نہ دگیرد و نہ آلائش درد فراز آید...... دراں خورم آباد جاوید پایندد و۔ (آیہ ۱۳۱) — سورۂ واقعہ اور سورۂ نباء کے بیان کے مطابق ہے

(۱۱) دوزخ کے بارے میں ہے گنہگاراں در دوزخ باشند بدترو بہلے اوور بیکر آتش سوزندہ و برف فشرندہ و مارکژدم آزارندگان در رنج آور اں بندہ آرائش دہند۔

(دساتیر ص ۲۵)

سورۂ نباء میں دوزخ کے عذاب کا ذکر ہے۔ زرتشتی مذہب کے علاوہ کسی مذہب میں جہنمی عذاب کے سلسلہ میں برف کا ذکر نہیں۔ قرآن نے اس کی تصدیق کی۔

(۲) وحی الہٰی کی تین قسمیں بتائیں اول خواب دوم غنودگی اور سوم بیداری کی حالت (نامہ شت وخشور زرتشت۔ (آیہ ۵ تا ۷) — تینوں حالتوں میں وحی کا نزول ہوتا ہے۔

(۳) پیغمبر کی دنیا کو کیوں ضرورت ہے اور اس کی شناخت کیا ہے۔ ضرورت اس لئے ہے کہ نظام عالم کی درستگی اللہ کے بتلائے ہوئے قانون کے ذریعہ ہوسکتی ہے اور وہ قانون پیغمبر کے ذریعہ ہی نافذ ہوسکتا ہے۔ اس کی شناخت یہ ہے کہ وہ جو کچھ جانتا ہے دوسرے نہیں جانتے وہ انسانی فطرت سے واقف ہوتا ہے۔ کسی جواب سے عاجز نہیں۔ وہ جو کرسکتا ہے دوسرے نہیں کرسکتے۔

(نامۂ لیشت وخشور آیات ۴۵ تا ۵۴)

(۴) تخلیق کائنات چھ ادوار میں بالترتیب ہوئی آسمان۔ پانی۔ زمین۔ نباتات۔ حیوانات۔ اور آخر میں انسان — قرآن کی ترتیب بھی یہی ہے

کو پیدا کیا۔

(۵) تمام نسل انسانی کے ماں باپ آدم (مشتیہ) اور حوا (مشیانا) ہیں — تخلیق آدم و حوا کا ذکر قرآن میں ہے۔

آنحضور نے زرتشتی مذہب کی کیا اصلاح کی؟ حضرت زرتشت کی نبی موعود کی پیشگوئی کے سلسلہ میں آپ پڑھیں گے کہ وہ موعود نبی زرتشتی مذہب کی اصلاح کرے گا اور شرک کو مٹائے گا۔ پچھلے صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ صحابہ کرام کو فتح ایران کے وقت جس مجوسی قوم سے واسطہ پڑا تھا وہ حضرت زرتشت کی تعلیم سے بہت دور ہٹ چکی تھی۔ اِس قوم کے اُس زمانہ میں مذہبی تصورات کو سمجھنے سے اصلاح کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۱) زرتشتی قوم میں بت پرستی کے بجائے مظاہر پرستی کا عقیدہ رائج تھا۔ خدا دو تھے ایک خالق نور (آہورمزدہ) اور دوسرا خالق ظلمات (اہرمن)۔ ہر اچھی چیز کا خالق یزداں (آہورمزدہ) اور ہر بری چیز کا خالق اہرمن تھا۔ اسلام نے بتایا کہ دو خداؤں کا تصور غلط ہے۔ ہر شے کا خالق اللہ اور صرف اللہ ہے اور وہ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ہے جو چیز تمہیں بری اور خوفناک معلوم ہوتی ہے اس کی تخلیق میں بھی بہترین حکمتیں اور فوائد ہیں تکوینی امور کو وہی بہتر سمجھتا ہے تم نہیں سمجھ سکتے۔ موت اگرچہ خوفناک معلوم ہوتی ہے مگر انسان کی ترقیات کا یہی دروازہ ہے اسی لئے اس آخری مصلح نے فرمایا "خلق الموت وَالْحَیَاتَ" یعنی موت و حیات دونوں کو اسی نے پیدا کیا۔ دونوں کے خالق دو ہوتے تو ان میں جنگ چھڑ جاتی اور نظام عالم درہم برہم ہو جاتا۔

(۲) مجوسیوں کے اس خیال کی بھی اصلاح کی کہ خدا کے برگزیدہ انبیاء سے یہ گمان کہ وہ فرائض نبوت کے بجا لانے میں کوتاہی برتتے ہیں یا احکام خداوندی سے انکار کرتے ہیں غلط ہے۔ یہ عقیدہ نہایت غیر معقول ہے۔ کیا خدا کو اس کا علم نہ تھا

فلاں وخشور یا نبی رسالت کا اہل نہیں اور پھر وخشور تو بذات خود دوسروں کے لئے نمونہ ہوتے ہیں اگر وہ خود ہی غلط ہوں تو دوسروں کی رہنمائی کس طرح کر سکتے ہیں۔ مجوسی زرتشتر کو سب سے پہلا شارع نبی سمجھتے تھے اس لئے کہ نوحؑ کے بعد جم نے نبوت کی تبلیغ سے انکار کر دیا تھا۔ (وندادیداد فرگرد ۲ بحوالہ میثاق النبیین صفحہ ۳۰)

(۳) موجودہ سائنس کے دور میں یہ توہمات کس درجہ قابلِ اصلاح ہیں جن کی اصلاح کے لئے اب سے چودہ سو سال پہلے توجہ دلائی جا چکی ہے کہ لاش سے زمین، ہوا اور انسان، ناپاک ہو جاتے ہیں۔ لاش میں جہنم کے داروغہ گھس آتے ہیں یا عورتیں اپنے مخصوص دنوں میں اسقدر ناپاک ہو جاتی ہیں کہ ان کو دور سے کرچھی کے ذریعہ پھینک کر کھانا دینا چاہیئے۔

(۴) اسی طرح کتے کی جان کو انسان سے زیادہ عزیز سمجھنا۔ قتلِ انسان کی سزا صرف ۹۰ درّے اور کتے کو برا کھانا دینے کی سزا دوسو درّے۔ عورت بچہ کی پیدائش کے بعد اگر پانی پی لے تو سزا دوسو درّے۔ اگر انسان ناپاک ہونے کی حالت میں درخت یا پانی کو چھولے تو اس کی سزا چار سو درّے ہے اور مردہ کو جلانے یا دفن کرنے کی سزا ناقابل کفارہ اور ناقابلِ معافی۔ (ملاحظہ ہو فرگرد ۴/۹، ۷/۲، ۴/۵، ۶/۷، ۹/۳۲،۳۷ اور ۵/۳۸،۳۹،۴۴ بحوالہ میثاق النبیین صفحہ ۳۹ ۔

(۵) زرتشتی دین میں مزدک نے عورتوں کے متعلق نہایت اخلاق سوز باتیں داخل کر دی تھیں جس کی اصلاح اسلامی تعلیم سے متاثر ہو کر کی گئی۔

حضرت زرتشت کی پیشگوئیاں:۔ (۱) یہ بتایا جا چکا ہے کہ ژند اوستا کا دوسرا پہلا حصہ وندیداد اور دوسرا یشت ہے۔ فروردین یشت ۲۸ آیۃ ۱۲۹ میں ایک پیشگوئی بطور استعارہ درج ہے کہ "جناب زرتشت کی خفیہ اولاد محفوظ ہے جو ان کے بعد اس طرح ظاہر ہوگی کہ ایک عورت حوض کوثر میں نہائے گی .... اس سے ایک موعود نبی۔

"استوت ریرہ (محمد) یا سوشیانت (رحمۃ للعالمین) پیدا ہوگا جو زرتشتی دین کی اصلاح کرے گا۔ بت پرستی مٹادے گا اور زرتشتیوں کی اصلاح کرے گا۔

اس پیشینگوئی میں زرتشتیوں کے نزدیک حوض کوثر سے مراد ایک جھیل ہے جو سیستان میں بتائی جاتی ہے جس میں کیخسرو (شاہ ایران) غسل کرتا ہوا گم ہو گیا۔ یہی چشمہ حیات ہے جہاں زرتشتیوں کے کیخسرو اور عام مسلمانوں کے خواجہ خضر ابتک بقید حیات رہ کر بھولے بھٹکوں کو راستہ بتاتے یا علم سکھاتے ہیں۔ پیشینگوئی کی اصل عبارت پر قرآن عزیز کی روشنی میں غور کیجئے تو مفہوم بالکل واضح ہے کسی تاویل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ عبارت میں حوض کوثر سے مراد کوئی آبی یا مادی جھیل نہیں بلکہ روحانی پانی ہے یعنی وہ تعلیم جس میں ماء الحیات اور اعلیٰ درجہ کی صداقتیں جمع ہیں اور جو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی۔ اور اس کو اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ فرما کر دنیا کو بتایا اور دنیا نے تسلیم کیا جس میں ڈاکٹر مسٹر جم ژند اوستا نے مذکورہ بالا آیتہ کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

"اس کا نام فاتح مہربان استوت ریتہ (تعریف کیا گیا یعنی محمد) ہوگا۔ وہ شاد شینت یعنی رحمت مجسم ہوگا کیونکہ وہ تمام جہان کے لئے رحمت ہوگا۔ وہ حاشر ہوگا اس لئے کہ کامل انسان اور روحانی انسان ہونے کی وجہ سے وہ تمام لوگوں کی ہلاکت کے برخلاف مبعوث ہوگا وہ مشرک (بت پرستوں) اور ایماندار لوگوں (زرتشتیوں کی بدیوں کی اصلاح کرے گا۔

باقی

التَرغِیبُ والتَرھِیبُ

مصنفہ حافظ زکی الدین عبد العظیم بن عبد القوی المنذری رح

از جناب مولوی محمد عبید اللہ صاحب دہلوی

اگست ۶۲ء میں الترغیب و الترہیب کے مولف حافظ زکی الدین المنذری کا تعارف شائع ہوا تھا۔ زیر نظر مضمون میں اصل کتاب کا تعارف شائع کیا جارہا ہے۔ انشاء اللہ کتاب بھی جلد شائع ہورہی ہے۔ (برہان)

"ترغیب وترہیب" (اعمالِ خیر پر اجر و ثواب اور بدعملیوں پر زجر و عقاب) کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا تذکرہ آئندہ کسی فرصت میں کیا جائے گا سردست حافظ زکی الدین المنذری کی کتاب "الترغیب والترہیب" کا تعارف، خصوصیات اور اس پر اہلِ علم کی خدمات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

حافظ منذری نے کتاب کے مقدمہ میں بیان کیا ہے کہ میرے ایک سعادتمند شاگرد نے مجھ سے یہ تمنا ظاہر کی کہ میں ترغیب وترہیب کے موضوع پر ایک جامع کتاب املاء کرادوں جو اسناد وعلل کی بحثوں سے خالی ہو اور اپنے موضوع پر پوری طرح حاوی ہو۔ ان کی درخواست پر مصنف رحمہ اللہ نے استخارہ کیا اور اس کے بعد یہ کتاب املاء کرادی۔

اس کتاب میں صرف وہی حدیثیں جمع کی گئی ہیں جن میں صراحت کے ساتھ ترغیب وترہیب کا مضمون ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات بالکل نہیں لئے گئے ہیں

اور اقوال میں بھی صرف امر یا صرف نہی کی احادیث نہیں لی گئی ہیں بلکہ بہت سی ایسی حدیثوں کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا ہے کہ یہ آپ کا صرف فعل ہے[1] قول نہیں ہے یا یہ کہ صرف دعا ہے ترغیب و ترہیب کا مضمون اس میں صراحت کے ساتھ نہیں ہے۔

احادیث کی سندوں کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس کے بجائے کتب حدیث کے حوالے دیدیئے ہیں اور سند کا مقصد چونکہ یہی ہوتا ہے کہ اس کے رجال کو دیکھ کر حدیث کی صحت یا سقم کا اندازہ کیا جا سکے اور یہ کام صرف ماہرین فن ہی کر سکتے ہیں۔ اس لئے مصنف نے اس کا نعم البدل یہ اختیار کیا ہے کہ اپنی کتاب کی کل احادیث کی باعتبار درجۂ استناد تین قسمیں کر دیں اور تینوں میں سے ہر ایک کی الگ کچھ علامتیں مقرر کر دیں جن کی تفصیل یہ ہے کہ :-

(۱) وہ حدیثیں جن کی سند صحیح یا حسن یا اس کے قریب قریب ہو۔ ایسی روایات کو وہ لفظ "عن" سے شروع کرتے ہیں اور آخیر میں اس پر کچھ کلام نہیں کرتے۔

(۲) وہ حدیثیں جو مرسل یا منقطع یا معضل ہوں، یا اس کا کوئی راوی مبہم ہو یا ضعیف ہو مگر بعض ناقدین حدیث نے اسے ثقہ کہا ہو یا ثقہ ہو مگر بعض علماء نے اسے ضعیف قرار دیا ہو اور باقی رجال اس کے یا تو ثقات ہوں یا اگر ان پر کلام ہو تو ایسا جو ثبوت میں کچھ مضر نہ ہو۔ یا وہ حدیثیں ایسی ہوں جو مرفوع نقل ہوئی ہوں مگر صحیح ان کا موقوف ہونا ہو یا متصل نقل ہوئی ہوں مگر حقیقت میں وہ مرسل ہوں۔ یا یہ کہ وہ حدیث ہو تو ضعیف لیکن اس کے بعض مخرجین نے اس کو

---

[1] مصنف نے اپنا یہ اصول اس کتاب میں کئی جگہ بیان کیا ہے۔ حوالہ الترغیب فی صدقۃ اللہ میں ج ا ص۲۰۲ ، الترغیب فی کلمات یقولہن حین یاوی الی فراشہ میں ج ا ص[illegible] اور اس کے ایک صفحہ بعد ص۲۱۲ پر اور ان کے علاوہ بھی متعدد مقامات پر۔

صحیح یا حسن کہا ہو ــــــ ایسی تمام روایات کو بھی لفظ "عن" سے شروع کیا ہے اور حدیث کے آخر میں اس کی سند کا حال اس کا ارسال وانقطاع وغیرہ بیان کر دیا ہے۔

(۳) وہ حدیثیں جن کی سندوں میں کوئی راوی ایسا ہو جس کے متعلق کذاب، وضاع، متہم، یجمع علی ترکہ، مجمع علی ضعفہ، ذاہب الحدیث، ھالک، ساقط وغیرہ الفاظ کہے گئے ہوں۔ یا جن احادیث کی سندوں میں تحسین کا کوئی احتمال ہی نہ ہو ــــ ایسی تمام روایات کو لفظ "روی" سے شروع کرتے ہیں اور ان کی سندوں پر کچھ کلام نہیں کرتے، گویا ضعیف احادیث کی پہچان یہ ہوئی کہ وہ لفظ "روی" سے شروع ہو اور حدیث کے اخیر میں اس کی سند پر کچھ کلام نہ ہو۔

مصنفؒ نے بیان کیا ہے کہ جو روایات متعدد صحابہ کرامؓ سے نقل ہوئی ہیں ان میں سے کسی ایک دو کا نام ذکر کیا ہے۔ اسی طرح حوالجات میں عموماً چند ماخذ کا ذکر کرکے بقیہ کا تذکرہ قصداً چھوڑ دیا ہے بالخصوص جو روایت بخاری اور مسلم یا ان میں سے کسی ایک سے لی ہے تو اس کے ساتھ عموماً کسی اور کتاب کے حوالے کی ضرورت نہیں سمجھی ہے۔

جوامع و سنن اور معاجم و مسانید میں اس موضوع کی کوئی حدیث حتی الامکان نہیں چھوڑی ہے سوائے ان روایات کے جن کی سند بہت ضعیف یا موضوع ہو، اس موضوع پر اپنے سے پہلے قلم اٹھانے والوں میں سے خاص طور پر مصنفؒ نے ابو القاسم اصبہانی کی کتاب الترغیب والترہیب کا ذکر کیا ہے کہ میں نے اس کی کوئی حدیث نہیں چھوڑی ہے سوائے ان حدیثوں کے جن کا موضوع ہونا یقینی تھا۔

کتاب کے ماخذ | مصنفؒ نے زیادہ تر روایات اپنے بیان کے مطابق ان کتابوں سے اخذ کی ہیں۔

( ) مؤطا امام مالکؒ ( ) صحیح مسلمؒ

( ) مسند امام احمد بن حنبلؒ ( ) سنن ابی داؤدؒ

( ) صحیح بخاری رح ( ) کتاب المراسیل لابی داؤد رح

( ) جامع الترمذی رح ( ) السنن الکبری للنسائی رح

( ) کتاب الیوم واللیلۃ للنسائی رح ( ) سنن ابن ماجہ رح

( ) المعجم الکبیر للطبرانی رح ( ) المعجم الاوسط

( ) المعجم الصغیر رح ( ) مسند ابی یعلی الموصلی رح

( ) مسند ابی بکر البزار رح ( ) صحیح ابن حبان رح

( ) المستدرک علی الصحیحین للحاکم رح

ان کے علاوہ کچھ حدیثیں کہیں کہیں ان ماخذ سے بھی لی گئی ہیں :

( ) صحیح ابن خزیمہ رح ( ) ابن ابی الدنیا کی کتابیں ۔

کتاب میں حوالجات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابن ابی الدنیا کی کتابوں میں سے مصنف کے پیش نظر یہ کتابیں رہی ہیں :۔ مکاید الشیطان ، کتاب الصمت ، کتاب العزلۃ ، کتاب الجوع ، کتاب ذم الغیبۃ ، کتاب الاولیاء ، اصطناع المعروف ، کتاب المرض والکفارات وغیرہ۔

شعب الایمان للبیہقی رح

کتاب الزہد الکبیر رح

کتاب الترغیب والترہیب لابی القاسم الاصبہانی رح

مصنف کے بیان کے مطابق اگرچہ اس کتاب کی تمام روایات لے لی گئی ہیں لیکن راقم السطور کا خیال ہے کہ اس کی صورت بظاہر یہ ہوئی ہے کہ اس کتاب کی مندرجہ روایات دوسری کتابوں کے حوالے سے نقل کی ہیں مثلاً اس کی جو روایات بخاری ، مسلم وغیرہ میں ہیں وہ بخاری ومسلم ہی سے لی ہیں اس لئے اس کتاب کا حوالہ بہت کم ملتا ہے۔

مزید ماخذ | یہ تو وہ ماخذ تھے جن کا ذکر خود مصنف رح نے کتاب کے مقدمہ میں کیا ہے لیکن بہت سے ماخذ اور بھی ہیں جن کا مصنف رح نے ذکر نہیں کیا ہے اور کتاب میں

جابجا ان کا حوالہ ہے ہم نے پوری کتاب کا مطالعہ کرنے[1] کے بعد ان کی مندرجہ ذیل فہرست مرتب کی ہے:-

جامع الاصول	لرزین بن معاویۃ العبدری
الکامل	لابن عدی
کتاب الزہد	لعبد اللہ بن المبارک
زوائد کتاب الزہد لعبد اللہ بن المبارک رح	مسند حسین بن حسن المروزی رح
کتاب البر	لعبد اللہ بن المبارک رح
کتاب الصلوۃ	لمحمد بن نصر المروزی رح
کتاب الصلوۃ	لابن حبان رح صاحب الصحیح
کتاب الصلوۃ	لابن ابی عاصم رح
التاریخ	للامام البخاری رح
تاریخ مصر	لابن یونس رح
کتاب الضعفاء	للامام البخاری رح
کتاب الضعفاء	لابن حبان رح صاحب الصحیح
عمل الیوم واللیلۃ	لابن السنی رح
مسند الفردوس	لابی منصور الدیلمی رح

[1] مسودے میں ابتداءً ہم نے اس کا بھی اہتمام کیا تھا کہ ہر ماخذ کی نشاندہی بھی کریں کہ اس کتاب کا حوالہ ترغیب میں کس جگہ ہے اور ہر کتاب کے نام کے ساتھ تین تین حدیثیں ان کے باب اور جلد و صفحہ کے ساتھ جمع بھی کرلی تھیں لیکن طوالت کے خوف سے اسے حذف کرکے صرف اسمائے کتب نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ البتہ جن کتابوں کا حوالہ پوری کتاب میں صرف دو ایک ہی جگہ ہے۔ ان کی نشاندہی کردی گئی ہے۔

زوائد المسند[ل]	لعبد اللہ بن الامام احمد رح
کتاب السنۃ	لابن ابی عاصم رح
کتاب العلم	لابی عمرو بن عبد البر النمری رح
حلیۃ الاولیاء	لابی نعیم الاصبہانی رح
کتاب الثواب	لابی الشیخ[ک] ابن حبان الانصاری

ل یہ زوائد بھی اگرچہ مسند احمدؒ ہی کا جزء ہے اور عموماً ایک ہی سمجھی جاتی ہے لیکن مصنفؒ نے اس کے حوالے ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے دئے ہیں اس لئے ہم نے بھی اسے ایک الگ ماخذ قرار دیا ہے۔

ک ابو الشیخ ابن حیّان الانصاری المتوفی ۳۶۹ھ صاحب کتاب الثواب و کتاب التوبیخ وغیرہ ہیں اور ایک دوسرے محدث ابن حِبان البستی المتوفی ۳۵۴ھ ہیں جو کتاب الانواع و التقاسیم کے مصنف ہیں اور اسی کو الصحیح بھی کہتے ہیں۔ یہ موخر الذکر چونکہ زیادہ مشہور ہیں اور نام میں مشابہت ہے اس لئے اکثر لوگوں کو اشتباہ ہو جاتا ہے اور ابو الشیخ ابن حیّان کو بجائے یائے مثناۃ من تحت کے باء موحدہ سے لکھ دیتے ہیں اور یہ غلطی اتنی عام ہے کہ اگر آپ سو جگہ یہ نام لکھا دیکھیں گے تو شاید ستر جگہ باء موحدہ کے ساتھ لکھا ہوا ملے گا۔ اکثر نئی اور پرانی کتابیں اس غلطی سے پُر ہیں۔ الترغیب والترہیب میں جہاں صرف ابو الشیخ آیا ہے اس کو چھوڑ کر پورا نام "ابو الشیخ ابن حیان" پوری کتاب میں کل پچاس جگہ آیا ہے اور میرے ذاتی نسخہ مطبوعہ مصطفیٰ البابی الحلبی مصر ۱۳۷۳ھ میں تمام مقامات پر بلا استثناء باء موحدہ کے ساتھ لکھا ہے دوسرے نسخوں میں بھی کہیں موحدہ کے ساتھ لکھا ہے کہیں مثناۃ کے ساتھ کشف الظنون میں بھی بعض جگہ "ی" اور بعض جگہ وہی "ب" ہے شذرات الذہب میں بھی باء موحدہ کے ساتھ ہی لکھا ہے اور ان کے علاوہ بھی بہت جگہ یہی دیکھا گیا ہے ——— علامہ زیلعی رح لکھتے ہیں کہ قاضی شمس الدین ابو العباس احمد بن ابراہیم السروجی الحنفی المتوفی سنہ ۷۱۰ھ نے "الغایۃ شرح الھدایۃ" میں بیان کیا ہے کہ یہ ابن حِبان صاحب الصحیح نہیں ہیں بلکہ یہ لفظ یاء مثناۃ کے ساتھ ابن حیان ہے (نصب الرایہ فی تخریج احادیث الھدایہ ج ۱ ص ۲۷)

المصنف	لابی بکر بن ابی شیبۃ رح
المصنف[1]	لعبد الرزاق رح
السنن	للدار قطنی رح
السنن	للدارمی رح
کتاب الاربعین[2] (فی التصوف)	لابی عبد الرحمٰن السلمی رح
معرفۃ الصحابہ[3]	لابی نعیم الاصبہانی
کتاب السواک[4]	" " "
کتاب القاسم بن اصبغ[5]	
التمہید[6]	لابن عبد البر النمری رح

---

[1] خوشی کی بات ہے کہ یہ کتاب استاذ محترم مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی تحقیق و تعلیمات کے ساتھ عنقریب بیروت سے شائع ہونے والی ہے۔

[2] اس کتاب سے صرف ایک حدیث لی گئی ہے۔ الترغیب فی العلم۔ حدیث ۱۱ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ج ۱ ص ۱۳۳

[3] اس سے بھی صرف ایک ہی روایت لی ہے الترغیب فی صلوٰۃ العشاء والصبح حدیث ۱۳ عن منتجم ج ۱ ص ۱۷۱

[4] اس سے بھی الترغیب فی السواک کے اخیر میں صرف دو حدیثیں عن ابن عباس رض و عن جابر رض نقل کی گئی ہیں۔ ج ۱ ص ۱۶۸

[5] اس کا حوالہ بھی صرف ایک ہی جگہ ہے الترہیب من ترک حضور الجماعۃ بغیر عذر کی پہلی حدیث عن ابن عباس رض ج ۱ ص ۲۸۲

[6] اس سے بھی الترہیب من المرور بین یدی المصلی ج ۱ ص ۲۷۸ کی صرف آخری ایک حدیث عن عبد اللہ بن عمرو موقوفاً نقل کی ہے۔

ابن جریر الطبری رح	(کتاب کا نام مذکور نہیں)
ابوحفص عمر بن شاہین رح [51]	(" " " ")
ہبۃ اللہ الطبری رح [52]	(" " " ")
کتاب الایمان [53]	لابی بکر بن ابی شیبہ رح
مکارم الاخلاق [54]	للخرائطی رح
تفسیر القرآن [55]	لابی بکر بن مردویہ رح
تفسیر القرآن [56]	لآدم بن ابی ایاس رح

---

[51] کتاب کا نام اگرچہ حافظ منذری نے نہیں لکھا ہے لیکن بظاہر ان کی کتاب الترغیب والترہیب سے ہی ہوگی جس کا تذکرہ ہم گذشتہ صفحات میں (مقدمہ کے گذشتہ صفحات میں) کر چکے ہیں۔ اس سے صرف دو جگہ استفادہ کیا ہے ایک الترغیب فی الاذان۔

[52] ان سے صرف ایک روایت الترہیب من ترک الصلوۃ تعمدا کی پانچویں حدیث عن ثوبان رض ج ۱ ص ۳۷۹، ماخوذ ہے۔

[53] اس کا بھی ہماری تلاش وجستجو کی رو سے صرف ایک جگہ حوالہ دیا ہے۔ الترہیب من ترک الصلوۃ تعمدا کی بیسویں حدیث عن علی رض ج ۱ ص ۳۸۸،

[54] منذری نے اپنی اس کتاب میں خرائطی کا حوالہ پانچ جگہ دیا ہے لیکن کتاب کا نام صرف آخری جگہ الترہیب من اذی الجار کی بیسویں حدیث عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ میں ج ۳ ص ۳۵۶ پر ذکر کیا ہے۔

[55] الترغیب فی قراءۃ سورۃ الکہف کی دوسری حدیث عن ابن عمر رض ج ۱ ص ۵۱۳ اسی سے لی گئی ہے اور غالباً کہیں اور اس کا حوالہ نہیں ہے۔

[56] ہماری تلاش کی رو سے اس کے حوالے سے صرف دو حدیثیں ماخوذ ہیں:-
(۱) الترغیب فی قول لا حول ولا قوۃ الا باللہ کی آخری حدیث ج ۲ ص [illegible] و ص [illegible]
(۲) الترہیب من النار کی حدیث ۲۷ عن ابن عباس رض ج ۴ ص [illegible] و ص [illegible]

تفسیر القرآن ۱ھ	لاسحٰق بن راہویہ رح
شرح السنۃ ۲ھ	للبغوی رح
کتاب التوبیخ	لابی الشیخ بن حیان رح
السنن ۳ھ	لابی داؤد الطیالسی رح
فضائل رمضان ۴ھ	لابی حفص بن شاہین رح
کتاب الضحایا ۵ھ	لابی الشیخ ابن حیان رح

۱ھ اس کا بھی ہماری نظر میں صرف دو جگہ حوالہ ہے

(۱) الترغیب فی کفالۃ الیتیم حدیث ۱۸ عن انس رض ج ۳ صہ ۲۵ - اور

(۲) الترغیب فی الفقر حدیث ۲۶ عن انس رض ج ۴ صہ ۱۴۳ و صہ ۱۴۵ ۔

۲ھ اس کا حوالہ صرف تین جگہ ہے:-

(۱) الترغیب فی التیسیر علی المعسر کی حدیث ۱۰ عن ابی قتادۃ ج ۲ صہ ۴۶ اسی سے ماخوذ ہے۔

(۲) الترغیب فی غسل الید قبل الطعام کی چوتھی حدیث عن ابی ہریرۃ رض میں ج ۳ صہ ۱۵۱ تا صہ ۱۵۳ پر اس کا حوالہ ہے۔

(۳) الترہیب من الریاء کی حدیث ۱۲ عن عبداللہ بن سلام میں ج ۳ صہ ۹ یہ اگرچہ شرح السنۃ کا نام نہیں ہے مگر بغوی کا حوالہ ہے جس سے بظاہر ان کی یہی کتاب مراد ہے۔

۳ھ اس کا حوالہ صرف دو جگہ ملا:-

(۱) ترہیب الصائم من الغیبۃ والفحش کی آخری حدیث عن عبید ج ۲ صہ ۱۴۸ ،

(۲) الترہیب من الغیبۃ کی پندرھویں حدیث عن انس رض ج ۳ صہ ۵۰۰ ،

۴ھ اس سے صرف ایک حدیث لی گئی ہے۔ الترغیب فی صدقۃ الفطر کی تیسری حدیث عن جریر ج ۲ صہ ۱۵۱ و صہ ۱۵۲ ۔

۵ھ اس کا حوالہ صرف ایک جگہ الترغیب فی الاضحیۃ کی تیسری حدیث عن ابی سعید میں ج ۲ صہ ۱۵۲ پر ہے۔

کتاب الشمائل ۵۱	للامام الترمذی رح
کتاب البعث والنشور ۵۲	للبیہقی رح
الضعفاء ۵۳	کتاب کا نام درج نہیں ہے
الصحیح ۵۴	لابی عوانۃ رح
المستخرج ۵۵	للبرقانی رح
کتاب العلل ۵۶	للدار قطنی رح
صفۃ الجنۃ ۵۷	للامام البخاری رح

۵۱ اس سے بھی کل کتاب میں صرف ایک حدیث لی گئی ہے، الترغیب فی التواضع فی الحج کی پہلی حدیث عن انس رض ج ۲ ص ۱۸۳۔

۵۲ اس کتاب سے جلد دوم میں ایک اور جلد سوم میں دو حدیثیں ہیں اور اس کے بعد الترہیب من النار کی فصل فی شدۃ حرہا وغیرہ کی اکثر روایات اسی سے ماخوذ ہیں۔

۵۳ اس کا حوالہ صرف ایک جگہ الترغیب فی التسبیح والتکبیر الخ کی آٹھویں حدیث عن ابی امامۃ رض میں ج ۲ ص ۴۳۲ پر ہے

۵۴ اس کا حوالہ دو جگہ ہے:۔

(۱) الترغیب فی الاقتصاد فی طلب الرزق کی حدیث ۱۵ عن سعد بن ابی وقاص رض میں ج ۲ ص ۵۳۵ پر۔

(۲) الترغیب فی الزہد فی الدنیا کی دسویں حدیث عن سعد بن ابی وقاص رض میں ج ۴ ص ۱۶۰ پر،

۵۵ اس کا حوالہ صرف ایک جگہ الترغیب فی التواضع کی تیرھویں حدیث عن ابی سعید وابی ہریرۃ میں ج ۳ ص ۵۶۲ پر ہے۔

۵۶ اس کا حوالہ بھی صرف ایک ہی جگہ ہے، الترغیب فی الصدق کی بائیسویں حدیث عن سعد بن ابی وقاص ج ۳ ص ۵۹۵

۵۷ اس کا حوالہ بھی صرف ایک جگہ الترغیب فی اماطۃ الاذی عن الطریق کی نویں حدیث عن المستنیر بن اخضر بن معاویۃ عن ابیہ میں ج ۳ ص ۶۱۱ پر دیا گیا ہے۔

صفۃ الجنۃ [1] — لابی نعیم الاصبہانی رح

کتاب الرویۃ [2] — للبیہقی رح

یہ تمام نام ان کتابوں کے ہیں جن کا ذکر کتاب میں بطور ماخذِ حدیث آیا ہے۔ اس فہرست میں وہ کتابیں شامل نہیں ہیں جن کا ذکر مصنف نے کسی حدیث پر کلام کرنے کے دوران یا کسی مسئلہ فقہیہ کی تحقیق کے سلسلہ میں کیا ہے۔

---

[1] اس کے حوالے سے صرف چوتھی جلد میں الترغیب فی الجنۃ ونعیمہا میں تین حدیثیں لی ہیں:۔

(۱) حدیث ۹۲ عن ابی ہریرۃ رض ص ۵۲۳ پر اور

(۲) حدیث ۱۱۲ عن ابن ابی اوفی رض ص ۵۳۸ پر اور

(۳) حدیث ۱۲۱ عن علی رض ص ۵۴۵ و ص ۵۴۶ پر

[2] اس کا حوالہ صرف ایک جگہ الترغیب فی الجنۃ ونعیمہا کی حدیث ۱۲۸ عن جابر رض میں ج ۴ ص ۵۵۲ و ص ۵۵۳ پر ہے۔

علامہ اقبال اور تالۂ زمان

از جناب شبیر احمد خان صاحب غوری اجمل خان طبیہ کالج علیگڑھ

اسلام کی چہاردہ صد سالہ فکری تاریخ میں سوائے فرقۂ حرنانیہ کے (جس کے موقف کی تجدید تیسری صدی ہجری میں مشہور فلسفی طبیب ابوبکر محمد بن زکریا الرازی نے کی تھی) اور کوئی "تالۂ زمان" (Apotheosis of Time) کا قائل نظر نہیں آتا اور فرقۂ حرنانیہ اسلام کے "ہفتاد و دو ملت" میں سے نہیں تھا۔ مگر چودھویں صدی میں اس انداز فکر کی علمبرداری علامہ اقبال نے اپنے ذمہ لی اور اپنی تمام ذہنی و فکری صلاحیتیں اس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وقف کر دیں۔

اقبال فطرتاً "مردِ مومن" تھے۔ وہ ایک دیندار خاندان میں پیدا ہوئے اور بڑے دین پسندانہ ماحول میں پرورش پائی خدا پرستی بچپن ہی سے اُن کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی اور اسی فطری اسلام پسندی نے عہد طفلی میں ان سے کہلوایا تھا:۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اسی جذبے نے یورپ کے لادینی ماحول سے بیزار کر کے اُن سے کہلوایا تھا:۔

مژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز
بعد مدت کے ترے دیوانوں کو آیا ہے ہوش
پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شراب خانہ ساز
دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

اور اسی ایمان محکم پر اُن کا خاتمہ بالخیر ہوا:۔

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
وگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

اسی جذبہ کا نتیجہ تھا کہ وہ زندگی بھر اعلاء کلمۂ اسلام کے لئے کوشاں رہے اور تمام کا یہ

غلیم مجبور ہے کہ اسی جذبہ کی تسکین کے لئے انھوں نے "تلازمان" کا سہارا لیا۔ اس کی تفصیل تو آگے آئے گی مگر یہاں اجمالاً اتنا کہدینا ضروری ہے کہ علامہ نے اس عقیدے کا ابتدائی تصوّر برگساں کے "دوران خالص" (Durée Reele) سے لیا تھا مگر اس کی تکمیل الیگزینڈر کی کتاب "Space, Time and Deity" سے پڑھ کر کی اور جو کسر رہ گئی تھی اس کی تلافی اسپنگلر کی "انحلال الغرب" (Decline of the West) کے ذریعہ ایرانی زروانیت سے واقفیت حاصل کر کے کی۔

ان پے بہ پے فکری تاثرات کے نتیجے میں انجام کار اُن کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ زمانہ ہی "حقیقت مطلقہ" یا "Ultimate Reality" ہے یا سیدھے سادے لفظوں میں "زمانہ ہی خدا ہے" (نعوذ باللہ منھا) اور یہ وہ خیال ہے جہاں تک برگساں بھی اپنی فلسفیانہ آزادی رائے کے باوجود (جس کے لئے وہ فرانس کے مذہبی حلقوں میں الحاد و بیدینی کے ساتھ متہم تھا) پہونچنے کی جرائت نہ کر سکا۔ مگر علامہ کی مطلق العنان تخییل انھیں یہاں تک لے پہونچی۔ یہی نہیں بلکہ اسی جرائت رندانہ کا فقدان اُن کی نظر میں برگساں کی سب سے بڑی کوتاہی تھا جیسا کہ وہ "خطبات" میں فرماتے ہیں:۔

"میں یہ خیال کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ برگساں کی غلطی زمان خالص کو ذات پر مقدم سمجھنے میں مضمر ہے کیونکہ صرف ذات ہی کے ساتھ دوران خالص محمول بنایا جا سکتا ہے۔"

بہرحال وہ (۲۸-۱۹۲۹ء) کے دوران میں زمانہ کے "حقیقت مطلقہ" ہونے کے بڑی شدت سے قائل ہو چکے تھے چناں چہ "خطبات" (الہیات اسلامی کی تشکیل جدید) میں فرماتے ہیں

"جس طرح ہم اپنی ذات میں زمان کے تعاقب و تسلسل کا ادراک کرتے ہیں، اس کی تنقیدی توجیہ اس بات کی جانب ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ حقیقت مطلقہ کو دوران خالص تصور کریں جس کے اندر علم حیات اور ارادہ (فکر حیات اور مقصد) ایک دوسرے

کے ساتھ گھل مل کر ایک منظم وحدت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں ہم زمانہ کا تصور
ہم صرف اسی حیثیت سے کر سکتے ہیں کہ یہ ایک ذات کی وحدت ہے ـــــــ ایک
بر ہمہ محیط قائم بذاتہ ذات ـــــــ جو تمام انفرادی روحوں، افکار اور حیات کا سرچشمہ
بلا شبہ ان کی دیرینہ اسلام پسندی اس خیال میں مانع تھی۔ لہذا موجودہ صدی
صدی کے تیسرے عشرہ میں انھیں اس بات کی تلاش ہوئی کہ اس نئے تصور کے لئے
اسلامی فکر میں کہیں سند مل جائے۔ بدقسمتی سے چند کوتاہ فکر احباب نے علامہ کی یہ خواہش
بھی پوری کر دی اور انھیں بتایا کہ زمانہ کا یہ تصور نہ صرف عربی مدارس میں زیر درس معقولات ہی
کی اعلیٰ کتابوں میں موجود ہے بلکہ حدیث کی کتابوں میں بھی ہے جو ایک مرد مومن کے لئے
واجب الایمان ہیں۔ مگر علامہ سید سلیمان ندویؒ کے اس درجہ عقیدت مند تھے کہ انھیں سے
اس نئے خیال کی تصویب کرائے بغیر اپنانا نہیں چاہتے تھے۔ ادھر سید صاحب نے جو
اس سنگلاخ وادی کے کبھی رہرو نہیں رہے تھے، عافیت خاموشی ہی میں سمجھی۔ علامہ
نے اس خاموشی کو "تصویب" سمجھ لیا اور پھر جو اس فکری بےراہ روی کے قلزم ناپیدا کنار
میں غوطہ لگایا تو آخر تک اسی گرداب میں ہاتھ پاؤں مارتے رہے اور ساحل نجات
تک رسائی آخر تک ممکن نہ ہو سکی۔

بہرکیف علامہ نے مکتوب گرامی مورخہ ۷ مارچ ۱۹۲۸ء کو لکھا تھا۔

"شمس بازغہ یا صدرا میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال
نقل کئے ہیں، ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمان خدا ہے۔ بخاری میں ایک حدیث
بھی اسی مضمون کی ہے لا تسبوا الدھر الخ۔ کیا حکمائے اسلام میں سے کسی
نے یہ مذہب اختیار کیا ہے۔ اگر ایسا ہو تو یہ بحث کہاں سے ملے گی؟"

آج اس خط کو لکھے ہوئے ۴۴ سال اور شائع ہوئے کوئی ۲۰ سال ہو رہے ہیں اور
شائع بھی ہوا تو سید صاحب کی زیر ادارت۔ مگر نہ تو انھوں نے اس مسئلہ کے حل کرنے کی

کوشش کی اور نہ بعد میں کسی اور شارح یا نقاد نے اس کی تحقیق کی زحمت فرمائی صرف سید صاحب نے "اقبالنامہ" کے اندر اس خط پر یہ نوٹ دیا ہے :-

" اقبال مرحوم کو اس بحث سے بڑی دلچسپی تھی - میں نے اس پر لاہور میں انکی ایک تقریر بھی سنی تھی، اخیر زمانے میں میرے دل میں علامہ ابن قیم کی تصانیف سے ایک حقیقت فہم میں آئی جس سے بڑی خوشی ہوئی - مگر افسوس کہ اس زمانے میں مرحوم بیمار تھے - انتظار تھا کہ وہ تندرست ہوں تو ان کو سناؤں - مگر افسوس ع

جو کٹ گئی نخل آرزو کی

مجھے یقین ہے کہ وہ اگر اس کو سنتے تو ضرور خوش ہوتے "

معلوم نہیں سید صاحب نے علامہ کے مکتوب مورخہ ۷ - مارچ ۱۹۲۸ء کا کیا جواب دیا - لیکن انہوں نے "اقبالنامہ" میں جو نوٹ دیا ہے، اس سے نفس سوال کے جواب پر کوئی روشنی نہیں پڑتی - یہ تو "اقبالیات" کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ فلسفۂ خودی کے علاوہ علامہ کو مسئلہ زمان و بالخصوص "دوران خالص" سے بیحد دلچسپی تھی - مگر وہ تقریر کیا تھی جو سید صاحب نے لاہور میں اس موضوع پر علامہ کی زبان سے سنی تھی - ہم بجا طور پر توقع کر سکتے ہیں کہ سید صاحب کم از کم اس کے خط و خال سے قارئین کو ضرور واقف کر دیتے - رہا ان کا اپنا موقف جو انھوں نے ابن قیم جوزی کی تصانیف کے مطالعے کے نتیجے میں اختیار کیا تھا کاش وہ اسے ہی نقل کر دیتے تاکہ یہ معلوم ہو جاتا کہ ابن قیم کی توجیہ اُن توجیہات سے مختلف تھی جو عام متکلمین و فلاسفہ نے بیان کی ہیں، یا نہیں -

صاحب "شمس بازغہ" (ملا محمود جونپوری) اور صاحب "صدرا" (صدر الدین شیرازی) کا زمانہ گیارھویں صدی ہجری ہے، مگر "تاۂ زمان" کا قدیم ترین حوالہ اسلامی فکر میں سب سے پہلے چوتھی صدی ہجری میں ملتا ہے اور اس کا قائل تیسری صدی ہجری سے تعلق رکھتا تھا اس کی تفصیل تو آئندہ آئے گی سردست تو علامہ کو جو کچھ بتایا گیا تھا اور جس کی وضاحت انہوں نے سید

سلیمان ندوی سے چاہی تھی۔ اس کی توضیح کی جا رہی ہے۔

مسئلہ زمان کی توجیہ ایک جانب حکماء (فلاسفہ) نے کی ہے اور دوسری جانب متکلمین نے۔ مگر مسئلہ زیر بحث میں زیادہ اہم فلاسفہ کی توجیہ ہے۔

عام طور پر فلاسفہ (بالخصوص شیخ بو علی سینا کے زمانہ سے) زمانہ کے باب میں اسی مذہب کے پیرو رہے ہیں جو ارسطو نے اپنایا تھا۔ اس مذہب کو قاضی عضد نے "المواقف فی الکلام" میں بدیں طور نقل کیا ہے۔

"رابعھا ماذھب الیہ ارسطو انہ مقدار حرکۃ الفلک الاعظم"

(زمانہ کے باب میں مذاہب پنجگانہ میں سے) چوتھا مذہب وہ ہے جو ارسطو نے اختیار کیا تھا اور جس کی رو سے زمانہ فلک اعظم کی حرکت کی مقدار کا نام ہے)

بہر حال شیخ بو علی سینا نے زمانہ کے اس ارسطاطالیسی تصور کو "کتاب النجاۃ" اس طرح واضح کیا ہے۔

"الزمان مقدار للحرکۃ المستدیرۃ من جہۃ التقدم والتاخر لا من جہۃ المسافۃ"

(زمان حرکت مستدیرہ کی مقدار کا نام ہے تقدم و تاخر کی جہت کے لحاظ سے نہ کے لحاظ مسافت کے) مگر زیادہ مروج اثیر الدین ابہری کی تعبیر ہے:۔

"الزمان مقدار الحرکۃ"

(زمانہ مقدار حرکت کا نام ہے)

کیونکہ اثیر الدین ابہری کی ہدایۃ الحکمۃ ہی عام طور پر مدارس میں فلسفیانہ تفکیر کی اساس رہی ہے۔ بعد کے متعدد علماء نے اس پر شروح لکھیں جن میں سے قبول عام دو شرحوں کو حاصل ہوا۔ ان میں سے پہلی تو محقق دوانی کے شاگرد میبذی نے لکھی تھی اور دوسری میر باقر داماد کے شاگرد صدر الدین شیرازی (ملا صدرا) نے اور اسی لئے یہ دونوں کتابیں اپنے اپنے مصنف کے نام پر "میبذی" اور "صدرا" کہلاتی ہیں۔

ملا محمود جونپوری نے فلسفہ میں ایک مستقل کتاب "شمس بازغہ" کے نام سے لکھی جو کچھ دن پہلے تک عربی مدارس کے اندر فلسفہ و حکمت کے اعلیٰ نصاب میں شمول تھی۔ یہ کتاب متن اور شرح کے مجموعہ کا نام ہے جو دونوں ملا محمود کی تصنیف ہیں۔ متن کا نام "الحکمۃ البالغۃ" اور شرح کا نام شمس بازغہ ہے ہدایۃ الحکمۃ" تین قسموں پر مشتمل ہے۔ القسم الاول منطق میں، القسم الثانی طبیعیات میں اور القسم الثالث الٰہیات میں۔ ان میں سے قسم اول (حصہ منطق) کا درس میں رواج نہیں ہے قسم ثانی (حصہ طبیعیات) تین فنون پر مشتمل ہے:۔ الفن الاول ما لعم الاجسام کی بحث میں، الفن الثانی فلکیات کی ابحاث میں اور الفن الثالث عنصریات کی ابحاث میں۔

صدرا (جو صدر الدین شیرازی کی "شرح ہدایۃ الحکمۃ" کا نام ہے) کا وہ حصہ جو درس میں متداول ہے، طبیعیات کے پہلے فن "ما لعم الاجسام" کی شرح پر مشتمل ہے۔ اس فن میں دس فصلیں ہیں جن میں سے آخری فصل "زمان" پر ہے۔ شارح (صدرائے شیرازی) نے اس فصل کو تین مطالب پر منقسم کیا ہے (۱) زمان کی اِنّیت (۲) زمان کی ماہیت اور (۳) زمان کا مبدع (غیر مقطوع (البدایہ والنہایہ) ہونا لیکن انہوں نے ان مطالب ثلاثہ سے پہلے زمانہ کے باب میں مختلف مفکرین کے مذاہب گنائے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"و قبل الخوض فی المطالب ینبغی ان لیعلم ان الناس اختلفوا فی الزمان اختلافاً عظیماً، فمنھم من اثبت له وجوداً عینیاً ومنھم من نفی وجودہ الا بحسب الوھم والمثبتون لوجودہ: منھم من جعله جوھراً ومن جعله عرضاً والجاعلون له جوھراً منھم من جعله جوھراً قد سیاً غیر جسمانی وفرقۃ منھم زعمت انه الواجب الوجود لذاته ومنھم

ان مطالب ثلاثہ میں غور و فکر کرنے سے پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ لوگوں نے زمانہ کے باب میں بڑا شدید اختلاف کیا ہے:۔ بعض لوگوں نے اس کے لئے وجود عینی ثابت کیا ہے اور بعض نے اس کے وجود کی نفی کی ہے سوائے وہم میں ملحوظ ہونے کے جن لوگوں نے اس کے وجود (عینی) کو ثابت کیا ہے ان میں سے بعض نے اسے جوہر اور بعض نے عرض بتایا ہے جن لوگوں نے اسے جوہر بتایا ہے ان

جعلہ جوہراً جسمانیاً ھو الفلک الاعلی، ومنھا من جعلہ عرضاً ... منھا انقضائہ عرض غیر قار فھو اما نفس الحرکۃ او غیرھا فھذا تفصیل المذاہب"

(صدرا مجتبائی صفحہ ۱۹۵-۱۹۶)

میں سے بعض نے اسے جوہر ... اور اُن میں سے ایک فریق نے ... گردانا ہے بعض لوگوں نے اسے جوہر جسمانی قرار دیا ہے، وہ (جوہر جسمانی) فلک اعلیٰ ہے۔ اور جن لوگوں نے اُسے عرض بتایا ہے ان کا اس کے "عرض غیر قار" ہونے پر اتفاق ہے یہ (عرض غیر قار) یا تو نفس حرکت ہے یا اس کے علاوہ اور کچھ ہے یہ ہے زمانہ کے مذاہب کی تفصیل۔

مندرجہ ذیل نقشہ سے ان مختلف مذاہب کی وضاحت ہوجائے گی

زمانہ

- وجود عینی رکھتا ہے
  - جوہر ہے
    - ...غیر جسمانی ہے
      - ...ممکن ہے (۱)
      - واجب الوجود لذاتہ ہے (۲)
    - جوہر جسمانی ہے فلک علی ہے (۳)
  - عرض ہے (عرض غیر قار)
    - نفس حرکت کا نام (۴)
    - نفس حرکت کے علاوہ کسی اور شے کا نام ہے یعنی مقدار حرکت (۵)
- وجود عینی نہیں رکھتا (صرف وہمی وجود رکھتا ہے)۔

ان میں سے دوسرے مذہب کی علامہ کو اطلاع دی گئی تھی جب کہ انہوں نے ... صاحب کے اپنے مکتوب مورخہ ۔ مارچ ۱۹۲۸ء میں لکھا تھا:۔

شمس بازغہ یا صدرا میں جہاں زمانہ کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کئے ہیں،
ان میں سے ایک قول یہ ہے۔
"کہ زمان خدا ہے"

یہ شمس بازغہ "حکمت طبیعیہ" ہے۔ ملا محمود اس کی تبویب و تفصیل ارسطو کے انداز پر کرنا چاہتے تھے تجویز یہ تھی کہ پہلا فن "سماع طبیعی" پر ہو جس میں دو مقالے ہیں۔ دوسرے مقالہ کا تیسرا باب حرکت پر ہے۔ انھیں مباحث میں سے "زمان" کا مسئلہ بھی ہے۔ اس مسئلہ کو اس کے متعلقات کے ساتھ مصنف علیہ الرحمۃ نے مختلف فصول میں بیان کیا ہے پہلے شیخ بوعلی سینا کے انداز میں زمان کے وجود کو ثابت کر کے مذہب مختار کے مطابق اس کی ماہیت کو متعین کیا ہے؛ پھر زمانہ کے "ابداع" پر بحث کی ہے کہ نہ اس کی بدایت ہے نہ نہایت۔ وہ حادث ضرور ہے لیکن اس معنی میں کہ اس کے "محدث" کو اس پر "تقدم بالذات" حاصل ہے نہ کہ "تقدم بالزمان"۔ اس فصل میں انہوں نے میر باقر داماد کے نظریہ "حدوث دہری" پر ناقدانہ تبصرہ کیا ہے۔ ازاں بعد مسئلہ "آن" کی بحث ہے۔ اور پھر ایک مستقل فصل میں شیخ بوعلی سینا کے مذہب فی الزمان کے علاوہ زمانہ کے باب میں مفکرین اسلام جن اور مذاہب سے واقف تھے، انھیں نقل کر کے ان پر تنقید کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"قلت فصل: وکانت لہم فی الزمان قبل نضج الحکمۃ ظنون بتفریط و افراط۔ فالمفرطون فیہ منہم من نفاہ رأساً.... .... واما المفرطون فمنھم من جعلہ واجباً لامتناع العدم علیہ لذاتہ، والا لکان لہ ما قبلیۃ علی وجودہ او بعدیۃ عنہ ولا یکونان الا بزمان"

میں کہتا ہوں۔ فصل:۔ فلسفہ و حکمت کے پختہ اور مکمل ہونے سے پہلے مفکرین زمانہ کے متعلق افراط و تفریط کے ساتھ گمان کیا کرتے تھے۔ جو لوگ اس باب میں تفریط سے کام لیتے تھے وہ تو سرے سے اس کا انکار ہی کرتے تھے اور جنھوں نے افراط سے کام لیا ان میں سے بعض مفکرین نے اسے واجب قرار دیا کیونکہ اس پر عدم لذاتہ ممتنع ہے ورنہ اس کے منقطع البدایہ ہونے کی صورت میں،

اُس کا عدم اُس کے وجود سے متقدم ہوگا، اسی
طرح (اس سے مقطوع الطرف) ہونے کی صورت میں
اُس کا عدم اُس کے وجود سے متاخر ہوگا اور یہ
دونوں (قبلیت و بعدیت یا تقدم و تاخر) صرف
زمانی ہی ہو سکتے ہیں سو اس طرح اُسے معدوم
ماننے ہوئے بھی موجود ماننا پڑے گا جو متناقض
بالذات قول ہے)

زمانہ کو واجب الوجود ماننے والوں کے قول کی تائید میں اسی قسم کی دلیل ملا صدرا نے دی تھی۔ فرماتے ہیں :۔

"و اما حجة من زعم ان الزمان واجب الوجود لذاته فهو ان الزمان يلزم من فرض عدمه لذاته امر محال۔ وكل ما يلزم من فرض عدمه محال فهو واجب الوجود لذاته اما الكبرىٰ فضرورية واما الصغرىٰ فلانا فرضنا عدم الزمان قبل وجوده او بعد وجوده لكانت القبلية والبعدية زمانية فقد لزم من فرض عدمه فرض وجوده فتجويز العدم على الزمان متناقض۔"

(صدرا صفحہ ۲۰۰ - ۲۰۱)

اور اُن لوگوں کی دلیل، جن کا گمان ہے کہ زمانہ "واجب الوجود لذاتہ" ہے، یہ ہے کہ زمانہ کے عدم ذاتی کے فرض کرنے سے محال لازم آتا ہے اور ہر وہ چیز جس کے معدوم فرض کرنے سے محال لازم آتا ہو وہ "واجب الوجود لذاتہ" ہوتی ہے اس استدلال کا مقدمۂ کبرٰی تو ضروری ہے۔ رہا مقدمہ صغرٰی تو اس کی مزید توضیح یہ ہے کہ اگر ہم زمانہ کے وجود سے پہلے اُس کا عدم فرض کریں یا اُس کے وجود کے بعد اُس کا عدم فرض کریں تو "قبلیت" اور "بعدیت" زمانی ہی ہوگی اور اس طرح اُس کے معدوم فرض کرنے سے اس کا وجود لازم آئیگا۔ پس زمانہ کے معدوم ہونے کی تجویز

متناقض بالذات ہے۔

اسی طرح ملا محمود نے مذکورالصدر اجمالی دلیل کی تفصیلی شرح بہ ایں طور کی ہے:

"واما الذین افرطوا فقالوا انه جوهر قائم بنفسه فمنهم من بالغ فی الغلو فجعله واجب الوجود...... فلذلک تخیل ذلک واجب الوجود، انما اوقعهم فی هذه الورطة الظلماء ان الزمان لو فرض عدمه وما کان بعده قبلیة علی وجوده او بعدیة وهذه زمانیة فیلزم وجود الزمان علی تقدیر فرض عدمه فکان عدمه ممتنعاً لذاته وما امتنع عدمه لذاته وجب وجوده" القبلیة او البعدیة لیست ــــــ

اور جن لوگوں نے زمانہ کے باب میں افراط سے کام لیا ہے، ان میں سے ایک گروہ نے اُسے "قائم بنفسہ" بتلایا ہے۔ ان میں سے بعض نے تو یہاں تک مبالغہ کیا ہے کہ اُسے واجب الوجود سمجھ لیا۔ پس جن لوگوں نے اُسے خدائے واجب الوجود مانا ہے انھیں اس اندھیری گرداب میں اس دلیل نے ڈالا ہے کہ اگر زمانہ کو معدوم فرض کیا جائے تو اس کے عدم کو اس کے وجود کے ساتھ "قبلیت" یا "بعدیت" کا تعلق ہوگا اور یہ "قبلیت" یا "بعدیت" صرف زمانی ہی ہوگی۔ پس زمانہ کے معدوم ہونے کو فرض کرنے کی تقدیر پر اس کا وجود لازم آئیگا۔ اس طرح اُس کا معدوم ہونا ممتنع بالذات ہوگا۔ اور جس کا عدم ممتنع بالذات ہوتا ہے، اس کا وجود واجب ہوتا ہے۔

لیکن "تالّٰہ زمان" کا مذہب اسلامی فکر میں کوئی ذمہ دار اور سنجیدہ قائل پیدا نہ کر سکا۔ اور اس کے رد میں مختلف دلائل وضع کئے گئے۔ اس کی تفصیل امام رازی نے "المباحث المشرقیہ" میں دی ہے۔ بعد کے علماء میں سے ملا صدرا نے اس مذہب کے رد میں حسب ذیل دلیل دی ہے:

"والجواب ان استحالة نحو خاص من العدم (قائلین تالّٰہ زمان کی دلیل کا) جواب یہ ہے

لذاته لا تقتضی استحالة مطلق العدم فالواجب الوجود لذاته ما یمتنع علیه جمیع انحاء العدم لذاته والزمان لا یأبی لذاته ان لا یوجد اصلاً و ان ابی لذاته ان یعدم بعد کونه موجوداً"

عدم لذاتہ کے محال ہونے کا کوئی مقتضی نہیں اس کے مطلقاً معدوم ہونے کا مقتضی نہیں حالانکہ واجب الوجود لذاتہ اس ہستی سے مراد ہے جس پر عدم لذاتہ کے جملہ انحاء و جہات ممتنع ہوں۔ لیکن زمانہ لذاتہ اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ وہ سرے سے پایا ہی نہ جائے ہر چند کہ وہ موجود ہونے کے بعد معدوم ہونے سے ابا کرتا ہو۔

اسی طرح ملا محمود نے اس مذہب دہاتیٔ زمان کی رد میں لکھا ہے:

"والذی یزیح شبہتھم انه یلزم وجود الزمان علی تقدیر فرض عدمه اذا فرض العدم سابقاً علی الوجود ولاحقاً له اعنی اذا فرض عدمه تارة مع وجوده اخرای۔ اما اذا فرض عدمه مطلقاً لم یلزم من فرض ذلک وجوده۔ فالممتنع بالنظر الی ذاته هو نحو العدم المتجاور مع الوجود لا نحو العدم المطلق فلا یمتنع علیه مطلق العدم۔ والواجب ما یمتنع علیه مطلق العدم لا نحو منه دون نحو"

(الشمس البازغہ صفحہ ۲۰۱)

جس بات سے ان قائلین قدم زمان کا شبہ زائل ہو گا یہ ہے کہ زمانہ کو معدوم فرض کرنے کی تقدیر پر اُس کا وجود اسی صورت میں لازم آتا ہے۔ جبکہ یہ عدم اس کے وجود سے سابق یا اس کے لاحق فرض کیا جائے یعنی ایک مرتبہ اس کا عدم فرض کیا جائے اور دوسری مرتبہ اس کے وجود کو فرض کیا جائے۔ لیکن جب اس کا مطلق عدم فرض کیا جائے تو اس فرض کرنے سے اس کا وجود لازم نہیں آئیگا۔ پس اُس کی ذات کے لحاظ سے جو امر ممتنع ہے وہ ایسا عدم ہے جو وجود کے ساتھ جوڑ کر "عدم مطلق" پس زمانہ کے لئے مطلق عدم ممتنع نہیں ہے۔ حالانکہ واجب اُسے کہتے ہیں جس پر مطلق عدم

متمنی ہوں کہ علام کی دیگر انحاء کو چھوڑ کر کوئی ایک
نحو (جہت)

اس استعمال سے اس مذہب کی "مرجوحیت" ہی نہیں بلکہ سخافت بھی متحقق ہو جاتی ہے
اور یہ بات یقینی ہے کہ اگر علامہ اس کے "مالہ" کے ساتھ "ماعلیہ" سے بھی واقف ہو جاتے
تو اس "تارِ زبان" کا خیال بھی دل سے نکال دیتے۔ مگر علامہ کے زمانہ میں کسی اور عالم کو ان کے
اس اضطرابِ ذہنی کا پتہ نہ تھا اور جن کو معلوم تھا۔

وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم نکلے

کا مصداق تھے۔

بہرحال علامہ جس اضطرابِ ذہنی میں مبتلا تھے، اس سے نجات پانے کے لئے ان کی
نگہ انتخاب سید صاحب پر پڑی اور یہی ان کی بنیادی کوتاہی تھی۔ انہوں نے اپنے ملکۂ مردم شناسی
پر اپنے جذبۂ عقیدت مفرطہ کو غالب آجانے دیا۔ سید صاحب کا علم و تبحر، ان کا تاریخی مطالعہ، ان کا ادبی
ذوق ہر چیز اپنی جگہ مسلّم۔ مگر

ہر مردے و ہر کارے

آخر تو سید صاحب اسی ادارے کے نمایندے تھے جہاں سے معقولات کو سب سے
پہلے دیس نکالا ملا تھا۔ مگر علامہ کی عقیدتِ مفرطہ نے اس نقطۂ نظر سے کبھی انتخاب کے وقت انہیں
سوچنے نہیں دیا۔ پھر مسئلہ اپنی جگہ اس منفرد نوعیت کا تھا کہ اگر وہ خیرآبادی خاندان کے کسی استاد
سے بھی دریافت کرتے تو شاید وہ بھی علامہ کو مطمئن نہ کر سکتا۔ اس مسئلہ کا شافی جواب تو صرف
وہی علامہ روزگار مہیا کر سکتا تھا جس نے مشرق میں پہلی مرتبہ "Development of
Metaphysics in Persia" لکھی۔ مگر علامہ کی بنیادی بھول یہی تھی کہ

آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد

وہ کم و بیش چھ سال سید سلیمان ندوی سے استفادہ کی کوشش کرتے رہے، مگر نتیجہ

وعلم کے تحت بات سے زیادہ نہ نکلا کاش - فلسفہ عجم کا مصنف جو مسلمانوں کی سرگرمیوں کے علاوہ ایک جانب اُن کے پیشرو یونانی اور ایرانی حکماء کی فکری مساعی سے اور دوسری جانب اُن کے مسلمانوں کے بعد آنے والے یورپی فلاسفہ کی سرگرمیوں سے اُن کے پس منظر میں واقف تھا، اگر مختلف ماخذ سے بنفس نفیس تمام انسانی کا ایک منظم جائزہ مرتب کرتا تو یقیناً بصیرتِ ایمانی اور علومِ دینی کی برکت سے اُن غیر اسلامی افکار کے طلسم میں نہ پھنستا مگر تنبیہ کا اُسے ان علماء کی خاموشی کی وجہ سے کوئی موقعہ نہیں مل سکا۔

اس سے زیادہ تکلیف دہ مسئلہ حدیث "لاتسبّوا الدھر" کی اس ملحدانہ دہریانہ تاویل کا تھا جو علامہ کو ان کے احباب نے بتائی تھی "سدرا" و "شمس بازغہ" غیر معقولات کی کتابیں ہیں، جن سے ناواقفیت کا عذر ایک حد تک قابل پذیرائی ہوسکتا ہے۔ مگر "بخاری شریف" تو حدیث کی کتاب ہے، اس کے باب میں تو کسی کوتاہی کو قابل عفو نہیں سمجھا جاسکتا۔

"حدیث" لاتسبّوا الدھر" کے الفاظ مختلف روایات میں جو بھی رہے ہوں مگر اس کے معنی میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ علماء تو درکنار نوآموز طلبہ بھی جانتے تھے کہ اس کے معنی ہیں ا۔

"دہر (زمانہ) کو برا مت کہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی مقلّب دہر (اور حوادث روزگار کا فاعل) ہے"

یہ کوئی چالیس پچاس سال پہلے تک کی بات ہے۔ لیکن جب سے علامہ اقبال کے "خطبات" شائع ہوئے ہیں، صورت حال بدلنے لگی ہے۔ انھوں نے فرمایا:۔

"This is why the Prophet said, 'Do not vili time for time is God"

(یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: زمانہ کو برا مت کہو، کیونکہ زمانہ خدا ہے)

اسی طرح دوسری جگہ فرمایا ہے:۔

"The probaem of t fmo has always drawn the attentdon of Mnsdim Bhinkers and mvstimes This seams te begdeo to the propheos' identiTica Ion of God sith (time) in e well known tradihion."

(زمانہ کے مسئلہ نے ہمیشہ مسلم متکلمین و متصوفین کی توجہ اپنی طرف مبذول رکھی ہے۔
اس کی وجہ ..... یہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشہور
حدیث میں زمانہ (دہر) کو عین باری قرار دیا ہے)۔

مگر یہ اس حدیث کے پس منظر، فکری ماحول اور ان سب سے زیادہ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم سے جو اسلامی فکر کا اصل الاصول ہے۔ بے اعتنائی کا نتیجہ ہے۔ پوری بحث تو ایک مستقل پیش کش کی مقتضی ہے مگر اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ اساطین علماء نے ہمیشہ اس حدیث کے یہی معنی لئے ہیں جو ہم نے بیان کئے:۔ ان میں قرآن کریم کے (دیدہ) شناس (مفسرین) بھی تھے اور اقوالِ رسولؐ کے محرم راز (محدثین) نیز شریعت بیضاء کے دانائے راز فقہاء بھی۔ چنانچہ امام ابن جریر طبری نے جو طبقۂ مفسرین کے گل سر سبد ہیں آیت کریمہ

"وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ" الآیہ۔

کے شانِ نزول میں اس حدیث کے سلسلے میں فرمایا ہے:

"وذکر ان ھذہ الآیۃ نزلت من اجل ان	قتادہ نے ذکر کیا ہے کہ اس آیت کا نزول اس
اھل الشرک کانوا یقولون الذی یھلکنا ویفنینا	وجہ سے ہوا کہ مشرکین کہا کرتے تھے کہ جو ذات
الدھر والزمان ثم یسبون ما یفنیھم ویھلکھم	ہمیں ہلاک کرتی ہے وہ "دہر" اور زمانہ
وھم یرون انھم یسبون بذلک الدھر والزمان	پھر جو انہیں فنا اور ہلاک کرتا ہے اسے گالی
فقال اللہ عزوجل لھم انا الذی افنیکم واھلککم	دیتے اور یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ دہر اور
لا الدھر والزمان ولا علم لکم بذلک" (تفسیر ابن جریر طبری جلد ۲۵ صفحہ ۵۳)	زمانے کو گالی دے رہے ہیں۔

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ میں ہی وہ ہوں جو تمہیں فنا اور ہلاک کرتا ہوں نہ کہ دہر اور زمانہ۔ اور تمہیں اس کا کوئی علم نہیں ہے۔

امام ابن جریر طبری نے چوتھی صدی ہجری کے آغاز میں وفات پائی مگر بعد کے مفسرین کا یہی موقف رہا۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

یہی موقف محدثین کرام کا تھا۔ کتب حدیث کے متون تو محض [illegible] سے محروم [illegible] شرح و تعبیر یا تبیانی ہوتی تھی یا کتب تفاسیر کے ضمن [illegible] چوتھی صدی [illegible] محدثین علماء کتب حدیث کی شرح و ایضاح کرتے چلے آئے ہیں۔ ان میں ایک عظیم شخصیت امام خطابی کی ہے۔ انہوں نے ۳۸۸ھ میں وفات پائی تھی، اپنی جلالت قدر کی بنا پر وہ چوتھی صدی ہجری کے محدثین کے نمائندے سمجھے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے "سنن ابی داؤد" کی شرح "معالم السنن" کے نام سے لکھی تھی۔ اس شرح میں وہ اس حدیث "لا تسبوا الدھر" کی تاویل میں فرماتے ہیں:۔

"قال الشیخ: تاویل ھذا الکلام ان العرب انما کانوا یسبون الدھر علی انہ ھو الملم بھم فی المصائب والمکارہ ولیضیفون الفعل فیما ینالھم منھا الیہ ثم لیسبون فاعلھا، فیکون مرجع السب فی ذلک الی اللہ سبحانہ اذ ھو الفاعل لھا۔ فقیل علی ذلک لا تسبوا الدھر فان اللہ ھو الدھر ای ان اللہ ھو الفاعل لھذہ الامور التی تضیفونھا الی الدھر۔

شیخ نے فرمایا ہے: اس کلام کی تفسیر یہ ہے کہ اہل عرب دہر کو گالیاں دیا کرتے تھے کہ وہی ان پر مصائب و تکالیف نازل کرتا ہے اور جو تکلیف ان کو پہنچتی ہے اس کی طرف منسوب کرتے پھر اس کے فاعل کو گالی دیتے۔ اس صورت میں گالی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹتی کیونکہ وہی ان مصائب و حوادث کا فاعل حقیقی ہے۔ اس پر کہا گیا کہ "لا تسبوا الدہر فان اللہ ہو الدہر" یعنی اللہ تعالیٰ ہی ان امور کا فاعل ہے جنھیں (تم دہر کی طرف منسوب کرتے ہو۔)

محدثین کرام کا یہی مسلک بعد میں بھی رہا چنانچہ امام نوویؒ نے "شرح صحیح مسلم" کے اندر اس حدیث کی تاویل میں لکھا ہے:۔

"وسببہ ان العرب کان شانھا ان تسب الدھر عند النوازل والحوادث والمصائب النازلۃ بھا من موت او ھرم

اور اس کا سبب یہ ہے کہ عربوں کا دستور تھا کہ وہ مصائب و حوادث کے وقت (مثلاً موت بڑھاپا یا مال کی بربادی) [illegible]

وتلف مال او غیر ذلک فیقولون یاخیبة الدھر و نحو ھذا من الفاظ سب الدھر فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لا تسبوا الدھر فان اللہ ھو الدھر اے لا تسبوا فاعل النوازل فانکم اذا سببتم فاعلھا وقع السب علی اللہ تعالی لانہ ھو فاعلھا و منزلھا۔"

دہر کو گالی دیتے اور کہتے "یاخیبة الدھر" اور اسی طرح کی دوسری گالیاں۔ اسی پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لا تسبوا الدھر فان اللہ ھو الدھر" یعنی ان مصیبتوں کے نازل کرنے والے کو گالی مت دو کیونکہ جب تم اس کے فاعل کو گالی دوگے تو وہ گالی اللہ تعالی پر پڑے گی کیونکہ وہی ان مصیبتوں کا فاعل ہے اور وہی ان کا نازل کرنے والا ہے۔

(شرح صحیح مسلم للامام النووی المجلد الثانی صفحہ ۲۴)

بہر حال محدثین کرام کے نزدیک نہ تو اللہ دہر ہے، نہ دہر اللہ ہے اور نہ دہر یا زمانہ کو حوادث کائنات میں کوئی دخل ہے۔ امام نووی نے اس آخری بات کو بھی صاف کر دیا ہے، یعنی محدثین باوجود لفظی اختلافات کے بلا کسی استثناء کے زمانہ یا دہر کو حوادث کائنات میں غیر موثر مانتے ہیں:۔

"واما الدھر الذی ھو الزمان فلا فعل لہ بل ھو مخلوق من جملة خلق اللہ تعالی"

رہا دہر جو زمانہ ہے تو اس کا کوئی فعل نہیں ہے۔ وہ تو اللہ تعالی کی منجملہ دیگر مخلوقات کے ایک مخلوق ہے۔

یہی نہیں بلکہ حدیث کے چوتھے متن "فان اللہ ھو الدھر" میں "دہر" خبر نہیں بلکہ خبر محذوف کا مضاف الیہ ہے چناں چہ امام نووی نے اس بات کو بالکل صاف کر دیا ہے:۔

"ومعنی فان اللہ ھو الدھر اے فاعل النوازل والحوادث وخالق الکائنات۔"

اور "فان اللہ ھو الدھر" کے معنی ہیں (اللہ تعالی ہی) مصائب و حادثات کا فاعل اور کائنات کا خالق ہے۔

جماعت فقہاء کے نمائندے چوتھی صدی میں امام ابوبکر جصاص رازی اس باب میں قرار دیئے

جا سکتے ہیں۔ آپ کی "احکام القرآن" آج بھی اپنے موضوع پر حرفِ آخر کی حامل ہے۔ اسی تفسیر کے اندر آیت کریمہ "وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ" کی تفسیر کے ضمن میں حدیث "لا تسبوا الدہر" کی تاویل میں فرماتے ہیں:

"تاوله اهل العلم على ان اهل الجاهلية كانوا ينسبون الحوادث المجحفة والبلايا النازلة والمصائب المتلفة الى الدهر فيقولون فعل الدهر وصنع بنا ويسبون الدهر كما قد جرت عادة كثير من الناس بان يقولوا اساء بنا الدهر ونحو ذلك۔ فقال النبي صلى الله عليه وسلم لا تسبوا فاعل هذه الامور فان الله هو فاعلها ومحدثها"

(احکام القرآن للامام جصاص الرازی، الجلد الثالث صفحہ ۵۶۴)

اہل علم نے اس کی بدیں طور تاویل کی ہے کہ اہل جاہلیت حوادث و بلایا اور مصائب کو دہر کی طرف منسوب کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ دہر نے ہمارے ساتھ ایسا ایسا کیا اور پھر دہر کو گالی دیا کرتے تھے جیسا کہ بہت سے لوگوں کی یہ کہنے کی عادت ہوا کرتی ہے کہ ہمارے ساتھ دہر نے یہ برائی کی وغیرہ وغیرہ۔ تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان امور کے فاعل کو گالی مت دو کیونکہ ان کا فاعل اور پیدا کرنے والا اللہ تبارک تعالیٰ ہی تو ہے۔

یہی نہیں بلکہ دفع دخل مقدر کے طور پر انہوں نے یہ بھی تصریح کر دی ہے کہ دہر اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے بھی نہیں ہے جیسا کہ بعد کے متصوفین و حکمائے متأخرین ،، نے وہم تراشی کی ہے۔ اور یہ صرف امام جصاص الرازی ہی کا قول نہیں ہے بلکہ انھوں نے غیر مبہم طور پر صراحت کی ہے کہ ان کی زمانہ (چوتھی صدی ہجری) تک علمائے اسلام میں سے کوئی شخص اس بات کا قائل نہیں تھا۔

"ولو كان مرفوعا كان الدهر اسماً لله تعالى وليس ذلك لان احداً من المسلمين لا يسمى الله بهذا الاسم"

اور اگر "دہر" مرفوع ہوتا ارپیش ہوتا، تو وہ اسمائے باری میں سے ہوتا مگر ایسا نہیں ہے کیونکہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو اس نام سے موسوم نہیں کرتا۔

الغرض پانچویں صدی ہجری میں اہلسنت کے مشہور عالم ابن حزم نے دوسری جدت آفرینیوں کے ساتھ یہ جدت بھی فرمائی کہ "دہر" کو باری تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں محسوب کیا۔ مگر ابن حزم اور ابن حزم کے انداز پر سوچنے والے حکمائے متکلمین اور متصوفین کی یہ جدت آفرینی طبقۂ علماء میں مقبول نہ ہو سکی اور انھوں نے بالاتفاق اس کی تغلیط کر کے اس موقف سے برأت کا اظہار کیا، چنانچہ حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے:-

"وقد غلط ابن حزم ومن نحا نحوه ان الدهر من اسماء الله تعالیٰ"

ابن حزم اور اُن کے انداز پر سوچنے والوں نے غلطی کی ہے جو انھوں نے "دہر" کو اسماء باری میں سے سمجھ لیا۔

رہے متکلمین تو انھوں نے تو زمانہ کے وجود ہی سے انکار کر دیا چنانچہ "شرح المواقف" میں ہے:-

"انہم اعنی المتکلمین ..... انکروا ایضاً الزمان"

انھوں نے یعنی متکلمین نے زمانہ کے وجود خارجی کا بھی انکار کیا ہے۔

اور یہ ان کی تنگ نظری نہیں تھی بلکہ دور اندیشی کا نتیجہ تھا کیونکہ زمانہ کا تصور ہی کچھ اس قسم کا ہے کہ اس کے خارجی وجود کو تسلیم کرتے ہی اسے قدیم ماننا پڑتا ہے۔ چنانچہ امام رازی نے "المباحث المشرقیہ" میں ارسطو کی طرف یہ قول منسوب کیا ہے:-

"قال المعلم الاول: من قال بحدوث الزمان فقد قال بقدمه من حيث لا يشعر به" (المباحث المشرقیہ المجلد الاول صفحہ ۶۵۹)

(معلم اوّل (ارسطو) نے کہا ہے کہ جو شخص زمانہ کے حدوث کا قائل ہے وہ غیر شعوری طور پر اُس کے قدیم ہونے کا بھی معتقد ہو جاتا ہے)

اور یہ چیز اسلام کی بنیادی تعلیم (توحید ربوبیت) کے انکار کے مترادف تھی لہٰذا ان کے لئے زمانہ کے انکار کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

غرض حدیث "لا تسبوا الدھر" کے الفاظ جو بھی رہے ہوں اس کے معنی میں کوئی اختلاف نہ تھا، علماء تو درکنار نوآموز طلباء بھی جانتے تھے کہ اس کے معنی ہیں:۔

"دہر (زمانہ) کو برا مت کہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی صاحب دہر (اور حوادث زمانہ کا مالک) ہے"۔

اور آج بھی جو حضرات اس حدیث کو پڑھتے ہیں یا پڑھاتے ہیں، یہی معنی سمجھتے اور سمجھاتے ہیں۔

مگر علامہ اقبال نے غیر شعوری تجدد پسندی کے نتیجہ میں اس حدیث کو انتہائی خطرناک الحاد کی بنیاد بنالیا، چنانچہ وہ کہیں اسے "جبار و قہار" بتاتے ہیں اور اس کی زبان سے کہلواتے ہیں:۔

چنگیزی و تیموری مشتے ز غبار من ہنگامۂ افرنگی یک جستہ شرار من
انسان و جہان او از نقش و نگار من خون جگر مرداں سامان بہار من
من آتش سوزانم من روضۂ رضوانم

کہیں اسے "نقش گر حادثات" بتاتے ہیں:۔

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات

اور کہیں اسے "اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم" کی طرح "لا تاخذہ سنۃ ولا نوم" کی صفت تنزیہی سے متصف فرماتے ہیں:۔

"a deeper insight into our concious experience shows that beneath the appearnce of serial duration there is true duration..............
untouched by weariness and unseizable by slumber or sleep."

مگر علامہ اس فکری بیراہ روی میں بڑی حد تک معذور تھے۔ اسلام کے لئے مرمٹنے کی اُن کی تڑپ مسلّم، مگر اُن کی ذہنی و فکری تشکیل میں جن عوامل نے موثر طور پر حصّہ لیا تھا، وہ تقریباً سب کے سب غیر اسلامی تھے۔ اسلامی عوامل میں یا اُن کی تڑپ تھی یا "ہندوستان میں علوم اسلام کی جوئے شیر کے فرہاد" کی عقیدت۔ مگر

وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغِ ستم نکلے

"صدرا" اور "شمس بازغہ" نامعقول سہی اور اِس لئے ان کے لئے ناقابل فہم یا ناقابل اعتناء۔ لیکن "بخاری شریف" کی حدیث "لا تسبوا الدھر" کے متعلق تو وہ ان کی صحیح طور پر رہنمائی کر سکتے تھے اور ہمیں یقین کامل ہے کہ اگر وہ علامہ کو ٹوک دیتے۔

کیں رہ کہ تو می روی بترکستان است

تو یقیناً وہ اس اصرار علی الباطل سے دست بردار ہو جاتے۔

اس کے ساتھ علماء روزگار کی بھی کچھ ذمہ داری تھی۔ آخر یہ "تاثّر زمان" "وحدت الوجود" اور "متحدہ قومیت" کے انکار سے کمتر خفیف نہیں تھا۔ اگر تصوف بالخصوص وحدت الوجود کے انکار کی بناء پر آسمان گر پڑ سکتا تھا، اگر "ملّت از وطن است" کے انکار سے ملّت میں زلزلہ آسکتا تھا تو کیا۔

" A critical interpretation of the sequence of time as revealed in ourselves, has led us to a notion of the Ultimate Reality as pure duration "

کی تبلیغ و اشاعت سے پورے دین مبین کی بنیاد کھوکھلی نہیں ہو سکتی ہے۔

(باقی)

تبصرے

ارمغانِ مالک:- جلد اوّل ودوم وسوم مرتبہ مجلس ارمغان مالک نئی دہلی، قیمت ۳۰ تیس روپے مجموعی صفحات ایک ہزار سے زیادہ - پتہ :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی۔

جناب مالک رام صاحب اردو زبان کے نامور ادیب، محقق اور مصنف اور غالبیات کے معروف ماہر ہیں۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ عربی زبان اور اسلامی علوم و فنون کا مطالعہ بھی وسیع ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں چند مقالات کے علاوہ ان کی کتاب "اسلام اور عورت" ان کے اس مطالعہ کی عملی دلیل ہے، وہ جب کسی بھی موضوع پر لکھتے ہیں اس پر پورے طور پر حاوی ہو کر لکھتے ہیں، اس موقع پر یہ بات دلچسپی سے سنی جائے گی: کئی برس کی بات ہے ایکبار چند حضرات کی معیت میں پروفیسر محمد مجیب نے راقم الحروف سے دریافت کیا "کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عورت سے بیعت لیتے وقت اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا ہے؟" میں سوچنے لگا اور ابھی اس سوال کا جواب نہ دینے پایا تھا کہ مالک رام صاحب جو اس مجمع میں موجود تھے حسب معمول محققانہ پندار کے لب ولہجہ میں بولے: جی نہیں! کبھی نہیں میں احادیث کا تمام ذخیرہ کھنگال چکا ہوں، مجھے کہیں کوئی حدیث اس کے خلاف نہیں ملی خیر! ان کے علمی اور تحقیقی ذوق کی پختگی اور اس کے فطری ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اعلیٰ سرکاری ملازمت کی خشک اور ہمہ وقت کی مصروفیات کے باوجود ان کا تصنیفی سرمایہ اتنا زیادہ ہے کہ جو لوگ اس کی بڑی بڑی تنخواہ پاتے ہیں ان کا بھی نہیں ہوتا، علم وادب اور تحقیق میں اس نمایاں امتیاز کے مالک ہونے کے باعث ان کے دوستوں نے

بہ بات واضح ہے۔ اس بات کی خواہش کی کہ موصوف کو ۷۵ برس کی عمر ہونے پر ایک کتاب نذر کی جائے اور کوئی شبہ نہیں وہ اس کتاب کے مستحق تھے۔ یہ وہی کتاب ہے جو تین جلدوں میں ہے، اوّل اور دوم جلدیں اردو مقالات کے لئے مخصوص ہیں جن کی مجموعی تعداد بتیس (۳۲) ہے۔ تیسری جلد میں سب مضامین جو گنتی میں ۱۴ ہیں انگریزی میں اور ایک فرانسیسی زبان میں ہے۔ لکھنے والوں میں ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ یورپ کے بلند پایہ ارباب قلم بھی شامل ہیں۔ مضامین دو قسم کے ہیں۔ (۱) مالک رام صاحب کی شخصیت اور ان کے کارناموں کی تفصیل پر اور (۲) خالص علمی مقالات، پہلی قسم کے مقالات میں ڈاکٹر محمد باقر (لاہور) جو مالک رام صاحب کے ہم گاؤں اور اس بنا پر بچپن کے دوستوں میں سے ہیں اور جناب سید علی جواد زیدی کے مقالات بہت دلچسپ اور لائق مطالعہ ہیں۔ دوسری قسم میں دو تین مقالات کو مستثنیٰ کر کے جو سرسری اور سطحی نظر آئے۔ سب بلند پایہ علمی اور تحقیقی مقالات ہیں اور اس حیثیت سے یہ صرف "ارمغان مالک" نہیں بلکہ ارباب علم کے لئے بھی ایک گراں قدر تحفہ ہیں۔ کاغذ کتابت و طباعت اور انگریزی ٹائپ سب نہایت اعلیٰ اور معیاری، امید ہے کہ ارباب ذوق اس کے مطالعہ سے شادکام ہوں گے۔

مکاتیب طیب:۔ مرتبہ جناب شفیق احمد اعظمی۔ کتابت وطباعت بہتر۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ قیمت مجلد چار روپے۔ پتہ: مکتبہ نعمانیہ دیوبند۔

یہ کتاب مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کے ۳۸ خطوط کا مجموعہ ہے خطوط دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں زبان کا چٹخارہ بھی ہے اور مکتوب دیسی کا بے تکلف پیرایہ بیان بھی۔ کہیں کہیں ظرافت اور لطیف مزاح کے چھینٹے بھی۔ وہ منطقی طرز استدلال بھی ہے جو مولانا کی تقریر کا خاص امتیاز ہے۔

علاوہ ازیں یہ خط اصلاحی بھی ہیں اور علمی بھی۔ اخبری اور سب سے زیادہ طویل خط آپ کا مکتوب لندن ہے۔ اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکتوب نگار کی مشاہدہ کس درجہ تیز اور نکتہ رس ہے اور آپ کس طرح تمدن جدید کی چیزوں کو عبرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اظہار و بیان کا ایسا ملکہ بھی عطا فرمایا ہے کہ جس چیز کو بیان کرتے ہیں اس کا آنکھوں میں سماں بندھ جاتا ہے۔

لندن کے تذکرہ میں آپ نے لکھا ہے کہ آپ کو وہاں کہیں مکھی، مچھر اور کھٹمل نظر نہیں آیا تو آپ کو بڑی حسرت ہوئی کہ اپنے ملک کی یہ مخلوق وہاں کہیں نہ دکھائی دی۔ مولانا کی یہ عبارت پڑھ کر تبصرہ نگار کو بیساختہ یاد آیا کہ دس بارہ مہینے کنیڈا وغیرہ کے قیام کے بعد جب راقم الحروف لندن پہنچا اور ایک دن وہاں ایک پاکستانی مسلمان کے ریستوران میں لنچ کھانے گیا اور اس وقت ایک کونہ میں ایک مکھی اڑتی نظر آئی تو طبیعت اسے دیکھ کر کس درجہ مسرور ہوئی ہے کہ شکر ہے ہمارے ملک کا یہ نشان امتیاز ابھی دنیا میں باقی ہے اور فنا نہیں ہوا۔ بہرحال یہ خطوط بہت دلچسپ بھی ہیں اور بصیرت افروز بھی، ان کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہے۔

دسمبر ۱۹۷۲ء

سنیتا
خوش ہے لیکن مالتی
...نے سے گھلی جا رہی ہے



...نے بار بار بچے پیدا کئے اور اس کی صحت
...گئی۔ اور اسے بچے بھی کیسے ملے ....
...کمزور۔

سنیتا نے دوراندیشی سے کام لیا اور اپنے کنبے کو محد...
رکھا۔ اس نے فیملی پلاننگ کے طریقوں کے بارے میں
واقفیت حاصل کی جس سے اس کے لئے اور اس کے کنبے...
دوسرے افراد کے لئے پُرمسرت زندگی بسر کرنے کے لئے
راستے کھل گئے۔

چھوٹا کنبہ ... صحت مند کنبہ

davp 72/228



بھارت کے
دفاع و ترقی
میں شرکت کیجئے
ساتھ ہی
7 1/4 %
سود کمایئے
۵ سالہ ڈاک گھر میعادی کھاتوں پر
3 سالہ کھاتے 7%
1 سالہ کھاتے 6%
ان کھاتوں پر اور دیگر ایسے قابل ٹیکس
کھاتوں و ہنڈیوں پر کمایا 3000 روپے
سالانہ تک سود ٹیکس سے بری ہے۔
قومی بچت ادارہ
تفاصیل کے لئے اپنے ڈاک گھر یا اپنے ضلع کے قومی بچتوں کے ضلع
آرگنائزر سے پوچھ تاچھ کیجئے۔
davp 73/240

سالانہ قیمت دس روپے

فی پرچہ ایک روپیہ

ندوۃ المصنفین

حکیم مولوی محمد ظفر احمد پرنٹر و پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان سے شائع کیا